احوالِ غالب

پروفیسر مختار الدین احمد

احوالِ غالبؔ

پروفیسر مختار الدّین احمد

انجمن ترقّیِ اردو (ہند) نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) ۵۱۲

اشاعت : ۱۹۸۶ء
اڈیشن : دوسرا
طباعت : سمر پرنٹنگ پریس دہلی
بہ اہتمام : ایم حبیب خاں
قیمت : ۴۵ روپے

پتے

انجمن ترقی اردو (ہند)
سلطان جہاں منزل
شمشاد بلڈنگ علی گڑھ یو۔پی

انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دلی

فہرست

دیباچۂ طبعِ دوم

"احوالِ غالب" کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس مجموعے کی کچھ ایسی مقبولیت ہوئی کہ انجمن کو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاخیر کی وجہ یہ ہوئی کہ راقم کا خیال تھا کہ ان مضامین پر نظرِ ثانی ہو جاتی لیکن مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا۔ طبعِ اول کے دیباچے میں راقم نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے اُن میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں اور اس سلسلے میں کام کی کافی گنجائش ہے لیکن اس بات پر اظہارِ مسرت بھی کرنا ضروری ہے کہ اس طویل عرصے میں غالب پر دونوں ملکوں میں خاصا کام ہوا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے دیوانِ غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مرتب کے اضافے اور نظرِ ثانی کے بعد ۱۹۸۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ "غالب" (خورشید الاسلام) ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد کی صرف پہلی جلد الٰہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے نسخے بازار میں نہیں ملتے تھے۔ انجمن نے ترتیب نو کا کام مالک رام کے سپرد کیا۔ اُنھوں نے متن اور حواشی درست کیے اور متعدد نئے خطوں کا اضافہ بھی کیا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں نکلا۔ دوسری جلد اگر مرتب ہوئی تو شائع نہ ہو سکی۔ اس کمی کا احساس انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کو ہوا۔ اُنھوں نے غالب کے اردو خطوط کا مجموعہ متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق مرتب کیا اور اسے مکمل کرنے کی کوشش کی جس میں اب تک کے سارے نئے دریافت شدہ خطوط بھی شامل ہیں۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ دلّی نے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں شائع کر دی ہیں۔ تیسری جلد زیرِ طبع اور چوتھی زیرِ ترتیب ہے۔ آخری جلد میں مزید حواشی اور فہارس ہوں گی۔ اس سے قبل ڈاکٹر خلیق انجم غالب پر دو کتابیں "غالب کی نادر تحریریں" اور "غالب اور شاہانِ تیموریہ" شائع کر چکے ہیں۔

غالب صدی کے موقع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایک اشاعتی پروگرام شائع کیا تھا جس میں حسبِ ذیل بارہ کتابیں شائع کرنے کا خیال تھا: (۱) غالب کی فکر (۲) غالب کا فن (۳) غالب

کے رسائل (۴) "غالب کا اثر اردو ادب پر" (۵) "غالب کی فارسی شاعری (انگریزی میں)" اور (۶) غالب کی خود نوشت سوانح عمری (انگریزی میں) (۷) غالب کے منتخب اردو خطوط (۸) "غالب کے اردو خطوط" (ہندی رسم خط میں) (۹) "نامۂ غالب" (۱۰) "غالب ببلوگرافی" (۱۱) غالب کے منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ (۱۲) انتخاب فارسی قطعات و رباعیات و قصائد و مثنویات۔

لیکن یہ سارے کام وقت پر پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ پروفیسر عبد العلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی توجہ سے مرزا جعفر حسن کا مرتب کردہ انتخاب غزلیات فارسی، سلسلۂ مطبوعات غالب صدی کی پہلی کتاب ہے جو "متاعِ غالب" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ غالب سیمینار علی گڑھ کا مجموعۂ مضامین "عرفان غالب" (آل احمد سرور) ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "غالب کے منتخب خطوط" (آل احمد سرور) "غالب کا فن" (اسلوب احمد انصاری) غالب کی خود نوشت سوانح حیات (نور الحسن نقوی) "غالب ببلوگرافی" (انصار اللہ نظر) شائع ہوئے۔ غالب کی فارسی شاعری (وارث کرمانی) بعد کو مکمل ہوئی۔ اور علی گڑھ سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے ان کی دوسری انگریزی کتاب کا موضوع غالب کی شاعری میں روایت اور حقیقت پسندی ہے۔ یہ بھی علی گڑھ ہی سے شائع ہوئی ہے۔

یہ تو اداروں کی سرگذشت لکھی گئی۔ افراد نے اپنے طور پر جو غالب پر کام کیے۔ ان میں کچھ کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ مالک رام نے تقریب صد سالہ یادگار غالب "عیار غالب" علمی مجلس دہلی سے ۱۹۶۹ء میں شائع کی۔ یہیں سے "گل رعنا" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ "فسانۂ غالب" (۱۹۷۱ء) "ذکر غالب" طبع پنجم (۱۹۷۶ء) "گفتار غالب" (۱۹۸۵ء) مکتبہ جامعہ نے شائع کیں۔ "دیوان غالب" صدی اڈیشن اور "دستنبو" غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیں۔ "تلامذۂ غالب" طبع اول نکودر سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب مکتبہ جامعہ سے اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۸۴ء میں نکلا ہے جس میں کچھ نئے شاگردوں کا اضافہ ہوا ہے اور سات نئی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ وفا کی تصویر کے علاوہ باقی سب تصویریں پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہیں۔ صفحات بھی پہلے اڈیشن کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ یعنی یہ اڈیشن ۶۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

ہندوستان میں غالب پر تحقیق کے لیے جو دو مشہور ادارے قائم ہوئے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (جسے ڈاکٹر ذاکر حسین نے قائم کیا اور جسے ہمیشہ فخر الدین علی احمد مرحوم کی سرپرستی حاصل رہی)

اور غالب اکیڈمی (جس کے روح رواں حکیم عبدالحمید صاحب ہیں)۔ ان دونوں اداروں نے غالب متعلقات غالب پر متعدد کتابیں شائع کیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات یہ ہیں: "قاطع برہان و رسائل متعلقہ" (قاضی عبدالودود) "دیوان غالب" (مالک رام) "دستنبو" (مالک رام)، "مقالات بین الاقوامی غالب سیمینار" دو جلدوں میں اردو اور انگریزی مقالات کا مجموعہ (یوسف حسین خاں) "غزلیات غالب" اردو کا انگریزی ترجمہ (یوسف حسین خاں) "غزلیات غالب فارسی کا انگریزی ترجمہ" (یوسف حسین خاں) "مثنویات غالب فارسی" کا اردو ترجمہ (ظ۔ انصاری) "دیوان غالب" ہندی رسم خط میں (نور نبی عباسی) "نقد قاطع برہان مع ضمائم" (نذیر احمد) "خاندان لوہارو کے شعرا" (حمیدہ سلطان احمد)

غالب انسٹی ٹیوٹ کا ایک اہم کارنامہ ایک علمی، ادبی، تحقیقی رسالہ "غالب نامہ" کا اجرا ہے جو جنوری ۱۹۷۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پہلی جلد کے دونوں شمارے نثار احمد فاروقی نے یوسف حسین خاں کی نگرانی میں مرتب کیے۔ جنوری ۱۹۸۱ء سے اس کا دوسرا دور شروع ہوا۔ مدیر اعلا نذیر احمد مقرر ہوئے اور مدیران: نورالحسن انصاری، رشید حسن خاں، شاہد ماہلی مجلس مشاورت میں مسعود حسین خاں، سید امیر حسن عابدی اور مختار الدین احمد ہیں۔ یہ رسالہ پابندی سے نکل رہا ہے اور اس نے غالب اور عہد غالب پر متعدد قیمتی مضامین شائع کیے۔

غالب اکیڈمی دہلی نے اب تک حسب ذیل کتابیں شائع کیں:

"غالب" (سید اکبر علی ترمذی) "غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات" (یوسف حسین خاں)۔ "غالب اور آہنگ غالب" (یوسف حسین خاں) "نوائے سروش" غالب کے ۱۲۰ اشعار کا انگریزی ترجمہ (مشہور مترجمین کے قلم سے) "سرل غالب" ۲۲۲ اشعار، ہندی رسم خط میں "فیضان غالب" (عرش ملسیانی) "غالب اور فن تنقید" (اخلاق حسین عارف) "غالب اور ذوق" (ضیاالدین احمد شکیب) "نقش غالب" (اسلوب احمد انصاری) "تلمیحات غالب" (محمود نیازی) "تفتہ اور غالب" (ضیاالدین انصاری) ظہیر احمد صدیقی نے غالب کے معاصر مومن کے فارسی خطوط ترجمے و حواشی کے ساتھ شائع کیا۔

متعدد رسایل نے غالب پر خاص نمبر شایع کیے۔ رسالہ اردو ادب (علی گڑھ)، فکر و نظر (علی گڑھ) علی گڑھ میگزین، نیا دور (لکھنؤ)، فروغ اردو (لکھنؤ)، شاعر (بمبئی)، آج کل (دہلی)،

سوویت جائزہ (دہلی)، علم وفن (دہلی)، شبستاں (دہلی)، ہما (دہلی)، شگوفہ (حیدر آباد) جامعہ (دہلی) جاں نثار (امرتسر)

غالب پر کچھ ڈرامے بھی شائع ہوئے: "دود چراغ محفل" (رفیعہ سلطانہ)، تصویر خیال (ابرار الرحمن قدوائی)

ان کے علاوہ منجو قمر الہٰی اور نذیر محمد خاں نے بھی ڈرامے لکھے۔ شفیع الدین نیر نے بچوں کے لیے غالب کی کہانی لکھی۔

غالب پر مندرجہ ذیل اشاریے شایع ہوئے: اشاریۂ کلام غالب (دہلی یونیورسٹی)، غالب ببلوگرافی (انصار اللہ نظر) غالب نما (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی) غالبیات ببلوگرافی (عبد القوی دسنوی)

اس زمانے میں غالب پر کچھ کتابیں انگریزی میں بھی شایع ہوئیں۔ غالب (محمد مجیب) شایع کردہ ساہتیہ اکاڈمی دہلی۔ دستنبو (خواجہ احمد فاروقی) دہلی ۱۹۷۰ء مرزا غالب (مالک رام) شایع کردہ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی مطالبات غالب (اختر انصاری دہلوی) اور غالب: سوانح حیات (اندر جیت لال) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس عرصے میں غالب کے تلامذہ اور احباب پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئیں اور ان لوگوں کے غالب سے جو تعلقات رہے ان پر روشنی ڈالی گئی۔ غالب اور ذکاؔ، ضیاالدین شکیب "تفتہ اور غالب" ضیاء الدین انصاری اور غالب اور سرور، ایم۔ حبیب خاں نے مرتب کیں۔ چودھری عبد الغفور سرور کے ساتھ بد نصیبی یہ رہی کہ ان کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ البتہ کتاب میں سرور کے قطعات اور قصیدہ شامل ہیں۔ جن پر غالب کی اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ غالب اور صفیر بلگرامی پر سب سے پہلے راقم نے لکھا۔ اس کے بعد مشفق خواجہ نے پاکستان سے ۱۹۸۱ء میں اس نام سے کتاب مرتب کر کے شایع کی۔ ہندوستان سے بھی اس کا اڈیشن ۱۹۸۵ء میں مکتبہ جامعہ نے شایع کیا۔ صفیر بلگرامی کی غالب کا شاگرد ہونے کے علاوہ اپنی کئی حیثیتیں بھی تھیں، یعنی وہ داستان گو سوانح نگار، تذکرہ نگار اور مکتوب نگار وغیرہ بھی اعلا درجے کے تھے۔ شاد عظیم آبادی جیسا غزل گو شاعر ان ہی کا شاگرد تھا۔

اس زمانے کی دو بہت اہم دریافتیں "دیوان غالب نسخہ بھوپال، امروہہ اور گل رعنا ہیں

آخرالذکر کے تین نسخے فراہم ہو گئے جن میں ایک بخط غالب ہے اور اس پر سبھوں کا اتفاق ہے۔ رہا دیوان غالب بخط غالب ہونا تو اس سے چند اصحاب نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن جمہور محققین اسے بخط غالب مانتے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا متنازعہ فیہ رہا کہ موافقت ومخالفت میں سو سے زائد مضامین لکھے گئے اور کمال احمد صدیقی نے اس دعوی کے بطلان میں کہ یہ نسخہ بخط غالب ہے ایک ضخیم کتاب لکھ کر شائع کی ہے۔ اس نادر نسخے کی ترتیب پر بیک وقت نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خاں عرشی زادہ کام کرتے رہے۔ عرشی زادہ دہلی سے ستمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اور فاروقی اڈیشن لاہور سے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں نکلا۔ دونوں عکسی اڈیشن ہیں۔ تفصیلی مقدمہ تو دونوں حضرات نے لکھا ہے لیکن ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے عکس پیش کرنے کے ساتھ ساتھ خط نستعلیق میں پورے دیوان کا متن بھی طبع کرا دیا ہے۔ رہا "گل رعنا" اسے ہندوستان سے مالک رام نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ سید وزیر الحسن عابدی کے مرتبہ نسخے کی طباعت لاہور میں ۱۹۶۵ء میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن تکمیل اور اشاعت غالباً ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔

ایک طرف غالب کا اردو اور فارسی کلام دریافت ہوا تو اسی زمانے میں اُن کے فارسی خطوط کا ایک ایسا مجموعہ سید اکبر علی ترمذی نے تلاش کیا جس میں غالب کے اہم اور نادر خطوط تھے جو انھوں نے سفر کلکتہ کے دوران اور قیام بنگالہ کے زمانے میں دوستوں کو لکھے۔ یہ کتاب انگریزی میں مقدمہ وتعلیقات کے ساتھ دہلی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

پاکستان میں بھی اس عرصے میں غالب کے سلسلے میں خاصا کام ہوا۔ غالب صدی کے موقع پر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے مجلس یادگار غالب قائم کی اور غالب کی تمام تصانیف نظم ونثر کا ایک اچھا اڈیشن پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوا۔ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ حمید احمد خاں نے "باغ دودر" "گل رعنا" "قصائد ومثنویات فارسی" تینوں کتابیں سید وزیر الحسن عابدی نے "دیوان غالب" حامد علی خاں نے مرتب کر کے شائع کیں۔ "دیوان غالب نسخۂ شیرانی" کا عکسی اڈیشن بھی اسی زمانے میں شائع ہوا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان نے غالب کی صد سالہ برسی پر حسب ذیل کتابیں شائع کیں۔ "فلسفۂ کلام غالب" (شوکت سبزواری) "غالب ــ ایک مطالعہ" (ممتاز حسین) "گل رعنا مع آشتی نامۂ غالب" (سید قدرت نقوی) "ہنگامۂ دل آشوب" (سید قدرت نقوی) "نیمروز اردو ترجمہ" (سید عبدالرشید فاضل)

انجمن نے "غالب نامہ اور" کے نام سے رسالہ "اردو" کے مضامین کا انتخاب شائع کیا۔ اور بیاد غالب اُس رسالے کے دو تین خصوصی شمارے بھی چھاپے "قومی زبان" کا بھی ایک غالب نمبر شائع کیا۔

ادارہ یادگار غالب جنوری ۱۹۶۸ء میں کراچی میں قائم ہوا۔ اس کے بانی اور روح رواں مرحوم مرزا ظفر الحسن (ت ۱۹۸۴ء) تھے۔ غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقع پر "دود چراغ محفل" (میر حسام الدین راشدی) "غالب۔ سب اچھا کہیں جسے" (کرار حسین) "بزم غالب" (عبدالروف عروج)، "غالب کا منسوخ دیوان" (مسلم ضیائی)، "پنج آہنگ" "آہنگ پنجم کا اردو ترجمہ" (محمد عمر مہاجر)، "غالب نما: کتابوں اور رسائل کا اشاریہ" (ابن حسن قیصر)۔ ۱۹۷۵ء میں اس ادارے نے ایک سہ ماہی جریدہ "غالب" نکالنا شروع کیا۔ مدیر اعلیٰ فیض احمد فیض تھے۔ لیکن سارا کام خود مرحوم مرزا ظفر الحسن کیا کرتے تھے اس کے پانچ شمارے نظر سے گزرے تھے۔

مجلس ترقی ادب لاہور نے مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کی مرتب کردہ کتابیں "عود ہندی" ۱۹۶۷ء، "اردوئے معلّیٰ" ۱۹۶۹ء اور "کلیات غالب فارسی" ۱۹۶۷ء شائع کیں۔ برصغیر ہند و پاکستان میں کلیات کے جو قابل ذکر اڈیشن اب تک نکلے تھے ۶ یہ ساتواں اڈیشن ہے جو تین جلدوں میں لاہور سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

یہ ذکر سرسری طور پر اُن کاموں کا ہے جو یا تو میرے پیش نظر ہیں یا جن کی مجھے اطلاع ہے۔ مقصد سارے کام گنانے نہیں ہیں۔ یہ دکھانا ہے کہ یہ عرصہ غالب اور غالبیات کے لیے بہت زرخیز رہا ہے اور اس زمانے میں خاصہ کام ہوا جس سے غالب اور عہد غالب کو سمجھنے میں بہت سہولت ہوگی لیکن جن امور کی طرف میں نے طبع اول کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض پر کام کی اب بھی ضرورت ہے۔

مختار الدین احمد
۳۱ مارچ ۱۹۸۶

ناظمہ منزل ۲۸۶، امیر نشاں روڈ
علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

دیباچۂ طبع اوّل

غالبؔ ہماری زبان کے خوش نصیب شاعروں میں ہیں، اُن کی تصانیفِ نثر اُن کی زندگی ہی میں متعدد بار شائع ہوئیں، فارسی اور اردو دواوین کے بھی ان کے سامنے کئی ایڈیشن نکلے. اس کے بعد آج تک معلوم نہیں کتنی بار ان کی کتابیں چھپیں. تصانیف کی اشاعت سے قطع نظر ان پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئیں، کسی اور اردو زبان کے مصنف یا شاعر پر نہیں لکھی گئیں. غالبؔ پر سب سے پہلے ایک مستقل کتاب حالیؔ نے لکھی جو اس منزل کے رہ نوردوں کے لیے نشانِ راہ کا درجہ رکھتی ہے. زمانۂ حال میں ان کی زندگی پر سب سے مفصّل کتاب غلام رسول مہرؔ صاحب کی ہے. شیخ محمد اکرام کی کتاب "غالب نامہ" جواب دو حصّوں میں تقسیم ہو کر "آثارِ غالبؔ" اور "ارمغانِ غالبؔ" کے نام سے شائع ہوئی ہے. بڑی جامع کتاب ہے جس میں تذکرہ بھی ہے اور تبصرہ بھی. مالک رام صاحب کی "ذکرِ غالب" جس کا اب نیا اڈیشن نکل آیا ہے اور جس میں انھوں نے کافی اضافے کیے ہیں، اس میں بعض معلومات نئی ملتی ہیں. ڈاکٹر عبداللطیف اور بجنوری مرحوم کی کتابیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں لیکن توازن کی کمی دونوں میں نظر آتی ہے. نئی کتابوں میں شوکت سبزواری کی "فلسفۂ کلامِ غالب" جعفر علی خاں اثرؔ کی "مطالعۂ غالب" قابلِ ذکر ہیں.

غالبؔ کے سلسلے میں بہت کچھ کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کام باقی ہے. ان کے

حالاتِ زندگی ہی ابھی مکمل طور پر نہیں لکھے گئے، ان کے خاندانی معاملات محتاجِ تحقیق ہیں، وہ اپنا سلسلۂ نسب رستم خاں وغیرہ سے ملاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس حد تک صحیح ہے، ان کے عہدِ طفلی اور عنفوانِ شباب کے حالات بہت کم ملتے ہیں، اس زمانے کے حالات جو کچھ تذکروں میں اور ان کے خطوط میں مل جاتے ہیں وہ بہت تشنہ ہیں، اکبرآباد کے دورانِ قیام کے حالات کے علاوہ مرزا کی زندگی کے اور بہت سے گوشے ابھی تاریکی میں ہیں، ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان کے حالات لکھنے کے لیے کچھ نئے مواد کی موجودگی ضروری ہے جب تک ان پر دست رس نہ ہو صحیح حالات سے واقفیت مشکل ہے۔

ان کی ساری تصانیف کے تنقیدی اڈیشن شائع کرنے ہیں، تصانیف کی اولیں اشاعتوں کا پتہ چلانا ہے، قاطعِ برہان، درفشِ کاویانی، ابرِ گہربار، (طبع اول) سوالاتِ عبدالکریم، تیغِ تیز، نکاتِ غالب، لطائفِ غیبی، کے مطبوعہ نسخے بہت کم یاب ہیں، ان ساری کتابوں کے مطبوعہ اڈیشن اور ان کے قلمی نسخے تلاش کرنے ہیں اور انھیں صحیح متن، تفصیلی مقدمے اور کارآمد حواشی کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

غالب کے نئے خطوط تلاش کرنے کا کام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے خطوط کی تعداد کا اندازہ آسان نہیں، تقریباً پینتالیس سال کی عمر تک جتنے خطوط انھوں نے اردو یا فارسی میں لکھے اُن کا بیشتر حصہ یا تو ضائع ہو گیا ہے یا ہمارے سامنے اب تک نہیں آسکا ہے، "پنج آہنگ" میں جو خطوط موجود ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں "متفرقاتِ غالب" کی اشاعت سے اس عہد کے کچھ نئے خطوط ہمارے سامنے آئے ہیں، کچھ اسی عہد کے، کچھ اس سے پہلے کے خطوط جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے تھے ہم نے "مآثرِ غالب" کے نام سے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع کیے ہیں۔ مرزا غالب کی ادبی زندگی کی ابتدا (تقریباً ۱۸۱۳ء) سے ان کے سفرِ کلکتہ ۱۸۲۹ء تک یعنی سولہ سال کے عرصے میں مرزا نے جو خطوط لکھے ہیں مفقود ہیں۔ یہ مدت سولہ سال سے بھی زیادہ کی ہو سکتی ہے۔ مرزا نے لکھا ہے کہ اُن کے ابتدائی سولہ سال لہو ولعب میں گزرے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مرزا خطوط تو لکھتے ہی ہوں گے، ادبی نہ سہی کاروباری یا نجی قسم کے سہی۔ ہمارے لیے تو ان کے ایسے خطوط ان کے ادبی خطوط سے اہمیت میں کسی طرح

کم نہیں۔ اس پورے عہد ۱۸۲۹ئ سے پہلے یعنی ۳۲ سال کی عمر تک کا صرف ایک خط مل سکا ہے جس کا عکس پہلی بار غالب نمبر میں شائع ہوا ہے۔[1] اردوئے معلیٰ اور عود ہندی یہ دونوں مجموعے تو ان کے زمانے میں شائع ہو چکے تھے (عود ہندی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے اور اردوئے معلیٰ وفات کے ۱۹ دن بعد شائع ہوئی) مرزا کے خطوط کے نئے مجموعے خطوط غالب اور مکاتیب غالب کی اشاعت سے غالبیات میں مفید اضافے ہوئے ہیں "متفرقاتِ غالب" "نادراتِ غالب" اور "مآثرِ غالب" بھی اسی فہرست میں داخل ہیں۔

"نوادرِ غالب" کے نام سے ایک ایسا ہی مجموعہ راقم الحروف کے زیرِ ترتیب ہے جس میں مرزا کے وہ سارے رقعات و مکاتیب مفید حواشی کے ساتھ جمع کر دیے ہیں جو اب تک ان کے کسی مجموعے میں شریکِ اشاعت نہیں ہیں لیکن پرانے اخباروں، بیاضوں یا قدیم مجموعوں میں موجود ہیں، اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ دوسرے نثری نمونے اور منظومات بھی ہیں منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام بھی خطوط کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، کچھ خطوط ٹپوڈی میں بھی بتائے جاتے ہیں، "ہندوسند" میں تلاش کیا جائے تو ابھی بہت سے خطوط کے برآمد ہونے کی امید ہے، یہ سارے خطوط صحیح متن اور مفید حواشی کے ساتھ جلد شائع کر دیتے چاہئیں، ساتھ ہی ساتھ نئے خطوط کی تلاش جاری رکھنی چاہیے، قدیم کتابوں، تذکروں، اخباروں، رسالوں اور گلدستوں سے غالب اور ان کے اعزہ و تلامذہ و احباب کے متعلق جو بھی معلومات بہم پہونچ سکیں انھیں جمع کرنا ضروری ہے، جب تک کچھ اور نیا مواد جمع نہیں ہوتا غالب کی شخصیت کے متعلق کوئی ایسی صحیح تصویر جس میں ان کے اصلی خدوخال نظر آئیں پیش کرنا ممکن نہیں۔

غالب کی تصویروں کے جمع کرنے کا کام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں ایک تفصیلی مضمون اس موضوع پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ مضمون نگار نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان کی تصویروں کے متعلق کوئی اطلاع بھی لکھنے سے نہ رہ جائے۔ ساتھ ہی سعیِ بلیغ کے بعد ان کی ساری ممکن الحصول تصویریں جمع کی گئی ہیں اور ان کے عکس شائع کیے جا رہے ہیں۔ غالب کی

---

[1] اس خط پر راقم کا تفصیلی مضمون ملاحظہ فرمایا جائے "غالب کا قدیم ترین مکتوب" مطبوعہ سالنامہ ہمایوں ۱۹۵۳ء

اور تصویروں کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔ ان کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے اعزہ و تلامذہ اور خاص تعلق رکھنے والے اصحاب کی تصویروں کا بھی کھوج لگانا چاہیے۔ رسالہ اردو اپریل ۳۱ء میں خواجہ قمر الدین راقم کی تصویروں کے علاوہ ان کے دوسرے اعزہ کا ایک گروپ فوٹو شائع ہوا تھا، خاندانِ لوہارو کے کچھ افراد کا بھی ایک مرقع عرصہ ہوا نظر سے گذرا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں دوسرے اصحاب خواجہ حاجی، نصر اللہ بیگ، نواب احمد بخش خاں الٰہی بخش معروف نواب شمس الدین احمد خاں، مرزا افضل بیگ وغیرہم کی تصویریں بھی تلاش کرکے محفوظ کرلی جائیں، جناب مالک رام صاحب کی اطلاع کے مطابق نواب احمد بخش خاں اور ان کے چھوٹے بیٹے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں کی تصویریں وکٹوریہ میموریل ہال (کلکتہ) میں موجود ہیں۔ خود ان کے پاس غالبؔ کے بعض اعزہ کی تصویریں محفوظ ہیں۔

ابھی عرض کیا جاچکا ہے کہ غالبؔ پر ابھی کام کی ابتدا ہوئی ہے اور بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی حیات اور ان کی ادبی و علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف مضامین کی سخت ضرورت ہے، متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں لیکن اس موضوع پر مختلف مضامین کا مجموعہ پہلی مرتبہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں پیش کیا گیا جس میں اس بات کا التزام کیا گیا تھا کہ ان تمام حضرات سے مضامین لکھوائے جائیں جو اس موضوع پر کام کرچکے ہیں یا دلچسپی رکھتے ہیں، مقامِ مسرت ہے کہ یہ مجموعہ ملک میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا گیا اور بیحد پسند کیا گیا' ہندوستان کے محققین اور بلند پایہ نقادوں نے بڑے ہمت افزا تبصرے لکھے اور اس موضوع کے ماہرین نے اس مجموعے کو گراں قدر مجموعہ اور قدر اوّل کی چیز کہا۔

اس مجموعے کی اہمیت کے پیشِ نظر انجمن ترقیِ اردو ہند نے فیصلہ کیا کہ اسے دوبارہ کتابی شکل میں ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا جائے چنانچہ انجمن کے فاضل سکریٹری جناب قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے مجھے اس بات پر مامور کیا کہ غالب نمبر کے مضامین میں ترمیم و تنسیخ، ردوبدل اور اضافے کردوں۔ میں اگر چاہتا تو بہ آسانی ایک دو ماہ میں یہ کام کرکے مسودہ انجمن کے حوالہ کردیتا، لیکن

میں نے اسے ایک ایسا مجموعہ بنانا پسند کیا جو علمی دنیا کے لیے بہت مفید ہو اور جس کی یاد مدتوں باقی رہے۔ میں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ یہ مجموعہ ہر لحاظ سے غالب اور انجمن دونوں کے شایانِ شان ہو۔

یہ مجموعہ تین جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ صفحات کی تعداد کا اندازہ ایک ہزار کے قریب ہے، پہلی جلد 'احوالِ غالب' ہیں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد 'نقدِ غالب' میں تنقیدی مضامین ہوں گے جن میں غالب کی شاعری، نثر نگاری اور ان کے فن وغیرہ پر بحث ہوگی، آج کل اس کے آخری اجزا کے پروف دیکھے جا رہے ہیں اور امید ہے یہ کتاب دو ماہ میں شائع ہوجائے گی۔ تیسری جلد 'گنجینۂ غالب' زیرِ ترتیب ہے۔ اس میں غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار شائع ہوں گے تصانیف کے قلمی و مطبوعہ نسخوں پر مضامین ہوں گے اور "یادگارِ غالب" سے ذکرِ غالب تک اب تک جتنی کتابیں غالب پر لکھی گئی ہیں ان سبھوں پر تبصرے کیے جائیں گے، اس کے علاوہ اس بات کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ غالب کے چند نایاب رسالے بھی ایڈٹ کرکے شائع کیے جائیں۔ اس مجموعے میں سارے مشاہیر اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑا عجیب اور دلچسپ تحفہ ہوگا۔

پیشِ نظر جلد 'احوالِ غالب' میں ۱۴ مضامین شائع کیے جا رہے ہیں، یہ سب کے سب غالب کی زندگی سے متعلق ہیں۔ جنابِ مالک رام، جنابِ غلام رسول مہر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنے مضامین میں بڑے مفید اور جامع اضافے کیے ہیں۔ اس طرح ضخامت کے ساتھ ساتھ افادیت بھی بڑھ گئی ہے۔ مالک رام صاحب کا مضمون ۱۶ صفحوں میں شائع ہوا تھا اب نظرِ ثانی و اضافہ کے بعد یہی مضمون ۲۷ صفحوں میں آیا ہے، اسی طرح ان پانچ مضامین کی مجموعی ضخامت ۷۶ صفحات تھی، اب نظرِ ثانی کے بعد یہ مضامین ۱۱۵ صفحات میں آئے ہیں، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس محنت اور توجہ سے مضامین پر نظرِ ثانی کی گئی ہے، قاضی عبدالودود صاحب نے تو عبدالصمد پر گویا نئے سرے سے دوسرا مضمون ہی لکھ ڈالا ہے۔ حمیدہ سلطان

کا مضمون اور ناظمہ پروین کی تحریر غالب نمبر ہی سے لی گئی ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کی خانگی زندگی اور خواجہ احمد فاروقی صاحب نے معرکۂ غالب و قتیل پر مضامین لکھے تھے، مرتب کے اصرار پر انھوں نے اپنے مضامین پر نظر ثانی اور اضافے بھی کر دیے ہیں۔

چار مضامین اس کتاب میں بالکل نئے ہیں اور خاص طور پر اسی کتاب کے لیے لکھے یا لکھوائے گئے ہیں۔ یہ علی الترتیب پروفیسر مسعود حسن رضوی اور اظہار الحق ملک کے مضامین 'غالب کے حالات میں پہلا مضمون'، اور 'غالب کے خود نوشت حالات' ہیں۔ اس کے علاوہ دو مضامین مرتب کے لکھے ہوئے ہیں، 'سر غالب در حدیث دیگراں' اور غالب کی تصویریں۔

جہاں کچھ نئے مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں وہاں دو پرانے مفید مضمون بھی شریک اشاعت کر لیے گئے ہیں، روداد مقدمہ مرزا غالب مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تمہید کے ساتھ شائع کی تھی غالب کا نسب نامہ خواجہ قمر الدین راقم کا رقم کردہ ہے جو ان کے عزیز ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں خواجہ قمر الدین کے خود نوشت حالات، اور ان کی زندگی پر مرزا رفیق بیگ کا مضمون بھی تھا۔ مرتب نے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کر کے علٰحدہ علٰحدہ شائع کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں متعدد تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں، ان میں سے بعض نادر ہیں اور بیشتر لوگوں کی نظر سے نہیں گزری ہوں گی، غالب کی تصویروں پر خاص توجہ کی گئی ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی کوئی ممکن الحصول تصویر شائع کیے جانے سے رہ نہ جائے، اور غالباً یہ سعی نامشکور نہیں رہی۔ آج تک کسی مشرقی شاعر یا ادیب کی تصاویر کو جمع کرنے اور ان پر مضمون لکھنے کا اس قدر اہتمام نہیں کیا گیا جس قدر اس مجموعے میں کیا گیا ہے، سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں، میں نے غالب نمبر میں ان کی تصویروں پر ایک نوٹ شائع کیا تھا اور ان کی دو قلمی تصویریں کے عکس پیش کیے تھے، بعد میں تحقیقات جاری رہی اور آج کل کے غالب نمبر ۵۲ء میں ایک مفصل مضمون میں نے لکھا، اب اس مجموعے میں مکمل ترین اطلاع ان تصویروں کے متعلق ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، غالب کی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے دو ملاقاتیوں کی تصویریں

بھی شائع کی جا رہی ہیں جن سے ان کے تعلقات رہے تھے۔ اس قید خانے کی تصویر بھی شائع کی جا رہی ہے جس میں وہ ۱۸۴۷ء میں تین مہینے قید رہے تھے۔ اس کے علاوہ غالب کی ایک تحریر جو انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کر ایک تذکرہ نگار کو بھیجی تھی اور ایک لفافہ کا عکس جس پر پتہ غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے غالبیات کے سلسلے میں اضافہ ہیں یہاں ان دونوں کے عکس شائع کیے جا رہے ہیں۔

احوالِ غالب کے سلسلے میں مرتّب کے کچھ اور منصوبے بھی ہیں اور ان کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی ہیں لیکن یہ مواد اب اس کتاب کی اشاعتِ دوم ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے اسے مفید بنانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، نہ ان پریشانیوں اور دقتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس سلسلے میں پیش آئیں۔ یہ مجموعہ اگر کامیاب ہے تو اس کی کامیابی کا سہرا ان مضمون نگاروں کے سر ہے جنھوں نے مرتّب کی استدعا پر مضامین لکھے۔

مضمون نگاروں کے علاوہ شکریہ کے مستحق جناب قاضی عبدالغفار صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) ہیں۔ انھوں نے سامانِ طباعت کی اس گرانی اور کمیابی کے زمانہ میں نہ صرف اس مجموعے کے مرتب اور شائع ہونے پر اصرار کیا بلکہ ہمیشہ اپنا قیمتی وقت اور مشورہ دیتے رہے اور ہر مشکل موقع پر مدد کے لیے آمادہ رہے۔ مرتّب ان کی عنایتوں کا ممنون ہے۔

۵، حالی روڈ، مسلم یونیورسٹی
یوم وفات سر سید ۱۹۵۳ء

مختار الدین احمد

پروفیسر رشید احمد صدیقی

غالب اور علی گڑھ

مرزا اسداللہ خاں غالب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۱۷۹۷ء — ۱۸۶۹ء ہمارے ملک کے عظیم شاعروں میں ہیں۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف نثر ہمارا بہت بڑا ورثہ ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب کا شمار ان شخصیتوں میں ہے جنھیں ہم ہر اعتبار سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کا مسلک رنگ و نسل، مذہب و ملت اور ذات پات کی قید سے علیحدہ اور بلند ہو کر ساری انسانیت کو ایک رشتۂ یگانگت میں لانا تھا۔

غالب کے شاگردوں اور دوستوں کا حلقہ نہایت وسیع اور متنوع تھا جس میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں ایک طرف ہرگوپال تفتہ، بال مکند بے صبر، شیو نرائن آرام، منشی جواہر سنگھ جوہر، لالہ چھج مل رائے، امیر سنگھ اور منشی نول کشور تھے تو دوسری طرف ولیم فریزر، ربٹی گن، اسٹرلنگ اور الیگزنڈر ہیڈرلے سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔

غالب دہلی کے آخری عہد کی علمی فضیلتوں اور تہذیبی خوبیوں کا بڑا دلکش اور بے مثل نمونہ تھے۔ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیبی بساط پر جو دیرپا اور قابلِ احترام نقوش ابتدا سے لے کر مغلوں کے عہد تک مرتسم ہوتے رہے، ان میں غالب کی شاعری کی عظمت اور ان کی شخصیت کی دل آویزی نے بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ ہم ان کو ہندوستان کی قابلِ فخر یادگاروں میں سے

ایک یادگار سمجھتے ہیں اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے اور تازہ کار بنانے کے لیے ان تمام تحریکوں کا خیر مقدم کرتے ہیں جو اس مقصد کے لیے بروئے کار لائی جائیں]

ان الفاظ میں ایک اپیل اربابِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ابھی کچھ روز ہوئے شائع کی تھی

انجمن ترقیِ اردو کی طرف سے غالب کی شاعری اور زندگی سے متعلق مستند اہلِ قلم کے مقالات تین جلدوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) احوالِ غالب جس میں غالب کی زندگی کے بارے میں بہت سی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی مختلف تصاویر پر ایک فاضلانہ مضمون ہے نیز وہ تمام تصاویر شائع کی گئی ہیں جو اب تک دستیاب ہو سکی ہیں۔

(۲) افکارِ غالب جس میں غالب کے مستند نقادوں کے بلند پایہ مقالے ہیں۔

(۳) گنجینۂ غالب جس میں بہت سے غیر مطبوعہ خطوط اور غیر مطبوعہ اشعار کے علاوہ غالب کی بعض نادر تصانیف شائع ہوں گی۔ غالب کی تصانیف اور ان کی اوّلین اشاعتوں پر مضامین ہوں گے اور غالب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان پر تبصرے ہوں گے۔

اس سلسلے کا پہلا قدم ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے اٹھایا اور علی گڑھ اردو میگزین کا غالب نمبر[۱] شائع کیا۔ یہ نمبر علمی اور ادبی حلقوں میں اس درجہ مقبول ہوا اور اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ ان مقالات کو دوسری بار شائع کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ چنانچہ انجمن ترقیِ اردو نے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی و صدر انجمن ترقیِ اردو کی اجازت و اعانت سے غالب نمبر کو نئے سرے سے وسیع تر پیمانے پر مرتب کر کے شائع کرنے کا اہتمام اپنے ذمے لیا۔

انجمن نے یہ کام غالب نمبر کے مرتب ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب کے سپرد کیا جنھوں نے حسبِ معمول بڑی محنت و قابلیت سے غالب نمبر میں متعدد قابلِ قدر مقالوں کا اضافہ کیا۔ بعضوں پر مقالہ نگاروں

---

[۱] یہ نمبر مختار الدین آرزو صاحب کی ادارت میں نکلا۔ جب وہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ عربی میں تحقیقاتِ علمیہ کے صلے میں یونیورسٹی نے حال ہی میں ان کو ڈاکٹریٹ تفویض کی ہے۔

سے نظرِ ثانی کرائی اور چند کو یکسر حذف کر دیا۔ اس طرح کام بڑھا اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ امید کی جاتی ہے کہ غالبؔ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجلدات مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گی

ان دنوں دہلی سے غالب میموریل کی ایک تحریک بھی اٹھائی گئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ غالب کے شایانِ شان دہلی میں ایک غالب ہال تعمیر کیا جائے۔ اس تحریک کے بانیوں میں ہر طبقۂ خیال و عقیدہ کے لوگ شامل ہیں اور بڑے خلوص اور سرگرمی کے ساتھ ایک لاکھ روپے کی رقم جمع کرنے اور مجوزہ اسکیم کو بروئے کار لانے میں منہمک ہیں۔

اس زمانے میں اس تحریک کو جس خلوص سے اٹھایا گیا ہے اور جس فراخ دلی سے دور و نزدیک اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے، وہ غالبؔ کی شاعری اور شخصیت سے ملک کی شیفتگی کا بیّن ثبوت ہے۔ غالبؔ کی تصویر سے مزیّن ڈاک خانہ کے ٹکٹ کا اجرا بھی ہندوستان کے اکابر شعرا میں غالبؔ کا درجہ متعیّن کرتا ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس گہری عقیدت کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو غالبؔ کے زمانۂ حیات سے آج تک علی گڑھ کو غالبؔ اور ان کے کلام سے رہی ہے اس سے اس ذہنی رابطہ کا راز بھی سمجھ میں آجائے گا جو علی گڑھ اور غالبؔ کے درمیان شروع سے چلا آرہا ہے۔ اربابِ علم و فن کو غالبؔ سے بہ حیثیت شاعر، بہ حیثیت شخص، بہ حیثیت علامت اور بہ حیثیت ادارہ متعارف کرنے کا مشکل و محترم کام سب سے پہلے علی گڑھ کے بانی سر سیّد احمد خاں مرحوم[1] اور ان کے برگزیدہ رفیقِ کار اور اردو کے سب سے شریف اور دردمند شاعر و نقاد مولانا الطاف حسینؒ حالیؔ[2] نے انجام دیا۔ ان کے بعد کالج کے دو نامور فرزندوں ڈاکٹر سیّد محمود اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری[3] نے غالبؔ کی اہمیت و عظمت کو نقد و نظر کے جدید طریقوں سے اپنی تصانیف اور تحریروں میں جتایا۔ ان مقالہ نگاروں کے بعض نظریوں

---

[1] آثار الصنادید

[2] یادگارِ غالبؔ

[3] مقدمہ دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں

[4] محاسنِ کلامِ غالبؔ

یا نتائج سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان مقالات کے قابلِ قدر ہونے میں کلام نہیں۔

غالبؔ کا اردو دیوان سب سے پہلے سر سیّد کے بھائی سید محمد خاں بہادر مالک مطبع سیّد المطابع و سید الاخبار نے ۱۸۴۱ء میں اپنے مطبع سے شائع کیا۔ سر سیّد کی کتاب آثار الصنادید (۴۷-۱۸۴۶ء) سب سے پہلی کتاب ہے جس میں غالبؔ کے حالات و کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا باب چہارم جس میں دلّی کے نامور مشائخ، علمائ، فقرا، اطبّاء اور شعراؤ وغیرہ کا ذکر ہے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ تقریباً یہ سب لوگ ایسے ہیں جن سے سر سیّد متعارف تھے۔ ان میں مرزا غالب کا تذکرہ شعرا کے ضمن میں سب سے پہلے کیا گیا ہے۔ جو ستر ہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسی آثار الصنادید پر غالبؔ نے تقریظ لکھی، اس کی اشاعت میں دلچسپی لی، خطوط لکھ کر لوگوں کو اس طرف مائل کیا، کچھ نسخے خرید کر دوستوں کو بھیجے اور کتاب کی بڑی تعریف کی۔ ملاحظہ ہو غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط بہ نام سیّد رجب علی صاحب ارسطو جاہ جس کا عکس غلام رسول مہرؔ کی کتاب میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> "دریں زمانہ یکے از دوستاں کتابے مع نقشہ ہائے آثار عمارات دہلی کہنہ و نو نگاشتہ گوئی چمنے آراستہ ست و مع ہذا باب چہارم کہ ختمِ کتاب بر آن ست، رقم ہائے اشعارِ سخن سنجانِ ایں دیار ہم دارد۔ چوں بندہ را ایں نسخہ از روے جامعیت پسند آمد یک نسخہ از مطبع خریدہ بہ ارمغاں می فرستم و چشمِ قبولِ ایں نذرِ محقر دارم"

انجمن ترقیِ اردو نے ۱۹۱۶ء میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نہایت صحیح اور خوب صورت اڈیشن نکالنے کا ارادہ کیا تو اس کام کے لیے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن کی نظر انتخاب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری پر پڑی۔ بجنوری مرحوم نے بڑی تن دہی و محنت سے غالبؔ کے مختلف نسخے تلاش کیے کچھ مطبوعہ اڈیشن سامنے رکھے، اغلاط کی تصحیح کی۔ اور اپنا ایک نسخہ مرتب کیا اور وہ مقدمہ لکھا جو محاسنِ کلامِ غالبؔ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نسخہ متداول دیوان پر تھا لیکن ڈاکٹر بجنوری کی حیات ہی میں نسخۂ حمیدیہ کا پتہ چل گیا تھا جس کی انھوں نے نقل تیار کرا لی تھی اور اس پر باضابطہ کام کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ بعد میں نسخۂ حمیدیہ مفتی انوار الحق صاحب نے شائع کیا جس کے ساتھ بجنوری مرحوم

کا یہ مقدمہ شامل ہے۔

غالبؔ کے مزار کو گمنامی اور شکست وریخت سے بچانے اور اسے غالبؔ کے شایانِ شان ایک یادگار کی شکل میں منتقل کرنے کی اپیل سب سے پہلے علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے اور ہندوستان کے مسلّمہ لیڈر مولانا محمد علی مرحوم بی۔ اے (آکسن) نے اپنے مشہور اخبارات ہمدرد اور کامریڈ میں بڑے شدّومد سے کی تھی۔

غالبؔ کے اردو کلام کا نہایت خوب صورت جیبی اڈیشن نکالنے کا سہرا علی گڑھ کے دوسرے اولڈ بوائے اور موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سر ہے۔ جب وہ ۱۹۲۵ء میں جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ اڈیشن نہایت حسین جلد و جدول اور نفیس نسخ ٹائپ میں مطبع شرکت کادیانی برلن سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

جس طرح اردو کے محسن و مستند مصنف ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) سکریٹری انجمن ترقی اردو کی سعی و شوق سے انجمن کے دورِ اوّل میں شائقینِ اردو کو کلامِ غالبؔ سے جدید نقطۂ نظر اور اصولِ تنقید سے متعارف ہونے کا موقع ملا اسی طرح انجمن ترقی اردو کے دورِ ثانی میں مشہور صاحب طرز و صاحبِ قلم قاضی عبدالغفار صاحب (علیگ) کی سعی و شوق سے شائقینِ اردو کو غالبؔ کی شاعری، شخصیت اور زندگی کے مختلف زاویوں سے روشناس ہونے کا موقع فراہم ہوا۔

شعبۂ اردو کے ایک رکنؒ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے غالبؔ پر ایک مقالہ پیش کیا ہے۔ امید ہے شائع ہونے پر اربابِ علم و فن میں اس کی پذیرائی نہایت امید افزا ہوگی اور غالب پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔

کسی شاعر پر کسی ایک مصنف کی مستقل تصنیف بجائے خود بڑی مفید چیز ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر متعدد اہلِ قلم ایک ہی شاعر کے بارے میں اپنی تحقیقات و تاثرات کا یک جا اظہار کریں، جیسا کہ ان مجلّدات میں ہوا ہے تو اس شاعر کے سمجھنے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔

خورشید الاسلام

ان مجلدات میں جو مضامین درج ہیں، ان کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ غالب سے متعلق جو باتیں جس طرح سے مان لی گئی تھیں، ان میں سے اکثر صحیح نہ تھیں یا ان کا مدار واقعیت پر اتنا نہ تھا جتنا عقیدت پر۔ کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوں گی جن سے غالب کی شخصیت جہاں تہاں سے دھندلی یا داغ دار نظر آئے گی۔ لیکن ان کے باوجود غالب غالب ہی رہتے ہیں یعنی عہد بھی اور عہد آفریں بھی۔ غالب کی تمام کمزوریاں صحیح مان لی جائیں تب بھی ان کی اہمیت وعظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

گزشتہ پچیس تیس سال میں غالب اور اقبال پر جتنی قابلِ قدر تصانیف ہمارے سامنے آئیں اردو کے اور کسی مصنف اور شاعر کے حصے میں نہ آئیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو داں طبقے کے ذہن ودماغ پر ان دونوں کی کیسی گرفت ہے۔ شعروادب کے واسطے سے غالب اور اقبال ہمارے ذہن وفکر کے نشاناتِ منزل ہیں۔ نشاناتِ منزل ہی نہیں بلکہ اس پیچ وخم، نشیب وفراز اور جنّت وجہنّم کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو اس سفر ورہگزر میں پیش آئے ہیں۔

کسی قوم اور ملک کی عظمت واہمیت کا صحیح اندازہ لگانا مقصود ہو تو اس قوم اور ملک کی شاعری اور شاعر کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس لیے کہ ہر قوم وملک کی شاعری اور شاعر اس قوم وملک کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور تقدیر بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ان تین مجلّدات میں غالب کے بارے میں بہت کچھ بیان کر دیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اقبال پر بھی مجلّدات شائع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ انجمن ترقیِ اردو کے کرنے کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کام کو اربابِ علم کے حلقے میں کافی سراہا جائے گا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہماری جس ذہنی رجحان ورفعت کی نشان دہی غالب کرتے ہیں، اقبال اس کی تعبیر وتکمیل عہدِ جدید کے مطالباتِ فن وفکر کی روشنی میں کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں جس سے ہمارا ماضی ہمارے حال ومستقبل کے ساتھ پرایا نہیں رہتا بلکہ پیوست ہو جاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ حیاتِ قومی کے اس ربط وتسلسل کو قائم رکھنا جتنا مشکل کام ہے اتنا ہی محترم کارنامہ ہے۔ اس اعتبار سے اقبال پر یہ مہم جتنا جلد کام شروع کر دیں مناسب اور مبارک ہوگا۔

علی گڑھ

۱۴ مارچ ۱۹۵۳ء رشید احمد صدیقی

استدراکات وتصحیحات

مرتّب ممنون ہوگا اگر قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے وقت ذیل کی سطریں پیشِ نظر رکھیں :

'سیرِ غالب درحدیثِ دیگراں' از: مختار الدین احمد

ص ۳۰، ۱۳/۳۰- غلام غوث بے خبر کی عبارت کے بعد اس تحریر کا اضافہ کیا جائے:

محمد نثار علی شہرت، غالب کی ایک ملاقات کا حال لکھتے ہیں۔

"ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگ ترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے، چوں کہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا، میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا، آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں:

ہاں! آپ مولوی آ گئے ہیں"

میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا، اس میں کچھ بنانے لگے، غالباً اصلاح دے رہے تھے میں نے گذارش کی۔

"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں"؟ تو فرمانے لگے:

"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی:

"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے:

"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا" پھر فرمانے لگے۔ "دہلی والوں کی جو اردو ہے (جس کو مشک و عنبر کہنا چاہیے) اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی: "داغ کی اردو کیسی ہے"؟ فرمانے لگے:

"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"

(کچھ داغ کے متعلق از امتیاز علی عرشی صاحب رسالہ خاور مارچ ۵۳ء بحوالہ آئینہ داغ ص ۳۴)

۱۸/۵۲ منور علی شاہ کے متعلق ان کے خاندان کے ایک فرد معظم علی شاہ صاحب استاد شعبہ اردو سینٹ جانس کالج آگرہ نے میری استدعا پر ایک تحریر لکھ کر بھیجی ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"حضرت منور علی شاہ (۱۱۹۰ھ - ۱۲۳۵ھ) آگرہ کے سربرآوردہ رئیس اور صوفی تھے، اپنے والد مولوی سید امجد علی صاحب اصغر (گلشن بیخار ص ۲۲) کے سجادہ نشین اور صاحب سلسلہ و صاحب کرامات بزرگ تھے، آگرہ کے تمام صوفی حضرات آپ کو اپنا پیشوا اور ہادی گردانتے تھے، طرز معاشرت رئیسانہ تھا، مہاراجہ گوالیار آپ کا معتقد تھا اور چار گاؤں جاگیر میں نذر کیے تھے۔ جو ختم زمینداری ۱۹۵۲ء تک آپ کے [خاندان کے] قبضہ میں تھے۔ روزانہ شام کو آپ کے یہاں نشست میں شہر کے عمائد اور سربرآوردہ حضرات شریک ہوتے تھے۔ قیاس ہے کہ انھیں محفلوں میں غالب بھی اپنے کسی بزرگ کے ساتھ شریک ہوتے ہوں گے، اس لیے کہ غالب عمر میں شاہ صاحب سے چھوٹے تھے اور اسی لیے دوستانہ تعلقات مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب علم ظاہر اور علم باطن دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ یہ خصوصیت اس خاندان میں اب تک چلی آرہی ہے میکش صاحب اکبرآبادی آپ کے جانشین اور پوتے ہیں

۶/۵۷ افسوس ہے کہ خواجہ عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ خود میرزا نے انھیں کیا سنایا۔

غذا: مرزا کی غذا کے متعلق ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء ہی سے کم ہو چکی تھی، آگے چل کر تو گویا مفقود ہو گئی تھی۔ مرزا اکتوبر ۱۸۶۶ء میں لکھتے ہیں: "غذا ایک قلم مفقود، آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکہ۔" ۴ دسمبر ۶۶ء کو لکھتے ہیں: "غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔"

خواجہ حالی نے بھی ان کی آخری عمر کی غذا کی جو تفصیل لکھی ہے وہ اسی کے قریب ہے، لکھتے ہیں: "صبح کو شیرہ بادام، دن کو پاؤ سیر گوشت کا قورمہ، ایک پیالی میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی اور دو تین پیسہ بھر دہی" اس کے برخلاف صفیر بلگرامی کا بیان یا تو بربنائے مبالغہ ہے یا غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

۳/۶۷ یہ فارسی قطعہ غالب کے ایک خط (عود ہندی: ۴۲) میں بھی موجود ہے۔ یہ قطعہ آذری (وفات ۸۶۶ھ) کا ہے جو ایران کے صوفی شعرا میں ہے، یہ ہندوستان بھی آیا تھا، غالب کی تحریروں میں اس کا نام نہیں آیا، قطعۂ آذری جواہر الاسرار (نسخۂ کتب خانۂ مشرقیہ، بانکی پور، ورق: ۲۱۴) کے علاوہ بعض تذکروں میں بھی ہے اور قرینہ ہے کہ غالب نے کسی تذکرے ہی میں دیکھا ہوگا۔ جواہر الاسرار اور تذکروں کی روایتوں اور غالب کی روایت میں اختلاف ہے (دیکھیے جہان غالب معاصر حصہ ۱۱

ہر مرد تم عبد الصمد: از قاضی عبد الودود صاحب

۱۵/۲۳۵ 'یقین' کی جگہ تعیین پڑھیے۔

۷/۲۴۰ 'پوژ دیژرد' کی جگہ پوزدو یزدپڑھیے۔

۱/۲۴۶ 'جاسہ، دچکاسہ' کی جگہ 'جامہ' دچگامہ'

۱۲/۲۴۹ 'شور خوانده' کی جگہ 'شود خوانده زما خوانده۔

۱۰/۲۵۸ استدراک کی جگہ تصحیح و اضافہ پڑھیے۔

۱۲/۲۵۸ 'نوائے ادب (بابت جنوری) جنوری میں نہیں بلکہ اس کے کئی ماہ بعد شائع ہوا

۲۲/۲۶۱ اس فن کی جگہ 'مشاہیر کے حالات زندگی پر'

۶/۲۶۴ "تصحیح و اضافہ" یہ الفاظ غیر ضروری ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی

غالب کے حالات میں پہلا مضمون؟

منشی بال گوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرۂ بال گوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتدا میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود ان کا بھی ایک مطبع تھا آگرہ اردو اخبار پریس اور اس کے مہتمم، پرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا "ذخیرۂ بال گوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیئس ۲۳ پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے:-

> "ذخیرۂ بال گوبند مشتمل بر جمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم
> درائے و تقاریر معرفتِ الٰہی و عجائبات روزگار و حالات
> دلچسپ و قصص رنگین و لطائف و ظرائف و مراسلات و غزلیات
> شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر۔"

اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے "مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے غالب کے متعلق ہماری معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اب کچھ اوپر سو برس کے بعد یہ پھر شائع کیا جا رہا ہے۔

(۲۵ مئی ۱۹۵۱ء)

مرزا اسد اللہ خاں متوفّی المتخلّص بہ غالبؔ و نوشہ

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی ہی حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اردو و فارسی کے پڑھے یا سنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلّص اپنا کہیں اس نے غالبؔ اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسد اللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتدا میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت، ملکیت اور اختیارات پائے بہ فنِ سپہ گری و جوہرِ شمشیر پائے۔ علم فارسی اس نے بامیدِ روزگار تحصیل نہیں کیا تھا، اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونیِ طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئی زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں نام اور مطالب ان کے یہ ہیں یعنی۔

۱. **دیوان فارسی**۔ اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں۔

۲. **دیوان ریختہ**۔ یہ دیوان اردو، نہایت مختصر ہے۔

۳. **مہر نیمروز**۔ یہ تاریخ خاندانِ تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانہ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ

خارج شدہ بادشاہ دہلی تخلص ظفر ہے۔

۴. دستنبو۔ اس میں ایامِ غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵. پنج آہنگ۔ اس کتاب میں اپنے خطوط، دیباچے، خاتمے کتب کے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر درج کیے ہیں۔

۶. اُردوئے معلّٰی۔ اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتم نے اُردو زبان کے رقعات ان کے جمع کرکے یہ نام رکھا ہے اور انھیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

۷. قاطعِ برہان۔ بہ تبدیلیِ نام درفشِ کاویانی۔ اس میں برہانِ قاطع مشہور کتاب لغت کے مؤلف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرضِ طبع میں آئے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اتار کر حلیۂ فرنگیین سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہبِ نو اختیار کا اور کیفیت فرنگیین ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔ یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے۔ مے پرستی کا ایامِ شباب سے تا بہ عالمِ پیری شوق تھا۔ جس وقت عالمِ سرور اور دن ابر کا ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی، روشِ باغ میں سیرِ چمن و گلگشتِ گلشن کرتا ہوتا تھا، اس وقت طبیعت درختہائے دلکش و گلہائے رنگین کو خیابانوں میں طراوت بخش و لہلہاتا دیکھ کر لہرایا کرتی تھی۔ بعدِ وفات مرزا ذوق، نامی گرامی شاعر اردو، ملک الشعرا خطاب، استاد بہادر شاہ کے یہی موردِ عنایاتِ سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں ان دنوں کہ زمانے میں طفیل سرکار دولتمدار انگلشیہ کے علم و ہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر ان کے نظم و نثر کلاموں پر بہتیرے اعتراض کیے اور وہ اخباروں میں شائع ہوئے تھے، جوابات بھی ان کے اسداللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کیے جاتے تھے۔ بہت سے قیل و قال ہوتے تھے۔ ان میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں، حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے، بدن میں ضعفِ ضعیفی غالب ہے، سماعت سے

عاری ہوں، ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں، آدمی کی صورت نہیں پہچانتا، آواز کم سنائی دیتی ہے، جو کوئی بروقتِ ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے، کاغذ قلم دوات، چاقو قلم دان لبِ بستر ہر وقت پیشِ نظر رہتے ہیں، خور و نوش کے ہضم کی قوت نہیں، زندگی کا لطف نہ رہا موت نزدیک معلوم ہوتی ہے، اگر چند روز مَر مَر کے جیے تو کیا جیے، اب قابلِ معافی ہیں اور واقع میں یہ جواب اس کا معقول تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی اچھا خوش مزاج، یار باش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر، حسب و نسب میں اعلیٰ، ملکوں میں نامور اور شاعر اور منشی قابلِ تعریف تھا۔ دم اس کا بھی غنیمت تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں ۷۳ برس کی عمر پاکر روضۂ رضواں میں جاگزیں ہوا۔ جس نے سنا اس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اس کا کلام، جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، روے زمین پر قائم رہے گا۔ وہ زندہ تصوّر کیا جائے گا اور نام اس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دعا ہے کہ غفور الرحیم اس کی منفرت کرے۔

شاعروں نے جو تاریخیں اس کی وفات کی نکالی ہیں ان میں سے ایک تاریخ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعۂ تاریخ

طبعزاد مولوی محمد حسین آزاد شاگردِ رشید محمد ابراہیم خاں ذوق دہلی

بلبلِ باغِ پہلوی و دری | اسد اللہ غالب و نوشہ
فکرتش جاں نواز و جانش پاک | نفسش روشن و دلش آگہہ
سخنش کانِ گوہرِ افکار | نظم و نثرش تمام نقد سرہ
غالبؔ آں شیرِ بیشۂ معنی! | صیدِ مضموں شکارا و جو برہ
بہ ظہورش خفا ظہوریؔ را | اسدیؔ در مقابلش روبہ
عنصریؔ پیشِ اوست بے جوہر | عسجدیؔ بردہ بر درش سجدہ
بعروسِ بحرہاے سخن | فی المثل پیر زاہدے نوشتہ

رخت بربست چوں زدارِ کہن — نظمِ مضموں شدست آوارہ
جگرِ بجرآب شد بہ غمش — دلِ تقطیع گشت صد پارہ
از پئے سالِ رحلتش آزاد — ہاتفِ غیب گفت و زد نعرہ
شدہ مغفور از خدائے غفور — کہ بود سالِ فوتِ او "غفرہ"

۱۲۸۵

اظہار الحق ملک

غالب کے خود نوشت حالات

ٹیلگن صاحب، جج عدالت خفیہ دہلی، ایک باذوق انگریز تھے جنھیں فارسی ادبیات اور تاریخ سے دل چسپی تھی، قیامِ ہندوستان کے زمانے میں انھیں فارسی شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے انھوں نے بڑی سعی و کاوش کی، تذکرے کی ترتیب اور تاریخ و تذکرے کی کتابوں اور جدید شعرا کے تراجم حاصل کرنے میں اور لوگوں کے علاوہ انھیں اپنے منشی مولوی مظہر حق (خلف مظہر علی ظہور) سے بڑی مدد ملی تھی۔ ٹیلگن، تذکرہ انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے اور اس میں انتخابِ اشعار متروک تھا، انھوں نے کوئی چھ سو شاعروں کا ترجمہ لکھ ڈالا تھا، لیکن تذکرہ نا تمام رہا۔ مولوی مظہر حق نے اس میں اضافے کیے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں ترتیب پا چکا تھا اور لوگوں سے تقریظیں اور قطعاتِ تاریخ بھی لکھوائے گئے تھے لیکن بعد کو اس میں مزید اضافے ہوئے اور کوئی دو ہزار شعرا کے حالات لکھے گئے اور نمونۂ کلام بھی درج کیا گیا۔ مولوی انوار الحق میر منشی اجنٹی مارواڑ کا بھی اس تذکرے کی ترتیب میں ہاتھ رہا ہے اور انھوں نے کوئی چار سو سے زائد شعرا کے ترجموں کا اضافہ کیا، اس پر بھی مرتبین مطمئن نہ ہوئے اور بمبئی، کلکتہ ممالکِ وسطِ ہند کے شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام کے لیے انھوں نے اخبار وں میں اشتہار دیا۔ ٹیلگن صاحب نے تذکرہ کا نام کیا رکھا تھا اور وہ شائع ہوا یا نہیں اس کا پتہ نہیں چل سکا، غالباً وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا لیکن بعد میں اضافے کے بعد اس کا نام بہ قیاسِ غالب مظہر العجائب

رکھا گیا تھا۔ قیمت تین روپے ہوئی قرار پائی تھی اور محلہ بہرام خاں دہلی ملنے کا پتا تھا۔

اس تذکرے کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ تذکرہ کس قدر تحقیق اور دقتِ نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا اور اس کی نوعیت کیا تھی اور کن کن شعرا کے ترجمے اس میں درج تھے لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں مرزا غالب کے بھی حالات درج کیے گئے تھے اور سچ یہ ہے کہ اگر ان کا ترجمہ درج نہ ہوتا تو یہ بات باعثِ حیرت ہوتی۔ غالب کے تعلقات، ٹیلگن مظہرحق، ان کے والد مظہر علی ظہور، ان کے بھائی انوار الحق میر منشی سب لوگوں سے تھے، ان کے خطوط میں ان سب لوگوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہی نہیں، اس تذکرے کے لیے مواد اور شعرا کے ترجموں کی فراہمی میں خود مرزا نے بھی مدد کی تھی اور اس کے لیے انھوں نے کوئی تقریظ یا قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا غالب کے خطوط میں ٹیلگن اور اس کے تذکرے کا کئی جگہ ذکر ہے اور تفتہ کے نام کے ایک خط میں تو اس تذکرے کے متعلق اچھی تفصیل ملتی ہے اور اس سلسلے کے مفید معلومات مل جاتے ہیں: مرزا رقم طراز ہیں:

" ٹیلگن صاحب تذکرہ شعراے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں، مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی میں نے سات کتابیں بھائی ضیاءالدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں، پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج، میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بہ قید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں، فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔

نواب مصطفےٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں، اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

منشی ہر گوپال، معزز قانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں۔ تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔

ظاہرا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا۔ پھر کچھ آپ لکھا ہوگا۔ اب میں مولوی مظہر الحق، ان کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا۔ اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف

شاعر کا نام اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا.....“[1]

تفتہ ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

”یکشنبہ ۱۱ دسمبر ۱۸۶۴ء کو مولوی مظہر الحق آئے تھے ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ٹیگن صاحب کے لکھا تھا، دونوں دیوان تمہارے اور نشترِ عشق اور ایک تذکرہ، اور یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی ان کو پہونچیں، صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے بہت معتقد ہیں۔ فائدہ اس التفات کا یہ تھا کہ تمہارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے...“[2]

ان خطوں سے کئی باتوں کے علاوہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ۱۶ شاعروں کا حال خود مرزا نے ٹیگن کو لکھ بھیجا تھا، یہ بات قطعاً قابلِ قبول نہیں کہ خود اپنا حال انھوں نے لکھ کر بھیجا نہ ہو۔ تذکرہ مظہر العجائب موجود نہ سہی لیکن اس میں مرزا کا جو ترجمہ درج کیا گیا تھا، وہ اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے، اور یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اس تحریر کی اہمیت یہ ہے کہ حالات خود مرزا کے لکھے ہوئے ہیں، دوسری بات یہ کہ نقل نہیں بلکہ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصلی تحریر ہے۔ تحریر کا انداز، شانِ خط سب وہی ہے جو مرزا غالب کا ہے۔ غالب 'لارڈ صاحب' ہمیشہ اس طرح لکھا کرتے ہیں' لاڑد صاحب'۔ یہی بات یہاں بھی موجود ہے۔

اس تحریر میں تقریباً وہی باتیں ہیں جن کا ذکر اکثر و بیشتر ان کی تحریروں میں ملتا ہے، لیکن ان کے دادا کا نام، 'توقان بیگ'، صرف یہیں ملتا ہے اب تک کسی ماخذ میں یہ نام نظر سے نہیں گزرا۔ افسوس ہے کہ اس تحریر میں ان تین خطوں کے خلاصے درج نہیں جو مرزا کے نام انگلستان سے آئے تھے اس تذکرے کا کسی کو علم ہو تو ان خطوط کا کچھ پتا چلے۔ اس تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن داخلی شہادت اس بات کی موید ہے کہ اس کا زمانۂ تحریر ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ ہوگا۔ یہ تحریر آج سے کوئی پچیس سال پہلے رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی مرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصل تحریر انجمن

---

[1] اردوئے معلّٰی طبع لاہور ۱۹۲۲ء : ۳۰۔

[2] اردوئے معلّٰی : ۴۶

ترقی اردو میں موجود ہے، غالبؔ کے قدردانوں کی دل چسپی کے لیے اس کا عکس شائع کیا جاتا ہے۔
اب مرزا غالبؔ کی خود نوشت سوانح حالات ملاحظہ ہوں۔

ترجمۂ مرزا غالبؔ

اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالبؔ تخلص، قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے۔ اس کا دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا، پچاس گھوڑے اور نقّارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسداللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خاں دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا۔ اسداللہ خاں اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ عبداللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔ جس حال میں کہ اسداللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد آئے تو نصراللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی پھر جب اس نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر سواروں سے چھین لیے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریقِ استمرار عطا فرمائے مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگِ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کے مر گیا۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی۔ اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شر کا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپے سال اس شخص کی ذات کو اسی زرِ معافی میں سے ملتے ہیں۔ اس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے، گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سرپیچ موتیوں کی مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباریوں کی فہرست کے کمشنر بہادر حصار نے کہ دریں ولا قائم مقام

صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں، مثل اور رئیسوں نے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بے چارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جاسکا، مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں کا بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں، لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے تکلف لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا، خیر، اخیر عمر میں یہ ایک داغِ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے، اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ کو ولایت بہ سبیل ڈاک لارڈ ڈالہن برا گورنر سابق کی معرفت بھیجا اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطہ انڈیا گورمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں اب ہم ان تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اس ذکر کو ختم کرتے ہیں۔"

خواجہ قمرالدین راقم

مرزا غالب کا نسب نامہ

اس بندۂ خاکسار بے بضاعت خواجہ قمرالدین راقم نے جب شرحِ دیوانِ غالب ختم کر لی اور ہر شعر
کے معنی بخوبی و خوش اسلوبی حل کر لیے، اس وقت خیال آیا کہ مرزا غالب کا اور اپنے بزرگوں کا
نسب بھی خاندانی ظاہر کرنا ضرور ہے تا کہ خاص و عام پر روشن و مبرہن ہو کہ غالب کون تھے
اور کیا تھے اور ان کے خاندانی بزرگ کس مرتبے کے تھے اور راقم سے غالب کا سلسلہ نسب کیا ہے،
اس سبب سے اس نقیر بے مایہ نے بزرگوں کا حقِ خدمت اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کیا کہ تا دورِ عالم
ان کی یادگار میں قائم رہے۔ اگرچہ مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف یادگارِ غالب میں استاد
کا نسب بہ اختصار لکھا ہے مگر وہ بھی ادھورا، استاد کی زبانی سُنا سنایا لکھا ہے کس لیے کہ نسب کا
پورا حال غالب کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ان کے باپ و عم
ان کی طفلی میں مر گئے تھے اور خاندانی شجرہ راقم کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں کے پاس تھا جو
رشتے میں غالب کے بھائی ہوتے تھے اور غالب کی پرورش وہی کرتے رہے۔ غالب نے
جس قدر بھائی کی زبانی سنا تھا جا بجا اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور اپنی نسل فریدوں
کی نسل میں بیان کی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب کے اور ہمارے بزرگ سلاطینِ توران
میں تھے۔ غالب کی اور ہماری یک جدی نسل ہونے سے یہ بیان ہرگز غلط نہیں ہے کس لیے
کہ وہ شجرہ راقم کی نظر سے عہدِ طفلی میں گزرا ہے اور راقم نے اکثر اپنے عم بزرگوار کی زبان سے بھی

خاندانی نسب کا حال سنا ہے لہٰذا وہ احوال جس قدر کہ میرے لوحِ سینہ پر نقش ہے نوک ریزِ قلم کیا جاتا ہے:

واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطینِ توران میں ہے۔ جس زمانے میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ بیخ بنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طوائف الملوکی میں جابجا منتشر ہو گئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو بچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادرانِ حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں، ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں تھا۔ ہنوز یہ دونوں بھائی عمرِ شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاعِ سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرزمینِ ترکستان میں نورِ اسلام مثل پرتوِ خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرفِ اسلام سے فیضیاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں دوسرے کا عبد اللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی مگر رستم خاں بھائی کے غم میں بدخشاں میں نہ رہے، بخارا میں آ گئے، یہاں آکر تھوڑے عرصہ کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگانِ چشت میں جو خواجہ عبید اللہ احراری کی نسل میں تھا بیاہے گئے۔ ان کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سنِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین گزر گئے اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ یہاں سے سلسلۂ ذات ہمارا اور غالب کا جدا ہو گیا رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولد ہوئے ان کی عمر قریب بلوغ کے پہنچی تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نصر اللہ بیگ خاں اور عبد اللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں کے بھتیجے کے پاس بخارا میں آئے۔ کچھ دن بھتیجے کے شریکِ حال رہے پھر بھتیجے سے رازِ دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان جائیں اور سرکارِ شاہی میں ملازمت کریں، تم کیا صلاح دیتے ہو۔ خواجہ حاجی خاں جو کہ نوجوان سپاہی پیشہ تھے ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہو گئے کہا اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا غرض

کہ یہ چچا بھتیجے مع متعلقین کسی قدر جمعیتِ ذاتی ہمراہ لے کر بخارا سے روانہ ہوئے۔ اوّل سمرقند میں آئے وہاں ایک امیرزادہ شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چغتا سے ملاقات ہوئی اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آگیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلنے کو تیار ہوگئے اور مع اپنی زوجہ امیر النسا خانم کے ہمراہ ہو لیے۔

غرض یہ ولایتی قافلۂ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہ جہاں آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی سلطنت کا تھا۔ اور ملک کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دبا لیا تھا۔ ادھر قوم مرہٹہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیرِ سلطنت تھے مگر بدنظمی رفع نہ ہوتی تھی۔ یہ تازہ وارد ولایتی قافلہ وزیرِ اعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور ان سب کو نوکر رکھ لیا اور ان کی بسر اوقات کے لیے ایک پرگنہ پہاسو جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے جاگیر میں دیا اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کردی کہ مرہٹوں کی روک تھام کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا۔ ہنوز کوئی کارِ نمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں وزیرِ اعظم سے کسی بات پر بگاڑ ہوگیا۔ یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے آئے۔ وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصراللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا افسر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمیدانی مرزا جیون بیگ خاں کو ملی۔ نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں۔ دوسرے مرزا عبداللہ بیگ نہایت متقی عبادت گزار تھے، خود بھی گھر پر رہ گئے۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی شورش زیادہ ہوئی۔ نواب نجف خاں نے انگریزوں سے مدد چاہی کہ مرہٹوں کی سرکوبی کرو۔ انگریز یہ وقت ہی دیکھتے تھے۔ فوراً رضامند ہوگئے اور فوج لے کر گوالیار پر یورش کردی۔ خوب جنگ ہوئی مگر کچھ کام نہ نکلا۔ آخر انگریز اپنی حکمتِ عملی کو کام میں لائے۔ بخشی بھوانی شنکر فوج مرہٹہ کے بخشی کو جو اضلاعِ دہلی کا رہنے والا تھا لالچ دے کر توڑ لیا۔ فوج کو بیدل کردیا۔ فوج حملے سے باز رہی مگر ان مغلوں کی فوج مقابلہ میں ڈٹی رہی۔ انگریزی فوج کو بڑھنے نہ دیا۔ مجبور ہوکر جنرل ٹمکاف لیک کمانڈر انچیف نے مغلوں سے بھی پیام سلام جاری کیے۔ اُدھر بخشی نے بھی ان کو ردکا۔ جب مغل زادوں نے یہ صورت دیکھی کہ کل فوج بیدل ہوگئی کام نہیں دیتی۔ ہماری قلیل فوج کہاں تک مقابلہ کرے گی۔ ناحق جان دینے

سے کیا فائدہ۔ یہ سب بخشی کے پاس گئے اور گفتگو کی۔ بخشی نے کچھ توجہ نہ کی۔ پھر یہ سب راجہ کے پاس گئے۔ بمشکل وہاں تک رسائی ہوئی۔ راجہ کو نشیب و فراز سمجھائے۔ راجہ شراب میں بدمست پڑا تھا۔ جواب دیا کہ جاؤ بخشی سے کہو، وہ جو حکم دے اس کی تعمیل کرو۔ مغل یہ جواب سن کر ناراض ہوئے اور استعفا دے کر چلے آئے۔ اور فوج سے علیحدہ ہو کر اکبر آباد آ گئے۔ انگریزی افسر کو اطلاع کر دی لو ہم تو جاتے ہیں، ملک خالی ہے قبضہ کر لو۔ اب کیا تھا انگریزوں نے ملک پر قبضہ کر لیا راجہ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چار و ناچار اطاعت قبول کر لی۔ کمانڈر انچیف تاج بخشی کر کے چلا آیا۔ ان مغلوں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد نصر اللہ بیگ خاں نے دہلی میں آ کر اپنا عقد نواب احمد بخش خاں کی بہن سے کیا۔ اور پھر اکبر آباد میں آ گئے مگر ان کی زوجہ تھوڑی مدت جی کر مر گئیں۔ پھر نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد مرزا غلام حسین بیگ اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا، اس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خاں دوسرے یوسف بیگ خاں پیدا ہوئے۔ یہ دونوں اس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پاتے تھے اس اثنا میں مرزا عبداللہ بیگ پر ایک ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہو گئے، جس کا ذکر باعث طول ہے۔ لہٰذا قلم انداز کیا۔ اسی زمانے میں سرکار انگریزی کو پھر فراہمی فوج کی ضرورت ہوئی کہ جاٹ کی قوم نے بغاوت شروع کر دی تھی۔ کمانڈر انچیف نے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو بلا کر کہا کہ تمہاری شجاعت اور بہادری ہم پر خوب روشن ہے ہم تم کو فوج دیتے ہیں تم ہمارے ساتھ بھرت پور پر یورش کرو اور فیروز پور میوات کی طرف جا کر مورچہ قائم کرو اور رسد کا انتظام کرتے رہو، ہم نے سرکار الور کو بھی اطلاع دی ہے وہاں سے احمد بخش خاں وکیل راج رسد کا بندوبست کریں گے۔ چنانچہ کمانڈر انچیف نے ایک بڑے کمپو کا افسر نصر اللہ بیگ خاں کو کیا اور عہدہ رسالداری خواجہ حاجی کو دیا اور ایک پلٹن کا کمیدان مرزا جیون بیگ خاں کو کیا۔ یہ مغل حسب الحکم فیروز پور میوات آئے اور مورچہ قائم کر دیا ادھر بختاور سنگھ راجہ الور نے معرفت احمد بخش خاں اپنے وکیل کے رسد کا بندوبست کر دیا اور فوج سے بھی مدد دی۔ آخر انگریزی فوج نے اکبر آباد سے بھرت پور پر یورش شروع کی۔ ادھر نصر اللہ بیگ خاں بھرت پور کے شمالی سمت سے حملہ کرتے تھے ادھر احمد بخش خاں مغربی علاقہ کو تاراج کر رہے تھے۔ غرض سب سے پہلے شمالی سمت بھرت پور کی نصر اللہ بیگ خاں نے فتح

کرلی پھر انگریزی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ بعد فتح ہونے بھرت پور کے انگریزی فوج اکبر آباد واپس آ گئی۔ اب انگریزوں نے دیکھا کہ راجپوتانہ بالکل فتنہ و فساد سے پاک ہے۔ اس وقت جدید فوج کو موقوف کر دیا۔ اور نصر اللہ بیگ خاں کو اس فتح کی خیر خواہی کے سلسلے میں دو پرگنہ سونک سونسا اور پونہ ہانہ ہوڈل، پلول کے علاقہ میں پانچ ہزار روپے سالانہ آمدنی کے ۱۸۰۱ء میں نسلاً بعد نسلٍ جاگیر میں عطا کیے۔ اور مرزا جیون بیگ خاں کے سو روپے ماہانہ نقد پنشن مقرر کی اور اسی زمانہ یعنی ۱۸۰۵ء میں احمد بخش خاں کو بصلہ خیر خواہی پانچ لاکھ کا ملک فیروز پور جھرکہ علاقہ میوات دے کر رئیسِ خود مختار کیا اور الور کی سرکار سے بھی ایک پرگنہ لوہارو ایک لاکھ کی آمدنی کا اسی خیر خواہی میں احمد بخش خاں کو ملا تھا۔ نصر اللہ بیگ خاں چند سال زندہ رہے مگر چھوٹے بھائی کے غم میں تحلیل ہو گئے تھے۔ آخر عمر نے وفا نہ کی انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد خواجہ حاجی خاں ان کے بھتیجے یعنی راقم کے حقیقی دادا نصر اللہ بیگ خاں اپنے چچا کی اولاد اور متعلقین کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس وقت مرزا اسد اللہ خاں کی عمر نو برس کی تھی اور یوسف بیگ خاں پانچ برس کے تھے۔ ایک ایرانی اہلِ فضل و کمال ان کو تعلیم دیتا تھا۔ بعد وفات نصر اللہ بیگ خاں کے مرزا خواجہ حاجی خاں نے اپنے چچا کی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی۔ سرکار نے وہ جاگیر بدستور خواجہ حاجی خاں کے نام نسلاً بعد نسلٍ مقرر کر دی۔ اور عہد نامہ میں لکھ دیا کہ یہ جاگیر بعد نصر اللہ خاں کے سرکار سے تم کو عطا ہوئی ہے۔ تم متعلقانِ نصر اللہ بیگ خاں کی بھی پرورش اور دستگیری کرتے رہو۔ چنانچہ خواجہ حاجی خاں بطور اپنے فرزندوں کے ان کے بچوں کی پرورش کرتے رہے۔ بعد ایک مدت کے خواجہ حاجی خاں مع متعلقانِ نصر اللہ بیگ خاں دہلی میں آ کر آباد ہوئے۔ اور مرزا جیون بیگ خاں بھی دہلی میں آ گئے۔ اس عرصہ میں مرزا جیون بیگ کے ہاں تین اولادیں ہوئی تھیں۔ ایک دختر مہر النساء خانم اور دو فرزند اکبر بیگ و افضل بیگ۔ دختر کی عمر چودہ سال کی تھی اور اکبر بیگ بہن سے چھوٹے تھے اور ان سے چھوٹے افضل بیگ تھے۔ خواجہ حاجی خاں نے تھوڑے دن ٹھہر کر عقد کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ مرزا جیون بیگ خاں کی دختر سے عقد کر لیا۔ ان کے شکم سے دو فرزند اور ایک دختر تولد ہوئے۔ دختر کا خورد سالی میں انتقال ہو گیا۔ دونوں فرزند یعنی خواجہ شمس الدین خاں و خواجہ بدر الدین خاں باپ کی یادگار میں رہے۔ اس اثنا میں ایک دن نواب

احمد بخش خاں دہلی میں آئے ہوئے تھے۔ خواجہ حاجی خاں سے ملنے کو آئے اور بہنگام گفتگو یہ بیان کیا کہ بھائی تم اپنی جاگیر کے انتظام میں تکلیف پاتے ہو گے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی جاگیر میری ریاست میں شامل کردو۔ جاگیر کی آمدنی بہ آسائش پہنچا کرے گی۔ خواجہ حاجی خاں رضامند ہوگئے اور سرکار انگریزی میں درخواست دے دی، نواب احمد بخش خاں نے بھی سفارش کردی۔ وہ جاگیر فیروز پور کی ریاست کے شامل ہوگئی اور نواب احمد بخش خاں کو سرکار نے خط لکھ دیا کہ خواجہ حاجی خاں کی جاگیر تمہاری ریاست کے شامل کی جاتی ہے کس لیے کہ تمہاری سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم اس جاگیر کی پوری آمدنی خواجہ حاجی خاں اور متعلقانِ نصر اللہ بیگ خاں کے لیے دوام کو جاری رکھو اور دیتے رہو۔ چنانچہ یہ گورنمنٹ انگریزی کا خط عہد نامجات میں بنام احمد بخش خاں چھپا ہوا ہے اور یہ معاملہ ۱۸۰۵ء کا ہے۔ اس کارروائی کے بعد خواجہ مرزا حاجی خاں نے مرزا اسد اللہ خاں کا عقد الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کر دیا کس لیے کہ دونوں بھائی جوان ہو گئے تھے۔ اسد اللہ خاں کے ہاں ایک لڑکا ہوا تھا۔ مگر زندہ نہیں رہا۔ لاولد رہے۔ دوسرے بھائی یوسف بیگ خاں کا عقد خواجہ حاجی خاں نے اپنے سیادت کی رشتہ کی بہن سے کر دیا۔ جن کے بطن سے ایک دختر تولد ہوئی اور وہ صاحب اولاد ہوئی جس کی نسل اب تک حیدرآباد میں موجود ہے اور بہ اقبال مندی بسر کرتی ہے۔ اب زمانہ وہ ہے کہ خواجہ حاجی خاں کا بعارضۂ فالج بعمر شصت برس انتقال ہوگیا اور نواب احمد بخش خاں رئیسِ فیروز پور بھی راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ ان کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں بڑے صاحبزادے مسند نشین ریاست ہوئے۔ مدت تک حکمراں رہے۔ اتفاق سے شمس الدین خاں پر ایک مقدمہ قتل ریذیڈنٹ دہلی کا قائم ہوا اور مقدمہ کو بڑا طول کھنچا۔ آخر بعد تحقیقاتِ کامل سرکار انگریزی نے شمس الدین خاں کو پھانسی دیدی۔ ملک ضبط کرلیا۔ ہماری جاگیر بھی ملک کے ساتھ ضبطی میں آگئی۔ کیونکہ اسی ریاست کے شامل ہو چکی تھی۔ مرزا اسد اللہ خاں کو ان کے ہم چشموں اور احباب وغیرہ نے اغوا کرنا شروع کیا کہ یہ وقت اچھا ہے جاگیر تمہارے چچا کی ہے۔ تم وارث ہو دعویٰ کرو اور قابض ہو جاؤ۔ اسد اللہ خاں کے چھوٹے بھائی دیوانگی کی حالت میں کسی قابل نہیں تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں لوگوں کے بہکانے سے برخلاف ہوگئے۔ اور جاگیر کا استغاثہ کر دیا۔ بھتیجوں نے چچا کو سمجھایا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ جاگیر ہاتھ سے جاتی رہے گی پھر کیا ہوگا۔ مگر مرزا اسد اللہ خاں نے نہ مانا اور دعویٰ کر دیا۔ مجبور ہو کر بھتیجوں نے بھی دعویٰ پیش کیا کہ

جاگیر ہمارے باپ کو ملی ہے، ہم وارث ہیں ہم کو ملنی چاہیے۔ بغرض یہ مقدمہ کئی برس دائر رہا۔ جملہ دعویدار معاش سے پریشان رہے۔ انجام کار سرکار کی حکمتِ عملی کام آ گئی۔ عدالت نے یہ تجویز کی کہ آئندہ سے جاگیر کی آمدنی نصف متعلقانِ نصر اللہ بیگ خاں کو اور نصف متعلقانِ خواجہ حاجی خاں کو ملتی رہے گی جاگیر نہیں ملے گی۔ فریقین کو حکم سنا دیا گیا۔ مرزا اسد اللہ خاں نے بہت کوشش کی۔ کلکتہ گئے اور ولایت میں استغاثہ کیا۔ مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ جو سرکار نے تجویز کر دی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جاگیر کی نقدی حسب الحکم سرکار سے اجرا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا اسد اللہ خاں کی دونوں پھوپھیاں مر گئیں، ان کا حصہ ضبط ہو گیا۔ ان کے بعد یوسف بیگ خاں مر گئے۔ ان کا حصہ ضبط ہو گیا۔ مگر سرکار نے ان کی زوجہ کے نام گزارے کے لیے تیس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد مرزا اسد اللہ خاں بعد ایامِ مفسدہ ۱۸۵۷ء ۱۲۸۴ھ میں جاں بحق ہوئے ان کا حصہ ضبط ہوا۔ اسد اللہ خاں کے اوصاف و کمالات عالم پر ظاہر ہیں۔

مختار الدین احمد

سرِ غالبؔ در حدیثِ دیگراں

"آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا۔ اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا، خیال ہوا کہ دہلی پہنچ لوں، حضرتِ غالبؔ سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت، سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔ اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا۔ رُڑکی میں لشکر سے جا ملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جائیں گے۔ میرٹھ پہنچ کر موقع ملا۔ جی نے نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دہلی گیا، احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی۔ دو دن میں کیا کرتا، بہرحال اور دن سے ایک بار، حضرتِ غالبؔ سے دو بار ملا۔ اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیرِ فانی ہو گئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں۔ عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہوئی۔ جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے، مگر ہوش و حواس بہت درست، شوخیِ طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، بہ خلاف مولوی صدر الدین خاں کے کہ ان کے حواس میں بھی فتور کلّی ہے"۔

یہ عبارت خواجہ غلام غوث بے خبر کے ایک خط کی ہے جو انھوں نے اپنے دوست اور مرزا غالبؔ کے شاگرد سید عبد الرزاق شاکر کو لکھا تھا۔

کچھ ہی دن پہلے، صلائے عام، کا ایک پرانا پرچہ دیکھ رہا تھا (جنوری ۱۹۱۱ء) اس میں ایک مضمون، غدر سے پہلے کی دہلی، پر نگاہ پڑی، میر حیدر حسین سہیل کہتے تھے،

"اسداللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے، یہ والد کی ملاقات کو فراش خانہ آتے تھے، میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا، داڑھی کترواں تھی، بال ترشولتے تھے، کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے"

"تذکرۂ آب بقا میں" شاد لکھنوی پیر و میر کے ترجمے میں درج ہے کہ ان کی مرزا غالب سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، نہیں ان کے تاثرات معلوم نہ ہو سکے، دل میں خیال ہوا کہ کاش ان کے معاصرین تذکرہ نویس، جنھیں مرزا سے ملنے کا اتفاق ہوا ان سے ملاقات کے سلسلے میں کچھ حالات لکھ چھوڑتے، یا مرزا کے وہ تمام تلامذہ اور ملاقاتی جو ان کے یہاں حاضر باش تھے یا کبھی کبھی آیا کرتے تھے مرزا سے ملاقات کا حال لکھ جاتے تو کیسا اچھا ہوتا، اور مرزا کی روزمرہ کی زندگی اور ان کی مجموعی شخصیت کے بارے میں ہمارے پاس کتنا وافر مواد موجود ہوتا۔

اس خیال کے آتے ہی تذکروں، تاریخوں اور ان تمام مصنفین کی طرف نگاہ گئی جو غالب کے معاصرین میں تھے اور جن سے اس بات کی امید تھی کہ انھوں نے غالب کے متعلق کچھ لکھا ہو، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کامیابی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں تھیں لیکن یہ کوشش بالکل بنجر بھی ثابت نہیں ہوئی، میر صفیر کا بیان "اردو" میں دیکھا تھا لیکن تذکرۂ جلوۂ خضر تک مدتوں رسائی نہیں ہوئی، اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، طباعت کے لیے کتاب کی کاپی راقم کے خیال کے مطابق خود صفیر نے لکھی تھی، اور اپنے مطبع اردو میں شائع کی تھی۔ اس کی صرف ۲۵۰ جلدیں چھپی تھیں اور قیمت کوئی ڈیڑھ دو روپیہ عام شائقین کے علاوہ خود تلامذۂ صفیر کی تعداد کچھ کم نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب تبرک ہو کر تقسیم ہو گئی، راقم کو یہ کتاب آٹھ نو سال کی تلاش کے بعد دستیاب ہوئی، اگر نہ ملتی تو ان کے بیان پر حواشی لکھنا ممکن نہ ہوتا حضرت غوث علی شاہ قلندر اور خواجہ عزیزالدین کے بیانات کا علم تو پہلے سے تھا، یہاں مکمل بیانات ایک خاص ترتیب و تہذیب سے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

شیخ ریاض الدین کی کتاب کا ذکر غالبیات پر کام کرنے والے بزرگوں اور دوستوں کے لیے ایک نئی چیز ہے۔ نہ اس کتاب کا آج تک پتا تھا اور نہ اس مصنف کا، اس کا بیان قدیم ہے اور کافی دلچسپ ہے۔ دراصل ابتدا میں ارادہ صرف اسی بیان کو پیش کرنے کا تھا لیکن یہ داستان کچھ ایسی لذیذ تھی کہ اسے دراز تر کرنا پڑا۔

یہاں صرف بیانات پیش کرنے پر قناعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ مصنفین سے متعلق تمام ضروری

اطلاعات کے ساتھ ساتھ نقد کی روشنی میں نہایت غیر جانب دارانہ انداز میں ان کے بیانات کو اچھی طرح جانچنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

اب سب سے پہلے آپ حضرت غوث علی قلندر شاہ سے ملیے۔

(۱)

حضرت سیّد غوث علی شاہ قلندر (ولادت در قصبۂ اسنفانواں، بہار ۱۲۱۹ھ وفات در پانی پت ۱۲۹۷ھ) تیرھویں صدی ہجری میں سلسلۂ قادریہ کے بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے حالات و ملفوظات ان کے خادم طریق و وصی بالتحقیق، شاہ گل حسن نے مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ اردو اور فارسی میں جس قدر ملفوظات دیکھنے کا اتفاق ہوا بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر دلچسپ اور عام فہم کتاب کوئی اور دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ بڑے جہانیاں جہاں گشت تھے، ملفوظات میں پچاسوں ان مقامات کا نام آتا ہے جہاں جہاں کی سیاحت کی تھی، اور بیسیوں ان بزرگوں کے اسما ملتے ہیں جن سے انھیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں مولانا فضل حق: ۱۲۷۸ھ، مفتی صدر الدین ۱۲۸۵ھ، اسمٰعیل میرٹھی کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاہ صاحب دہلی گئے ہوئے تھے اور "زینت المساجد" میں فروکش تھے، ان کا قیام دہلی میں کب تھا یہ معلوم نہ ہو سکا، ورنہ مرزا سے ان کی ملاقات کے زمانے کا تعین ہو جاتا۔ صرف یہ معلوم ہے کہ ان کا قیام چھ ماہ دہلی میں رہا اور مرزا سے ہمیشہ ملاقاتیں رہیں، راقم کا قیاس ہے کہ یہ سن ستاون سے پہلے کی بات ہوگی۔ اس قیاس کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے، مرزا نے دہلی میں مختلف مکان بدلے۔ لیکن وہ ہمیشہ "بلی ماران" اور آس پاس کے "دائرے" میں ہی "قدم" رکھتے رہے۔ پھر وہ مالی پریشانیوں اور ہجومِ افکار کا زمانہ تھا اس وقت ہر دو دن کے بعد خوان سجا کر شاہ صاحب کے لیے لے جانا دیسے بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے، پھر یہ امر غور طلب ہے کہ اس وقت تک رجب علی بیگ سرور سے نہ ان کے تعلقات تھے نہ ملاقات، اسی زمانے میں مرزا کی ان سے ملاقات ہوئی اور تعلقات قائم ہوئے۔ مرزا نے ان کی کتاب "گلزار سرور" پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جو اس کتاب کے علاوہ عودِ ہندی میں بھی موجود ہے۔

غوث علی شاہ، پہلی مرتبہ خود ہی مرزا سے ملنے گئے پھر بعد میں چھ ماہ تک مرزا سے ہمیشہ ملاقات

رہی اور ان ملاقاتوں کا بڑا اچھا اثر شاہ صاحب پر پڑا ان کے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر ہے اور جس انداز میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے غالب ہی نہیں خود شاہ صاحب کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے، ورنہ ان دونوں کا کیا میل، مرزا ایک رند مشرب آدمی اور شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے اہلِ دل بزرگ۔ ان کے ملفوظات میں مرزا غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مرزا سے کتنی محبت تھی۔ کچھ شعر یہ ہیں:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے (ص۳) حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے (ص۶) رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بے خودی بے سبب نہیں غالب (ص۱۳) کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (ص۱۴) ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک (ص۱۹) اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل (ص ۲۰۴)

اب ان کی مرزا غالب سے ملاقات کا حال انھیں کی زبانی سنیئے:

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہایت حسنِ اخلاق سے ملے، لبِ فرش تک آن کر لے گئے تمام حال دریافت کیا، ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب، یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے، فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔ غزل مرزا نوشہ:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ! آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ! بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے یہ عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے، مگر وہ کب مانتے تھے، ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، مے خوار و سیاہ گنہ گار، مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں، ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا، ان کے مزاج میں کمال کی کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرورؔ مصنف 'فسانۂ عجائب' لکھنؤ سے آئے، مرزا نوشہ سے ملے، اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟ کہا چہار درویش کی، میاں رجب علی بولے، اور 'فسانۂ عجائب' کیسی ہے، مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے لاحول ولا قوۃ اس میں لطفِ زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرورؔ ہیں، جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا، بہت افسوس کیا اور کہا ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا، آئیے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں، ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرورؔ کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے 'فسانۂ عجائب' کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبیِ عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیوں کر ہو، اس کا مصنف اپنا جواب

نہیں رکھتا، غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کرکے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بلایا، اُس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی، مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المؤمن من سلم المسلمون من یدہٖ ولسانہٖ

مباش درپے آزار وہرچہ خواہی کن !! کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے، کہا کہ ہاں حضرت علیؓ مرتضیٰ سے۔

پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو! ہم نے کہا واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علیؓ مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں، ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں، کہا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔[۱]

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔

آپ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون

نہایت خوب آدمی تھے، عجز وانکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے، ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے،

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار! ساقی ومغنّی وشرابے وسرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بسجودے ونبی را بہ درودے

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آں راز سرنوشت ازل اگر زیادہ وکم باشد آں گناہِ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے اور فنِ شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔[۲]

---

[۱] تذکرۂ غوثیہ: ۹۸ – ۱۰۰

[۲] تذکرۂ غوثیہ: ۳۵۵ – ۳۵۶

شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ 'وحشت ہی سہی' والی غزل غالب نے انھیں سنائی لیکن فحوائے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے. مرزا نے کہا ہو گا کہ جو شعر آپ سنا رہے ہیں وہ تو میرا نہیں، لیکن اس زمین میں میں نے غزل لکھی ہے اور وہ یہ ہے.

'زینت المساجد' عالمگیر کی صاحب زادی زینت النسا بیگم کی یادگار ہے جس کی تعمیر دریا گنج میں ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے کرائی. تفصیل کے لیے دیکھیے 'واقعات دار الحکومت' ۱۲۷/۲، آثار الصنادید، مفتاح التواریخ بیل : ۲۹۷

رجب علی بیگ سرور کی انشا پردازی کے متعلق غالب کی رائے اس تقریظ میں ملے گی جو انھوں نے گلزارِ سرور (ترجمہ حدائق العشاق) پر لکھی تھی اور عود ہندی اور اردوئے معلیٰ دونوں میں موجود ہے. ذیل کی سطریں دیکھیے اس میں فسانۂ عجائب کا بھی ذکر آ گیا ہے.

"ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک، سرور سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہدِ معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے :

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زباں ایک تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم ایک ابرِ گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے. جس نے میرے دعویٰ کا اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے، کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کی ہیں، یہ دونوں دل فریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں، مانا کہ ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے، مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویِ پیمبری کرے، کیا عقل کی کمی ہے. یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویِ خدائی نہ کرے، کس حوصلے کا آدمی ہے" (عود ہندی طبع اول : ۱۸۱ اردوئے معلیٰ حصہ دوم طبع لاہور : ۳۵۱)

مرزا غالب نے جو دو فارسی کے قطعے، شاہ صاحب کو سنائے تھے، ان میں پہلا تو بہت مشہور ہے، اور کلیاتِ فارسی میں موجود (طبع ۱۸۶۳ء : ۱۴۱) لیکن دوسرا قطعہ نہ تو ان کے دیوان میں ہے نہ سبدچین کی اشاعتِ اول میں اور نہ غالب کی کسی اور تحریر میں اس کا ذکر ملتا ہے اس لیے بے حد اہم ہے.

(۲)

'سیرِ دہلی'، شیخ محمد ریاض الدین امجد کا مختصر سا سفرنامہ ہے جس کا دوسرا تاریخی نام 'سرورِ ریاض'
ہے جس سے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کے اعداد نکلتے ہیں۔ سرِ ورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے:
"ناثرِ عدیم المثال، ناظمِ صاحبِ کمال، گلِ سر سبدِ گلستانِ معانی، عندلیبِ چمنستانِ شیوا بیانی، معاصرین میں سر آمد
جناب شیخ محمد ریاض الدین امجد . . . " یہ ۴۶ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جو مطبع حیدری واقع آگرہ کٹرہ
حاجی محمد حسن مرحوم، باہتمام مرزا علی حسین طبع ہوئی۔ ابتدا میں مصنف کی تمہید ہے۔ آخر میں آغا حسین کی تقریظ
اور میرزا حاتم علی مہر، مرزا عنایت علی ماہ، عزیز الدین اکرم تجلّی، کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

یہ سفر بہت مختصر مدت کا تھا خود مصنف لکھتے ہیں: "پہلی محرم ۱۲۷۷ھ کی شب سے چوتھی محرم
کی صبح تک اوقات راہ میں کٹے اور چوتھی کی صبح سے چودھویں محرم کی شب تک سیر دیکھ کر دلی میں
چھٹا روزمرہ کا لکھا گیا، پھر چودھویں محرم سے سولھویں تک اور وقت راہ میں منقضی ہوا۔" سفر کی غرض و
غایت خود مسافر ہی سے سنیے:

مدت سے دل میں شوق تھا . . . کہ دلی جو متھرا سے قریب ہے، کچھ بعید نہیں، جائیے اور اس
شہر کو آنکھوں سے کہ قابلِ دید ہے، دیکھ آئیے۔ زمانۂ انقلاب سے پہلے ایک میرے چھوٹے بھائی
مولوی نیاز علی سلمہٗ بذریعہ عہدہ سب ڈپٹی انسپکٹری کے سررشتۂ تعلیم میں تھوڑے عرصہ تک بہت
لطف کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر تھے، لیکن جب موقع ہاتھ نہ لگا بے سروپا بیٹھا رہا، علاوہ اس کے
کسی نے یہ خبر سنائی کہ تبدیلی ان کی ضلع رہتک میں عمل میں آئی۔ بعد اس کے فتنہ و فساد نے سر
اٹھایا مجبور بیٹھا رہا، قدم نہ ہلایا۔ آخر کار جب آتشِ فتنہ و فساد فارغ ہو کر زمانہ اصلی وضع پر آیا، تو دل
نے بیٹھے بٹھائے وہی ولولہ اٹھایا اور اسی عرصہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے افسر نے ان کو دہلی میں
مدرس مدرسہ تعلیم المعلمین مقرر فرمایا ہے۔ الحاصل یہ ارادہ مصمم ہوا کہ اسی ۱۸۶۰ء کی تعطیل محرم میں
جاؤں اور دلی دیکھ آؤں۔ ہر چند یہ بھی خیال آیا کہ اب وہ شہر اجڑ گیا ہے، ویسا نہیں رہا، جانا بے کار
ہے، پھر سوچا کہ خدا تصور کو سلامت رکھے، ویرانے کو دیکھیں گے آبادی کا تصور کرلیں گے، آدمی کم ہو گئے

---

۷ سیرِ دہلی: ۶۰

ہوں گے، مکانات تو رہے ہوں گے۔ الغرض جب یہ مقصد مسلم ہو چکا تو پھر یہ سوجھی کہ دلی جاؤ گے کیا کیا لاؤ گے، کسے دو گے کوئی کہے گا دلی سے کچھ لائے یا ویسے ہی چلے آئے۔ تو کیا کہو گے۔ اس لیے یہ تجویز ہوئی کہ دلی میں جو کچھ دیکھوں اور سنوں وہ لکھ کر احباب کی نذر کروں، خصوصاً... مولوی روح اللہ، یہ صدر دیوان اضلاع مغربی و مشرقی کے وکیل ہیں، ان کو بطریق تحفہ اور ہدیہ کے دوں اور کہوں کہ بھئی دلی سے آئے ہیں اور یہ تحفہ لائے ہیں[۱]۔

مصنف کے متعلق زیادہ اطلاع نہ مل سکی[۲] اس سفرنامہ سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے: پورا نام ریاض الدین امجد ہے، معلوم نہیں امجد تخلص ہے یا کیا۔ غزلوں میں تو ریاض تخلص ملتا ہے ممکن ہے دونوں تخلص ہوں، اصلی وطن سندیلہ تھا، قیام متھرا میں تھا، ان کے چھوٹے بھائی مولوی نیاز علی دہلی کے سررشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر تھے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں مدرس مدرسۂ تعلیم المعلمین مقرر ہوئے کتاب کی نثر میں بڑی شوخی اور رنگینی ہے۔ خوب صورت لڑکیوں، طوائفوں، کسبیوں کا ذکر بڑے خلوص، گہرے ذوق و شوق اور بے حد دلچسپی سے کرتے ہیں، اور صفحے کا صفحہ اس ذکر انور پر خرچ کر دیتے ہیں، اس سفرنامے سے بہت اچھی روشنی اس بات پر پڑتی ہے کہ ۱۸۶۰ء میں دہلی میں مشہور طوائفیں کون سی تھیں اور ان کا رنگ ڈھنگ، طور طریقہ، پوشاک اور وضع قطع کیا تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ سفرنامہ کی ترتیب کے وقت مصنف شباب کی مستیوں سے سرشار تھا اور عبارت کی رنگینی اور شوخی کی اصل وجہ یہی ہے۔ کتاب میں رواجِ زمانہ کے مطابق اشعار بھی کثرت سے نقل کیے ہیں، یہ زیادہ تر خواجہ وزیر کے ہیں اس سے ان کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ مرزا اعظم، ناسخ، خواجہ درد، انیس، آتش، نظیر کے اشعار بھی درج ہیں۔ دہلی میں انھوں نے دس دن قیام کیا جن جن لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں حکیم عبدالرحیم، مولوی قطب الدین خاں، خواجہ علی احمد، میر بادشاہ صاحب منصف سکندر آباد، حافظ عبدالصمد، بدرالدین علی خاں مہر کن نقشی قابلِ ذکر ہیں، مفتی صدر الدین آزردہ اور ماسٹر رام چندر سے کوشش کے باوجود ملاقات نہ ہو سکی۔

---

[۱] سیر دہلی: ۳-۵

[۲] ریاض الدین امجد خلف شیخ غیاث الدین اشرف، باشندہ سندیلہ شاگرد وزیر۔ گلزار سخن دبستان تصنیف: ۱۸۲

مذکورہ بالا اصحاب کے سوا، مصنف نے جس کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے وہ مرزا غالب ہیں۔ ان کا ذکر کتاب میں تین مقامات پر آیا ہے، دو جگہ ان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور ایک جگہ صرف سرسری سا ذکر ملتا ہے[۱]

مرزا غالب سے مصنف کی دو ملاقاتیں انھیں کے گھر پر ہوئی تھیں، شعر و سخن کے چرچے رہے تھے انھیں ہنستے بولتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا اور جو کچھ محسوس کیا تھا اسے ضبطِ تحریر میں لے آئے تھے، اب تک جن لوگوں سے مرزا کی ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے، جن سے ملاقات کی تاریخیں متعین ہو سکی ہیں ان میں یہ ملاقات' اور غوث علی شاہ کے علاوہ اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں اس لیے بہت اہم ہیں۔

اب اس تمہید کے بعد خود مصنف سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سنیے:

بیان جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا۔

چھبیسویں جولائی ۱۸۶۰ء مطابق ۷ محرم ۱۲۷۷ھ کو صبح اٹھا دہلی کے قلعہ میں اکبرآبادی دروازے سے پہنچا، یہاں پہلے چھوٹے کچے پکے مکان ہندوستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہزادوں اور امیروں کے بنائے تھے ہر طرح کا تکلف تھا خوب سجا تھا لیکن بہ نظرِ صفائی ان کو سرکار ابد اقتدار نے مسمار کردیا میدان ہموار کردیا۔ وہاں

۱۔ مصنف سنہ انقلاب کے چند ہی سال بعد دہلی گئے تھے، اس وقت وہاں عمارتوں اور انسانوں پر تباہی و مفلسی کے اثرات بہت گہرے تھے۔ ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سچ جو پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے، ہر دم تازہ غم و الم ہے، اب بھی قدیم مکانوں میں مجلسیں ہوتی ہیں جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں، سو وہاں بے سروسامانی ہے، بڑی پریشانی ہے، جہاں بڑی تیاری کے علم تھے، اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو افسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے کی ہوتی ہے۔ وہی بقول جناب فیض مآب اسد اللہ خاں کے، ارے بھی مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے"۔ صفحہ ۴۴

سے کلکتہ دروازہ سے نکل کر سرن داس کے باغیچے کے نیچے ہوکر نئے پل کے اوپر پہنچا۔ بعد اس کے ہوا کھاتا ہوا بادل پورہ میں گیا، پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارات وسیع اور مکانات رفیع، دروازہ عالی شان مکلف مکان صحن کشادہ صاف گلی کوچہ شفاف موجود ہیں لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا، بیگم کے باغ، میں آیا، یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ اب کمپنی باغ، اس کا نام ہے کیف کا مقام ہے۔ ہر طرف آبشاریں رواں ہیں۔ روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے ابھی رنگت جمائی ہے، غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے درختوں کے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے، خدا بخش نے دو چار سو پھول اٹھائے ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے اور تھوڑے سے مرزا نوشہ کے مکان پر جس کا ذکر آگے آئے گا کر رہے سود ہیں چھوڑ آئے، وہاں سے خواص پورہ میں جہاں عام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے پہل یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہنچا۔ وہاں سے سرائے، میں آیا یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور ایک دروازہ ہے، اس میں خدا بخش خیاط کی دکان ہے اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں، پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہوکر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں نواب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رہتے تھے، گیا، مرزا کی ملاقات سے شرف یابِ سعادت ہوا، سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ بہ سر آمد زمان، دانان شیراز و صفاہان ہیں متعنمات روزگار نفیس الطبع قدیم الوضع۔ عالی وقار، والا تبار، ناخدائے سفینۂ سخن وری، دو یکتائے بحرِ معنی پروری آسمانِ زمین ذی کمالی، نرد بانِ بام نازک خیالی، مجموعۂ اوراقِ خردمندی، شیرازۂ اجزائے جرایدِ معنی بندی، مہرِ سپہرِ بلاغت، اسد بیشۂ فصاحت، رشکِ انوری، رو کش طالب، حق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی و حال پر فنِ شاعری میں غالب، قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبر آباد کے سارے انداز، کترے ہوئے کچھ سفید و سیاہ داڑھی کے بال، گورے چٹے خوب صورت بدرجہ کمال سلالت شموس بلاغتہ اطالعاً وغمام فصاحتہ منقاطراً، میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں، اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں، فرمایا کہ کچھ سنائیے، طبع کے جوہر دکھائیے، غرض کہ ہیچ مداں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اردو کی سنائیں۔ مرزا تے ستائشیں جس کا سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا من آید انیک شہوارِ من　　زباں دادم کہ برخیز و بتقبیلش غبارِ من

نمے آید صبا اکنوں ز مدت بر مزارِ من　　غبارِ خاطرِ او گشت شاید ایں غبارِ من

گزارا اے باغباں مارا گماں دزدی مبر ظالم　　کہ گلہا نیستند ایں لختِ دل اندر کنارِ من

بدا مادی سخن پرداز آں نو کتخدا ہستم　　عروسِ فکرِ ہر شب مے نشیند در کنارِ من

ریاض از آرزوے وصلِ آں گل چاک گردیدم
کہ ایں سودا چو آتش سوخت آخر مشتِ خارِ من

غزل اردو

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے　　کٹ گئے دن گردشِ ایام کے

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے　　دل کو سینہ کو جگر کو تھام کے

لائے ہاتھوں ہاتھ اہلِ کارواں　　ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے

ہاتھ اٹھاؤ ہمرہانِ قافلہ　　اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے

عشق جس کو ہے وہی انسان ہے　　ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے

یہ صدائے قیس تھی اور جذبِ شوق　　ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے

تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں　　ولولہ ہیں ابھرے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا اپنا شعر ملا کر چار مصرعوں کا قطعہ بنایا تھا خیر وہ بھی سنایا تھا، قطعہ:

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم　　رات کے دن کے نہ صبح و شام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا!　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اے بھئی چپ رہو یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا" عشق کیا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔ پھر ارشاد کیا کہ رنگینی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو، الحاصل دلی کے ثقات، لکھنؤ کے حضرات، ہندو مسلمان پیر و جوان بلکہ ایک لڑکا بھی خیر آباد کا رہنے والا آفت کا پرکالا، مولوی فضل حق کا نواسہ، سن میں ذرا سا، قطبی میر پڑھتا، بات بات میں لڑتا جھگڑتا، حاشیہ نشینانِ بساطِ ادب تھے، اہلِ کمال سب کے سب تھے، بعدہٗ مرزا نے تین بند مرثیہ کے، اپنی تصنیف کے سنائے، لوگ روئے پیٹے چلائے، وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دیے:

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشمِ ملایک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا — کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا — ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے، وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے، ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔[1]

---

[1] سیر دہلی: ۲۱-۲۰

دوبارہ حاضر ہونا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں

ریکم اگست ۱۸۶۰ء (۱۲ محرم ۱۲۷۷ھ) صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسداللہ خاں غالب کے مکان پر آیا، انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا، فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کوتوال اور دیگر عمّال کے جلسوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں، جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے، زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا دو چار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں، زمانِ ماتقدم میں کیسے کیسے فاضلِ اجل، شاعرِ بے بدل اس شہر میں ہوتے گئے اور اس خلوت کدے میں سوتے گئے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے، اس شہر میں دائم رکھے۔[1]

اب ریاض کے اس بیان کے متعلق بعض باتیں مختصر طور پر عرض کی جاتی ہیں:

بیگم کا باغ، اس کا نام 'ملکہ کا باغ' بھی ہے، یہ باغ جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں بنوایا تھا جو چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے، بعد میں میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں کی عمارتوں میں آ گئے تھے اس لیے لوگ اسے 'کمپنی باغ' بھی کہتے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے واقعاتِ دار الحکومت دہلی ۲/ ۲۲۹

شیر افگن کی بارہ دری، محلہ بلی ماران میں متعدد گلیاں اور حویلیاں ہیں داہنی طرف گلی سوداگران، حویلی حسام الدین حیدر، یہیں سے قاسم جان کی گلی کو راستہ جاتا ہے، بارہ دری شیر افگن بھی یہیں پر ہے، بارہ دری اب نہیں رہی۔ گلی اسی نام سے مشہور ہے۔ واقعات ۲/ ۲۴۰ بلی ماران کے لیے دیکھیے: ۲۳۸

ریاض کی فارسی و اردو کی غزلیں نہایت معمولی ہیں اور اگر واقعی غالب نے ستایش کیا ہو، پوری غزلیں سن بھی لیں تو ان کی مہمان نوازی اور ان کے اعلیٰ اخلاق کی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے۔

---

[1] سیر دہلی: ۵۶

غالب کے ایک ہمعاصر

خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی
۱۸۲۱ء — ۱۹۱۵ء

مرزا آخر عمر میں اپنے مصرع "عشق نے غالب نکما کر دیا" میں عشق کو "ضعف" سے بدل دیا کرتے تھے، برکات حسن مارہروی کے ساتھ بھی ایسا ہی قصہ ہوا تھا، دیکھیے جلوۂ خضر ۲/۶۰

مرثیہ کے یہ تین بند صفیر بلگرامی نے بھی درج کیے ہیں لیکن ریاض کو تقدم زمانی حاصل ہے اس سے اس مرثیہ کا زمانۂ تصنیف ۱۸۶۰ء یا اس سے پہلے ہو جاتا ہے، دبیر کی مرثیہ نگاری اور اس کی فوقیت کا اظہار یہاں بھی موجود ہے، حیرت ہے کہ وہ انیس کا نام نہیں لیتے۔ صفیر کے سامنے اگر وہ دبیر کا نام لیتے ہیں تو اس کے کچھ وجوہ اور بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہاں تو کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

۱۸۶۰ء تک مرزا کا دیوانِ فارسی صرف ایک ہی بار شائع ہوا تھا، اس لیے مرزا نے ریاض احمد کو اپنے دیوانِ فارسی کی پہلی اشاعت (۱۸۴۵ء) دکھائی ہوگی۔

میر طالب علی، خیر الدین حسین، منور علی شاہ، مرزا تقی بیگ، ان اصحاب کا اس وقت کچھ پتا نہ چل سکا۔

(۳)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی (ولادت کشمیر ۱۸۲۱ء ۔ وفات لکھنؤ ۱۹۱۵ء) لکھنؤ کے آخر دور کے بڑے باکمال شاعر تھے۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا لیکن صغر سنی ہی میں لکھنؤ آ کر بس گئے تھے یہیں تحصیل علم کیا، ۱۸۸۴ء میں کیننگ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور عمر بھر فارسی زبان و ادب سے گہری دلچسپی لیتے رہے۔

کلیاتِ فارسی طبع ہو چکا ہے اور تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ تلامذہ میں عشرت لکھنوی، ریاض حسن خاں خیال، مرزا ہادی رسوا، قاضی خلیل الرحمٰن خلیل بریلوی، عارف لکھنوی اور مرزا کاظم حسین محشر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خواجہ نے کشمیر کا سفر متعدد بار کیا تھا، ایک سفر کے دوران میں دہلی میں مرزا غالب سے ملاقات بھی کی تھی، اس سفر کی ٹھیک تاریخ نہیں معلوم، صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ۱۲۸۰ھ میں دہلی سے گزرے تھے، اس سفر کی یادگار ایک نہایت خوب صورت فارسی مثنوی "گل گشت کشمیر" کے علاوہ اردو نثر کی ایک عبارت بھی ہے جس میں انھوں نے دہلی ٹھہر کر مرزا غالب سے ملاقات کا حال درج کیا ہے۔

ان کے کلیات مطبوعہ میں فارسی مکاتیب تو ہیں لیکن کوئی اردو تحریر موجود نہیں ہیں ان کی کسی

کتاب کا بھی علم نہ ہو سکا جس میں یہ تحریر پائی جاتی ہو، اردوئے معلیٰ طبع لاہور ۱۹۳۰ء کی ابتدا میں مرزا غالب پر ایک مضمون رسالہ 'ادیب' سے نقل کیا گیا ہے اس میں یہ تحریر خواجہ عبدالرؤف عشرت کے حوالے سے نقل کی گئی ہے جو 'تذکرۂ آبِ بقا' یا عشرت کی کسی اور کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذری۔ 'ادیب' سے مراد غالباً وہ رسالہ ہے جو نوبت رائے نظر الہ آباد سے شائع کرتے تھے، علی گڑھ میں اس رسالے کی تمام جلدیں موجود نہیں، اس لیے اس کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں' آثارِ غالب' اور' غالب' میں اس ملاقات کا حال درج ہے لیکن حوالہ درج نہیں، اکرام صاحب کے یہاں مختصر اندراج ہے اور جناب مہر کے یہاں مختصر تر۔ یہاں خواجہ عزیز کا مکمل بیان درج کیا جا رہا ہے۔ گو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں کچھ اور عبارت بھی تھی جو اردوئے معلیٰ طبع لاہور میں حذف کردی گئی ہے۔

کلیاتِ عزیز کے مقدمے میں نواب صدر یار جنگ نے بھی مرزا سے اس ملاقات کا بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے، وہاں ایک دو سطریں ایسی ہیں جو کہیں درج نہیں، راقم نے یہ سطریں توسین کے اندر متن میں داخل کردی ہیں۔

خواجہ عزیز فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دہلی اتر پڑے، سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے اڈ گرڑے سے بگھی منگوائی، ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسنِ اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کرلینی چاہیے۔ فوراً بلّی ماروں کا محلہ دریافت کرکے جانے کو مستعد ہوئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرادوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو بگمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف

دیکھا، ہم نے سلام کیا، بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا: آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو، نام و نشان پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی۔ جب ہم نے نام و پتا لکھا تو کہا: مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ، ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے، بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کیے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہ مصراست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم

زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

(غالب کو 'مہ مصر' کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا 'ماہِ کنعان' سنا ہے، 'مہِ مصر' نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے لہ! عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا اور حد سے زیادہ تعریف کی۔ پھر آدمی سے کہا 'کھانا لاؤ'، ہم سمجھے بہ خیالِ مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں، لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے، اسباب بندھا ہوا رکھا ہوا ہے، پابہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے: آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے، بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں، سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے، اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک تشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدارِ خوراک پر کیوں کر بسر کرتے ہیں!

لہ قوسین کی عبارت مقدمۂ کلیاتِ عزیز سے ماخوذ ہے: ص ۵

اب اس بیان سے متعلق بعض قابلِ ذکر باتیں پیش کی جاتی ہیں :

مکان : خواجہ عزیز الدین، مرزا سے ۱۲۸۰ھ میں ملے تھے۔ انھوں نے مرزا کے مکان کے متعلق کچھ ایسی باتیں نہیں لکھیں جن سے یہ یقین ہو سکے کہ وہ اس وقت کس مکان میں تھے اور اس کا کیا حال تھا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ اواخر ۱۸۵۱ء یا اوائل ۱۸۵۲ء میں ٹپیالے والے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں چلے آئے تھے، اس کے بعد جولائی ۱۸۶۰ء تک وہ اسی میں رہے۔ غلام اللہ خاں نے جب یہ حویلی خرید لی تو مرزا کو یہ خالی کرنی پڑی، بلّی ماران میں کوئی رہنے کے لائق مکان نہ ملا، ناچار لوہارو والوں نے کروڑ مل والی حویلی رہنے کو دی، مرزا ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء کی دوپہر کو وہاں منتقل ہو گئے۔ وہ اس مکان میں کب تک رہے اور پھر کب وہ کسی اور مکان میں منتقل ہو گئے یہ معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ جولائی ۱۸۶۴ء میں کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو چکے تھے جس کی چھت برسات میں ایسی چھلنی تھی کہ ابر دو گھنٹے برستی تھی تو چھت چار گھنٹے، جس مکان میں مرزا کے آخری دن گزرے ہیں اور جس میں ان کا انتقال ہوا اس میں بالاخانے کے ایک کمرے میں وہ رہا کرتے تھے، خواجہ عزیز الدین بالاخانے کا ذکر نہیں کرتے بلکہ پھاٹک سے متصل ایک کمرے کو ان کی نشیم گاہ بتاتے ہیں، یہ اگر درست ہے تو یہ وہی مکان ہونا چاہیے، جس میں کروڑ امل کی حویلی کے بعد وہ ۱۸۶۰ء کو آئے تھے اور جہاں وہ ۱۸۶۴ء تک رہے، خواجہ عزیز الدین، مرزا غالب سے ۱۸۶۳ء میں ملے تھے۔

عمر : مرزا کی عمر کے متعلق خواجہ کا اندازہ صحیح نہیں، ممکن ہے ضعف اور امراض کے ہجوم کی وجہ سے وہ اسّی بیاسی سال کے ہی معلوم ہوتے ہوں لیکن اُس وقت ان کی اصلی عمر ۶۸ سال بحساب سنین قمری اور ۶۶ سال بحساب عیسوی تھی۔

مصرعِ مصرع : دیوان کی روایت ''در حسرت خوابے'' ہے، یہ غزل مرزا کو سنائی گئی تھی اور انھیں پسند بھی آئی تھی اس لیے یہاں پوری غزل درج کی جاتی ہے۔

بہ مصراست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم	زلیخا کو رشد در حسرت خوابے کہ من دارم
نہ گلچیں را بہ داماننت و نے در جام ساقی را	بیادِ دوست در دل آتش و آبے کہ من دارم
دلست ایں کاں حریفِ آتشِ عشقت بود ورنہ	جہنم برنتابد تب و تابے کہ من دارم
بہ تیغِ کند عشقم تاقیامت نیم جاں خواہد!	دریغا کار با بے درد قصابے کہ من دارم

غالب کے ایک شاگرد

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

۱۲۴۹ھ —— ۱۳۰۷ھ

بوداف نہ کز خواب باشد راحتِ مردم — بہ تلخی مرگ بہتر از شکر خوابے کہ من دارم

ببیں آں روے وموے وخط وخال وچشم وابرو را — بہ دل دادن چہ پرسی زاسبابے کہ من دارم

عزیز از ہفت بحر ونہ صدف بیروں لؤلو نایش — بہ عالم جستجوے در نایابے کہ من دارم

(کلیاتِ عزیز، مطبع نامی لکھنؤ ۱۹۳۱ء)

(ماہ مصر) ماہ کنعاں کے مرادف ہے اور لغات میں موجود ہے، مرزا کے تامل پر حیرت ہے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ سند میں کون سا شعر عزیز نے پیش کیا تھا۔ صائب کا یہ شعر راقم کو بہت دنوں سے یاد ہے لیکن اس وقت جو مطبوعہ دیوان سرسری طور پر دیکھا تو اس میں نہ ملا:

زصد ہزار پسر ہم چو (ماہِ مصر) یکے — چناں شود کہ چراغِ پدر کند روشن

(۴)

میر صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ - ۱۳۰۰ھ) کے بزرگوں کا وطن بلگرام تھا، خود ان کی ولادت مارہرہ میں ہوئی لیکن پانچ ہی برس کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

مولد ومسکن، وطن ہے اے صفیر! — تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام!

ابھی کم عمر ہی تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پندرہ برس کے تھے کہ اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر بلگرامی کے شاگرد ہوئے، بیس برس کے تھے کہ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے، پچیس سال کی عمر میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور دبیر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ ۱۲۸۰ھ کے لگ بھگ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس رشتے سے کہ صاحبِ عالم مارہروی (۱۲۱۱ - ۱۲۸۸) ان کے نانا تھے وہ غالب کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں ایک لمبا سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور ڈھائی ماہ تک ان کے پاس مقیم رہے، اپنی ملاقات کا حال انھوں نے بڑی تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں جلوۂ خضر میں لکھا ہے۔

راقم کے علم میں مرزا غالب کے کسی ملنے والے نے اس شرح وبسط سے ان سے اپنی ملاقات کا حال نہیں لکھا اس لیے یہ بیان بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسے آج سے ۳۰ سال پہلے قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ 'اردو' میں شائع کیا تھا لیکن اب وہاں تک رسائی بھی عام نہیں انھوں نے اس تحریر کی

تمہید میں لکھا تھا:

"میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محلِ نظر معلوم ہوتی ہیں:

میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور اَنیس کا ذکر تک نہ کرنا، میرزا کی غذا کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے، شاعروں کے مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بہ لفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوئے معلیٰ میں موجود ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہٖ انھیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا، اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں، وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں۔ مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار، میر صفیر مرحوم، ناسخ کے شاگرد تھے لیکن ناسخ سے جو عقیدت انھیں تھی وہ ان سے براہِ راست مستفید ہونے والوں میں بھی کسی کو نہ ہوگی، جب وہ ناسخ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو قصیدے کا انداز آ جاتا ہے اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں جو دراصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔"

اب آپ صفیر بلگرامی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

مولف کا دہلی جانا اور حضرتِ غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیضیاب ہوا۔ وہاں حضرتِ غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا، نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربطِ خاص تھا۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش کی کہ حضرتِ غالب کا شاگرد ہوں۔ اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا، حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی، ابرِ گہربار، اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرتِ غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے

بوستان خیال کو اردو کرکے اس کی جگہ ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا استہار بہ ذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اس وقت سے خط وکتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا، اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا، آموں کا موسم تھا، نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیے، میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دہلی پہنچا، شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا، حضرت برآمدے میں بیٹھے کلّی پی رہے تھے۔ ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے، دیکھ کر بشاش ہو گئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا، پوچھا یہ کون ہیں، عرض کیا صفیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجہ، بولے ذرا ٹھہر جائیے، یہ کہہ کر یہ وقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے، اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے، گرمی کے دن تھے، صفر کا مہینہ تھا، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کاکلی دار، نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سُرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی، آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ نقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آکر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں، اتنے میں نواب ضیاء الدین خاں بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے ان سے ملایا، وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کرتا پہنے خلط دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، جریب ہاتھ میں۔ بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے واسطے، آخر زینے کے پاس آئے، اور چھت پر چلے، ہم لوگ

بھی ساتھ تھے، اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رخ بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، یعنی گرمی کے دن میں دہلی کی گرمی اور تمازتِ آفتاب سے درو دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے، الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آئے، اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجایش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں۔ اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا، میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہنچے، وہ مکان عالیشان تھا، ایک بڑا پھاٹک بر سرِ سڑک۔ جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ، سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے۔ الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے انھیں رفیق کے ساتھ آئے، معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ خوش بو تخمی آم تھے، میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم ایسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا، بہت مزیدار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا۔ بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا، صورت حرام نظر آئے بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے اس سے کہیں بہتر پائے، پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ کسے کہ یہ پرائے ہیں آم،

اور سب آم منگا لیے۔ آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی۔ قریب مغرب میں فرود گاہ پر آیا، صبح کو نیضِ صفیر رسالہ تذکیر و تانیث

کالے کر گیا، حضرت نے خود اسے لے کر دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا۔ اور بہت تعریف کی، اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور عودِ ہندی میں بھی موجود ہے۔

ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی۔ ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے، میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے۔ ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کوئیں سے پانی لے آؤ۔ میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا۔ فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا۔ میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، منہم، اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا، منّا؛

ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا، فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا وہ بند یہ ہیں[1]۔ پھر فرمایا واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہو گا اور میرے کھانے کے لیے معمولی قورمہ، پلاؤ، تلیہ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہو گا، آج آپ میرا کھانا دیکھیے۔ الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا، اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روے کے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ پھر وہ رفیق آ کر بیٹھے، انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے، پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربہ لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک

---

[1] یہ تین بند بعینہٖ وہی ہیں جو ریاض الدین امجد کے سیر دہلی میں مندرج ہیں اور راقم نے اس مضمون کی ابتدا میں نقل کیے ہیں۔ اس لیے یہاں حذف کر دیے گئے۔

طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوش جاں فرمائے اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا، بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے، اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا، اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھالیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کرسکتا، بہت دیر تک باتیں ہوائیں۔

ایک دن مولوی صدرالدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے۔ ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی میں بھیجا، وہ میلا بھی قابلِ دید تھا، دہلی کا میلا کیا کہنا ہے، میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے... تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دہلی عجیب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو۔ خواجہ امان صاحب مترجم بوستانِ خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان 'خم خانہ' میں چھپی ہیں۔

غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اٹھائے، آخر رمضان ۱۲۸۲ھ تک آرہے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے۔ مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھتا ہوں ایک وضع اول کی دوسری وضع ثانی کی۔[۱]

---

[۱] جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۲۱۔ ۲۲۸

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے۔ حضرت نے دیکھ کر فرمایا ہاں، اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے، اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے نہ بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا، اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا۔ وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا، فرمایا، میاں، اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا، اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے؛ ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اس کے کلام میں مزا پاتا ہے، ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی، اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا، میں نے بھی ایک طرزِ خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا، اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے، میاں، جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا، جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت جھکی تھی مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی۔ اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہبری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا۔ کچھ ایسی دقت نہ ہوئی۔ پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی ہر ایک کی نئی طرز ہو گئی۔ مگر ناسخ کے کلام نے دہلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا، اور قاعدے کے

ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا. دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا. یہاں تک کہ شعرا نے اِدھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام برآوردہ تھے، میں اور مومن خاں اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیوں کہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی. زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں، مگر مومن خاں نے خیال کیا، پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی، غرض ہم دونوں دہلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اسی رنگ میں رہے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی. وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے ناچار اپنی جودتِ طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے. ایک تمھارے تجر صاحب فرماتے ہیں:

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے جو رد ھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے. اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے. میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جانے اور باندھنے سے کام ہے. عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق. ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے.

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں. میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا، وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے. دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے. مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، من جملہ ان کے ایک شعر یہ بھی پڑھا.

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں
لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر بیٹھے تھے، آپس میں کہنے لگے، بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے، جناب پھر پڑھیے گا میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے، حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آجائے اس کو باندھ دینا چاہیے کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا، ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے کسی کو گورا پسند ہے کسی کو سانولا، معشوقِ من است آں کہ بہ نزدیکِ تو زشت است' کا حال ہے۔

یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے۔ مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعددہ ہیں، فغانی ایک شیوہ خاص کا مبداء ہوا، خیالہائے نازک اور معانیِ بلند کا، اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی، اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پرواز دیا، صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی، اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی تحریر نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا، فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا، جس کو بظاہر عشقِ مجازی کا زینۂ آخر، اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا اور جو مجازی میں پورے نکلے، وہ بھی قدم بہ قدم ٹھہرے، اور ان کے بعد کے درجہ والے سب حقیقی میں ہیں۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ز یک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ورائے شاعری، چیزے دگر ہست

وہ 'چیزے دگر' حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیش تر یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں۔ میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں۔ فرمایا، ہاں پڑھو۔

ناسخ:

یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار، مہرباں! کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے
مر چلا ہوں امیدواری میں ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے رقیبوں نے نہ مہلت دی کہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوے دوست

سجدۂ شکرِ خدا ایما میں کیے جاتا ہوں! قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض[1]"

حواشی

(۱) میر صفیر کی دوسری شادی، سید غلام حسین قدر بلگرامی (۱۲۴۹ھ۔ ۱۳۰۱ھ) کے خاندان میں ہوئی تھی (جلوۂ خضر ۲/۲۲۷) خود قدر کی شادی صفیر کے خاندان میں کوانتھ ضلع آرہ بہار میں ہوئی تھی۔

(۲) کلب حسین نادر سے مرزا غالب کے بھی تعلقات تھے۔ دیوانِ قصائد چھپ چکا ہے اور اس میں مرزا کا لکھا ہوا دیباچہ بھی ہے جو عودِ ہندی: ۱۸۵، اور اردوئے معلّٰی: ۳۵۲ میں بھی موجود ہے۔ صفیر نے نادر سے اپنی ملاقات کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے۔ یہاں اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے:

"جب میں ۱۲۸۱ھ میں اپنی شادی کے لیے بلگرام گیا اور وہاں سے بہ شوقِ زیارت نانا صاحب مارہرہ روانہ ہوا، رستہ میں فرخ آباد پڑا۔ فتح گڑھ میں جہاں چھاؤنی سرکاری ہے، جنابِ نادر نے ایک بنگلہ بنوایا تھا، اس میں رہتے تھے، مجھے معلوم تھا مخصوص ان کی ملاقات کے لیے، میں نے فرخ آباد میں قیام کیا۔ اور ایک بجے دن کو جنابِ نادر کی ملاقات کو گیا، دو بجے پہنچا۔ باغ میں بنگلہ خوش نما تھا، غلام گردش میں دو چار کرسیاں بچھی تھیں اور کمروں کے دروازے بند تھے، ہم اور ایک عزیز ہمارے ساتھ تھے بیٹھ گئے۔ حیران تھے کہ کیوں کر اطلاع کی جائے ایک نوکر ان کا ادھر سے گزرا، اس سے کہا گیا کہ ڈپٹی صاحب سے جا کر اطلاع کرو کہ ایک صاحب پورب سے آپ کی ملاقات کو آئے ہیں وہ گیا، اور آیا اور کہا کہ پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں۔

لطیفہ: میں نے سنا تھا کہ ڈپٹی صاحب شاعر کے نام سے فوراً چلے آتے ہیں میں

---

[1] جلوۂ خضر جلد اول: ۲۴۰ در ذکر مومن

نے کہا جاکر کہہ کہ ایک ' شاعر آئے ہیں، اس نے جاکر کہا کہ ایک سائل آئے ہیں، جواب ملا کہ اس وقت جائیے کل صبح کو آئیے گا. جب مجھ سے آکر یہ جواب کہا گیا میں نہایت متحیر ہوا کہ ڈپوٹی صاحب کو سنا کیسا تھا اور جواب کیسا پایا، پھر میں نے پوچھا تم نے کیا کہا تھا اس نے کہا، میں نے کہا تھا سائل آئے ہیں. میں یہ سن کر ہنسا اور کہا یہی سبب ہے جو ڈپوٹی صاحب نے ایسا جواب دیا جاکر کہو شعر، غزل کہتے ہیں، اور یہ فقرہ میں نے ذرا زور سے کہا، شاید کمرے میں جو باہر سے بند تھا سن رہے تھے، ایک بار جس جگہ میں بیٹھا تھا وہ دروازہ کھلا اور جناب نادر نہائے ہوئے بال پوچھتے سامنے آئے، اور بولے، کون حضرت ہیں؟

میں سامنے گیا اور بولا میرا نام سید فرزند احمد تخلّص صفیر ہے، بلگرام وطن ہے، آرہ مسکن ہے حضرت صاحب عالم کا حقیقی نواسا ہوں اور میر محمد عسکری صاحب کا پرپوتا یہ سنتے ہی بے تابانہ ننگے پاؤں باہر نکل آئے اور مجھ سے بغل گیر ہوکر اندر لے گئے. اندر جاکر دیکھا تو کمرہ بہت آراستہ تھا، سامنے ایک مسہری لگی تھی جس کا پردہ رنگین گوٹے پٹے سے آراستہ، چھت کا پنکھا رنگین چھتا لگا، ایک طرف مسند لگی تکیے رکھے، سب رنگین، اور خود جناب نادر کی عمر پچاس سے متجاوز تھی، مسند پر بیٹھے اور مجھے بھی بٹھایا، حال پوچھا، میں نے سب کیفیت اپنے آنے کی بیان کی. معذرت کرنے لگے کہ معاف کیجیے گا، اس نادان نے سائل کہا اس لیے میں نے صبح کو آنے کو کہدیا تھا، مجھ سے پوچھا، آپ کس کے شاگرد ہیں. میں نے کہا جناب سحر لکھنوی کا. فرمایا غدر میں وہ بلگرام ہوتے ہوئے یہاں بھی آئے تھے اور یہاں سے جاکر راہ میں انتقال کیا، پھر انھوں نے مجھ سے شعر پڑھنے کو کہا، اتنے میں جناب امداد حسین صفیر فرخ آبادی شاگرد جناب نجر علیہ الرحمتہ بھی تشریف لائے اور چند خوش مذاق بھی موجود ہوئے، چند شعر سر دیوان ' صفیر بلبل ' کے پڑھے سب نے بہت تعریف کی اور خود جنابِ نادر نے اپنی بیاض نکالی اور اپنی غزلیں پڑھنا شروع کیا.[۸]

۳۰۔ صفیر و غالب کی خط و کتابت کے لیے دیکھا جائے راقم کا مضمون: ' غالب کے خطوط بہ نام صفیر

۸۔ جلوۂ خضر: ۲/ ۲۶۰

بگرامی، مطبوعہ نگارلہ شاہ عالم بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے نام اردوئے معلّٰی میں غالب کے دو خط بھی موجود ہیں۔ دیوان فارسی وارد و حبیب گنج میں موجود ہے اور راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔

(۴) تفضل حسین خاں کی کتاب راقم کی نظر سے گزری ہے، اس وقت پیش نظر نہیں جہاں تک یاد آتا ہے اس میں صفیر کا مخمس موجود نہیں اور نہ قاضی محمد عمر کی 'حدیث قدسی' میں موجود ہے، جس میں اس عہد کے تقریباً ہر ممتاز شاعر کا مخمس پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بدرالدین علی خاں مہر کن نقشی ۱۰۱، رحیم بیگ (سرودھنہ) رحیم ۱۱۶، فتح الملک رمز ۱۲۰، غالب ۱۱۴، مجروح ۹۲، مہر ۹۰، عیش ۶۲ مومن ۹۱۔ مولوی ظہور علی دہلوی ۵۶، بہادر شاہ ۵۵ کے علاوہ اور بیسیوں کے مخمس موجود ہیں صفیر کا مخمس ان کی اپنی کتاب 'میلاد معصومین' : ۳۲ (عزیزی پریس آگرہ) میں موجود ہے۔

(۵) آموں کی تعداد میں صفیر سے بھول ہوئی ہے، ایک ٹوکرے میں (ٹوکرا بھی ایسا جو مارہرے سے دہلی تک بہ آسانی آجائے) چھوٹے چھوٹے بھی دو ہزار آم نہیں آسکتے اور غالب تو آم کے شیدائی تھے اور مارہرہ کے آموں کی دعوت انھیں برسوں سے دی جا رہی تھی، اس لیے ظاہر ہے صفیر بہت اچھے آم لائے ہوں گے، اچھے اور بڑے دانے دو ہزار کی تعداد میں ایک ٹوکرے میں کیوں کر سما سکتے ہیں۔

(۶) صفیر، مرزا غالب کی ثقل سماعت پر زیادہ زور نہیں دیتے۔ لکھتے ہیں: کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا، اس سے دو سال پہلے خواجہ عزیز الدین ان سے ملنے آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سننا ان کے لیے بالکل ممکن نہ تھا، لکھ کر باتیں ہوتی تھیں۔ ان دونوں کے بیانات میں بڑا تضاد ہے۔

(۷) صفیر، غالب کے ان رفیق کا نام نہیں بتاتے جو غالب کے ساتھ تھے اور جو نواب ضیاء الدین رخشاں کے مکان میں صفیر اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا لوا کر آئے تھے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے ساتھ مستقل طور پر رہتے تھے، ان کے ملازموں کے علاوہ ہمیں کسی اور شخص کی اطلاع نہیں ہے

لہ بابت جولائی ۱۹۵۱ء

جس کا قیام ان کے ساتھ ہو۔ نصفیر نے بتایا کہ ان کے ساتھ پانچ آدمی اور کون تھے، شاہ عالم کا تو ذکر آیا ہے، بقیہ چار کون تھے۔

(۸) صفیر کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کا رسالہ تذکیر و تانیث غالب نے ان کے سامنے دو چار دنوں میں دیکھ ڈالا اس کی تصحیح کی اور پھر تقریظ لکھ کر دے دی، ایک دوسری جگہ بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے: "رسالہ فیض صفیر، جو تانیث و تذکیر کے باب میں ہے، حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جا بہ جا اصلاح دی۔ اور اس کی تقریظ لکھی"[1]

لیکن غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط سے جسے راقم نے دریافت کیا ہے، اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے دیباچہ بعد کو لکھ کر مارہرہ روانہ کر دیا تھا وہاں سے صفیر کو عظیم آباد بھیجا گیا' مرزا صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

"دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لخت جگر و نور بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں، ہات رعشہ دار، آنکھیں ضعیف البصر، حواس مسلوب ہیں؛ قصہ مختصر من کل الوجوہ وہاں غالب مغلوب ہیں"[2]

ظاہرا، صفیر بلگرامی کی جس کتاب کے دیباچے کا عظیم آباد روانہ ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد "فیض صفیر" ہی ہے اس لیے کہ صفیر کی کسی اور کتاب پر غالب کا دیباچہ یا تقریظ موجود نہیں۔

صفیر نے دیباچہ عظیم آباد کے بجائے مارہرہ اس لیے بھیجا ہوگا کہ یہ سید احمد حسن بلگرامی کی فرمائش سے غالب نے لکھا تھا وہ چاہتے ہوں گے احمد حسن اور صاحب عالم وغیرہ دیکھ لیں پھر پٹنہ کے مطبع میں جائے۔

(۹) میر صفیر کے ماموں، شاہ عالم مارہروی سنی المذہب تھے، اور میر صفیر شیعی، اسی لیے کسی کے استفسار کے جواب میں مرزا نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "منہم" (یہ ان لوگوں میں سے ہیں) اور میر صفیر کی طرف اشارہ کر کے کہا "منا" (ہم لوگوں میں سے ہیں)

---

[1] جلوۂ خضر ۲/۲۲۶

[2] علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹، نوادر غالب

(۱۰) مرثیہ کے ذکر میں اگر غالب انیس کا ذکر نہ کر کے صرف دبیر کا ذکر کرتے ہیں تو جائے تعجب نہیں، مقام حیرت یہ ہے کہ وہ ریاض الدین امجد سے بھی مرثیہ کے ذکر میں صرف دبیر کا نام لیتے ہیں، کیا واقعی ایسا تو نہیں ہے کہ مرزا دبیر کو انیس پر بدرجہا فضیلت دیتے ہوں کہ موخرالذکر کے ذکر کو بھی ضروری نہیں سمجھتے ہوں۔

(۱۱) مرزا غالب کی غذا کا بیان صفیر کی غلط فہمی پر مبنی ہے، اوسط درجے کے تندرست آدمی بھی آدھ سیر گھی اٹھا کر پی نہیں جاتے، چہ جائے کہ غالب بہ ایں ضعف و اضمحلال، وہ "آب گوشت"، ہوگا جس کی طرف غالب نے اپنے خطوں میں اور حالی نے یادگار غالب میں اشارہ کیا ہے۔ "آب گوشت کے روغن کو جو پیالے کی سطح پر تھا اسے وہ گھی سمجھ گئے اور یہ لکھ دیا کہ آدھا پیالہ گھی کا پی گئے۔

(۱۲) ترجمۂ نیر رخشاں، کے لیے ملاحظہ ہو، جلوۂ خضر ۱/ ۲۲۸

(۱۳) اکبر شاہ ثانی کے منجھلے لڑکے مرزا جہانگیر ایک مقدمہ میں ماخوذ تھے، بادشاہ بیگم نے منت مانی کہ وہ چھوٹ کر آئیں تو خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی، کامیابی کے بعد یہ تقریب بڑے دھوم دھام سے منائی گئی۔ قطب میں کئی دن تک میلا رہا، پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اس میں خوب صورتی کے لیے ایک پنکھا بھی لٹکا دیا، ظفر ولی عہد نے، پنکھا، کہہ کر گزرانا:

لو ز الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کے جھلک   کہ وہ ظاہر میں ملک اور ہے باطن میں ملک
اس تماشے کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک   آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشید فلک

یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

بادشاہ کو میلا بہت پسند آیا، دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے تیسرے ع میں یہ میلا ہوا کرے تو کیسا ہو، مسلمان درگاہ پر پنکھا چڑھائیں ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔ دلی والے راضی ہوئے، اور پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی، اسے پھول والوں کی سیر کہیے یا پنکھے کا میلا، بات ایک ہی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے مضامین فرحت حصہ دوم۔ ص ۵۔

مرزا غالب ایک خط میں خواجہ بے خبر کو لکھتے ہیں: اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے، "پھول والوں" کا کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے۔ امرائے شہر سے لے کر اہل حرفہ تک قطب

جاتے ہیں، دو تین ہفتے تک وہیں رہتے ہیں۔ مسلمان و ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دو کانیں بند پڑی رہتی ہیں، بھائی ضیاء الدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے ہوئے ہیں، اب دیوان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمت گار، اردوئے معلیٰ: ۲۱۳۔

صفیر کا بیان کہ پنکھے کے میلے کے لیے مرزا نے انھیں دس روپے دے کر عزیزوں کی طرح بگھی پر بھیجا، محل نظر ہے۔ اس عہد میں روپیہ کی قیمت بہت زیادہ تھی، بہادر شاہ جو شہنشاہ ہند تھے وہ تو اپنے استاد، ذوق کو ابتدا میں چار روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے۔

(۱۴) جامع مسجد کے تبرکات اور اس کی تفصیل کے لیے، واقعاتِ دار الحکومت دہلی ۲/۱۱۰ دیکھا جائے تبرکات وہاں اب بھی ہیں۔

(۱۵) صفیر نے غالب کی جو دو غزلیں نقل کی ہیں، ان کے پہلے شعر یہ ہیں

صفائی حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　　تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

(۱۶) غالب نے اردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جز کا لکھا تھا، یہ محل نظر ہے[۱] صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ خود غالب کی تحریروں میں اس کا پتا نہیں، اس قدر اہم موضوع پر ان کی کوئی تصنیف ہوتی تو اور معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے، اور وہ کتاب اس قدر جلد فنا بھی نہ ہو جاتی۔ خود غالب کے اس خط سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے وہ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں: "جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس عرب و شمال کا باوجو

---

[۱] تو اعد فارسی میں مرزا کی ایک تصنیف 'نکات و رقعات غالب' ضرور موجود ہے جسے میجر فلر کے پاس بھیجا گیا تھا، اس نے مدارس میں پڑھانے کے لیے ۵۰۰ نسخے اس کے مطبع سراجی میں ۱۸۶۰ء میں چھپوائے تھے، اس کے اہتمام میں منشی پیارے لال دہلوی بہت رہے تھے۔ اس نایاب کتاب کا ایک نسخہ جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے پاس موجود ہے اور انھوں نے عنایت فرما کے اس کی ایک نقل ہمیں عنایت فرمائی ہے۔

عدم تعارف خط مجھ کو آیا، کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا، اس کا جواب لکھ بھیجا، نظم و نثر اردو طلب کی تھی مجموعۂ نظم نہ بھیج دیا، نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔[1]

ایم کیمسن اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات ممالک مغربی و شمالی ہند تھے، وہ ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں تاریخ ادب اردو کی بھی آ جاتی، انھوں نے غالب اور صاحب عالم مارہروی کو اس سلسلے میں خطوط لکھے تھے اور اوروں کو بھی ضرور لکھے ہوں گے۔ غالب نے اس کا جواب لکھ بھیجا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ غالب کسی کتاب کی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے، "خط مجھ کو آیا... اس کا جواب لکھ بھیجا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کے جواب میں ایک خط لکھ دیا ممکن ہے وہ خط کچھ طویل ہو، لیکن پوری کتاب لکھی ہو یہ قرین قیاس نہیں۔ مجموعۂ نظم سے مراد دیوان غالب جس کے کئی ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے تھے، مجموعۂ نثر یعنی عود ہندی جس کی ترتیب و اشاعت کا کام خواجہ غلام غوث کر رہے تھے۔ یہ مجموعہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپ کر شائع ہوا، لیکن مرزا، ابتدا میں یہی سمجھتے رہے کہ اس کی طباعت کا کام الہ آباد ہی میں ہو رہا ہے جہاں غلام غوث مقیم تھے۔ صفیر کا یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ ڈائرکٹر نے صاحب عالم کو، زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیجنے کو کہا تھا۔ کیمسن کا اصل خط احسن مارہروی مرحوم کے اخلاف کے یہاں میں نے دیکھا ہے اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ اس خط سے بعض اور امور پر روشنی پڑتی ہے اور قیاس غالب ہے کہ مرزا غالب کو بھی اسی خط کی نقل بھیجی گئی ہوگی اس لیے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے۔

---

[1] عود ہندی: ص، طبع اول۔ غالب کے اس خط کے جواب میں بے خبر نے جو خط انھیں لکھا تھا اس کی مندرجہ ذیل سطریں قابل ذکر ہیں: منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضی جناب کیمسن صاحب بہادر کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعۂ نثر کا ذکر لکھا ہے اسے میں مرتب کرتا ہوں عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لیے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے گی اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔

عنایت فرمائے دوستاں سید صاحب عالم معانی وار مارہرہ زادعنایتکم

بعد اظہار شوق و مراسم عرفیہ کے واضح رائے محبت پیرائے ہو، چوں کہ اکثر اوصاف جمیلہ و محامد نبیلہ آپ کی در باب واقفیت تاریخ و زبان دانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد ایں جانب کے ہوئے۔ اس لیے آپ کو براہ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ہے کہ اگر آپ کو حال مفصل ایجاد زبان اردو معلوم ہو تو اس کی کیفیت مجھے تحریر کر کے مجھے ممنون کیجیے اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبان مسطور مطلوب ہے کہ جس سے حال زمانہ ابتدائے اجرائے اردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبان مذکور داخل نوشت و خواند اہل ہند ہوئی معلوم ہو جائے، اور کن کن استادوں نے زبان مذکور میں ابتدا شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کیے اور کتنے محاورات قدیمہ اب تبدیل ہو گئے، اور اس تبدیلی سے اس زبان میں آیا شستگی و رفتگی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ہوا، اگر کلام ان اساتذہ قدیم کے یاد ہوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گذرے ہوں تو بطور مشتے نمونہ از خروارے، سلک تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب حاوی ان امور کی مل سکے اس کو بطور رعایت یا بہ قیمت جیسا مناسب ہو عنایت فرمائیں۔ نہایت موجب احسان مندی ہوگا، اور چوں کہ جس کتاب کا ایں جانب کو قصد تالیف ہے اور جس کی امداد کے لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اس میں حال شعرا وغیرہ کا بقید نام و مسکن و زمانہ لکھا جائے گا، آپ جو کیفیت ان استادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امور صدر کا ضرور لحاظ رہے۔ فقط

المرقوم ۶ جون ۱۸۶۶ء کیمپ کوہ مصوری۔ رقیمۃ الشوق ایم کیمسن

نہ صاحب عالم کے جواب کا جسے بقول صفیر انھوں نے مرتب کیا تھا پتا ہے اور نہ مرزا غالب کے اس خط کا جو انھوں نے کیمسن کے جواب میں لکھا تھا کچھ علم ہو سکا ہے۔

(۱۰) ناسخ کے سلسلے میں وہ خط بھی قابل مطالعہ ہے جو انھوں نے عبد الغفور نساخ کو لکھا تھا: ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں، شیخ امام بخش ناسخ، طرز جدید کے موجد اور پرانے ناہموار راہوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بہ صیغہ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں تم دانائے رموز اردو زبان ہو سرمایہ نازش قلم رو ہندوستان ہو۔[۱]

۱۔ عود ہندی: ۱۲۵ خطوط غالب: ۲۱۲ بھی دیکھا جائے۔

(۱۸) بحر کا شعر دیوان میں یوں ہے:

نہاتا ہے وہ 'گل' 'کوثر' میں کپڑے حور دھوتی ہے　　کسی کا ہم نے یہ عالم نہیں دیکھا نہانے میں

(دیوان بحر مطبوعہ مصطفائی لکھنؤ ۱۲۸۵ھ ص ۲۵۴) یہاں 'منہ' کی جگہ 'گل' اور 'دریا' کی جگہ 'کوثر' ہے۔

(۱۹) یہ حیرت میں ڈال دینے والی بات ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف طرزوں کے متعلق صفیر نے جو کچھ غالب کی زبان سے سنایا ہے وہ پوری عبارت چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں موجود ہے۔ ابتدائی سطریں صفیر نے حذف کر دی ہیں۔ یہ اس لیے ضروری تھیں کہ اس سے پورے خط کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے: "میرا قیاس ہے اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے متاع و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس دفعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں حضرت صاحب، ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل، واقف سے لے کر بیدل، ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے کہ رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و ثنائی ...... الخ" یہاں سے آخر تک کی عبارت دونوں میں مشترک ہے، مثال میں جو اشعار درج کیے ہیں وہ وہی ہیں جو خط میں ہیں، جو اشعار یاد نہیں ہیں وہ یہاں بھی فراموش ہیں۔ راقم کی رائے میں اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جلوۂ خضر کی اس عبارت کے لکھتے وقت غالب کا اصل خط مارہرہ والا موجود ہو گا ساری عبارت وہیں سے نقل کی، اس وقت انھیں اس کا خیال نہ ہو گا کہ یہ خط غالب کے مجموعۂ خطوط میں شائع ہو چکا ہے یا شائع ہو سکتا ہے، انھوں نے سوچا ہو گا کہ مارہرہ آ کر اس خط کو کون دیکھے گا۔ یہ خط عود ہندی اور اردوئے معلّٰی دونوں میں موجود ہے۔ ہے، کی یائے تحتانی لکھ چکا تھا کہ جلوۂ خضر کی ایک عبارت پر نظر پڑی:

"جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارہرہ ہو کر دہلی گیا تھا وہ انشا مرتب ہو رہے تھے چنانچہ اس مسودہ کی نقل میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب تو وہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چونکہ بعد اس کے میرے پاس آرہ اور پٹنہ میں آئے تھے وہ اس ترتیب میں شامل ہونے سے رہ گئے مگر ایک تقریظ رسالہ رشحاتِ صفیر المشہور بہ فیض صفیر میں چھپی ہے، تشریح اس نثر اردو کی انشاء اللہ تذکرہ نثر اردو میں کی جائے گی"

[۱۰ جون ۱۹۵۲ء]

حمید احمد خاں

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک[+]

چاندنی چوک سے مڑ کر بلّی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جائیے تو شمسی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے، کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے، کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر دائیں ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے، اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور رہی ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لیے بخارا سے روانہ ہوئے۔ منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر کھڑے ہم آپ باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے

حصے میں ضرور آئی پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا. خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے. لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا. قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے. لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اس عام رہ گزر پر آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دل چسپی ہے. ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی. اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے' اور وہ لفظ ہے : غالب

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے، کسی نہ کسی منزل میں، تعلق رہا ہے. غالب کا اصل وطن آگرہ تھا. لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دلی آ رہے تھے. اس تبدیلیِ وطن کے بعد وہ پچپن برس تک دلی میں رہے. اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لیے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رہے، لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر اس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ہے. اسی گلی میں شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا، دس پندرہ برس بعد جب غالب خود بالک دولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلی دروازے کی راہ سے، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے. اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا.

سامنے کے سرے پر جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے

ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لیے دلّی چلے آئے، تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے چند آخری سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے، گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آئیے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کرلیں۔ دلی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لیے ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں۔

گلی میں چند قدم چلیے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جاکر دیکھیے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہوگیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً پشت مسجد کا سہارا لیے ہوئے ہیں، ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی، یہ صحن، اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فردگاہ کی یادگاریں ہیں۔ وہ بالاخانہ جو، خود ان کے بقول، ان کے "اٹھنے بیٹھنے سوتے جاگتے، جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف، غالب کے دیوان خانے کے تقریباً سامنے ہندوستانی دواخانے سے متصل غالب کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانۂ دوا سازی ہے لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو۔

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا، ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلّو بند کرکے ٹکٹ لگا دیتے تھے دوپہر کو قصے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان

والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے
تھوڑی دیر اس سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں
میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے۔ سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں
زیادہ تر اس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے
پڑے رہتے تھے۔ غالب بالاخانے سے نیچے اترتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت
اور سہولت کے ساتھ جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر
جو لال کھار وے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے۔ چلمیں آگے پڑی رہتیں
ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات
کرتا تو سننے کے لیے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے
آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابندِ وضع بزرگ پالکی میں تشریف
لاتے، پالکی دروازے کے سامنے رکی، وہ بزرگ نیچے اترے۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر
اپنے خاص لہجے میں لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے کہا: آئیے آئیے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا
جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقہ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز
کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے
یہاں وقت کس طرح گزرتا، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصے قضیے طے ہوتے۔ ان تفصیلات پر بظاہر
ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر لوہارو والوں کی اس
حویلی میں جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی
کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی غالب کے
دوست نواب ضیاء الدین نیر درخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو
نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست
حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا
بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے

دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کیے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت نوّے برس کے لگ بھگ تھی، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے۔ میں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے اُن سے سنا۔ اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی کے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لیے قابلِ قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال[1] ہو گیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے[2]۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی، وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی۔

---

[1] ۱۸۵۲ء میں

[2] غالب کے اردو خطوں میں اس کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں: "لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں (باقی اگلے صفحہ پر)

عارف جان — قاسم جان

نواب احمد بخش خاں — مرزا الہٰی بخش خاں معروف — نواب فیض اللہ بیگ خاں

امراؤ بیگم — مرزا غالب

نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں

بنیادی بیگم — نواب غلام حسین خاں مسرور

مرزا زین العابدین خاں عارف

نواب معظم زمانی بیگم — مرزا باقر علی خاں کامل — مرزا حسین علی خاں شاداں

عرف بگا بیگم
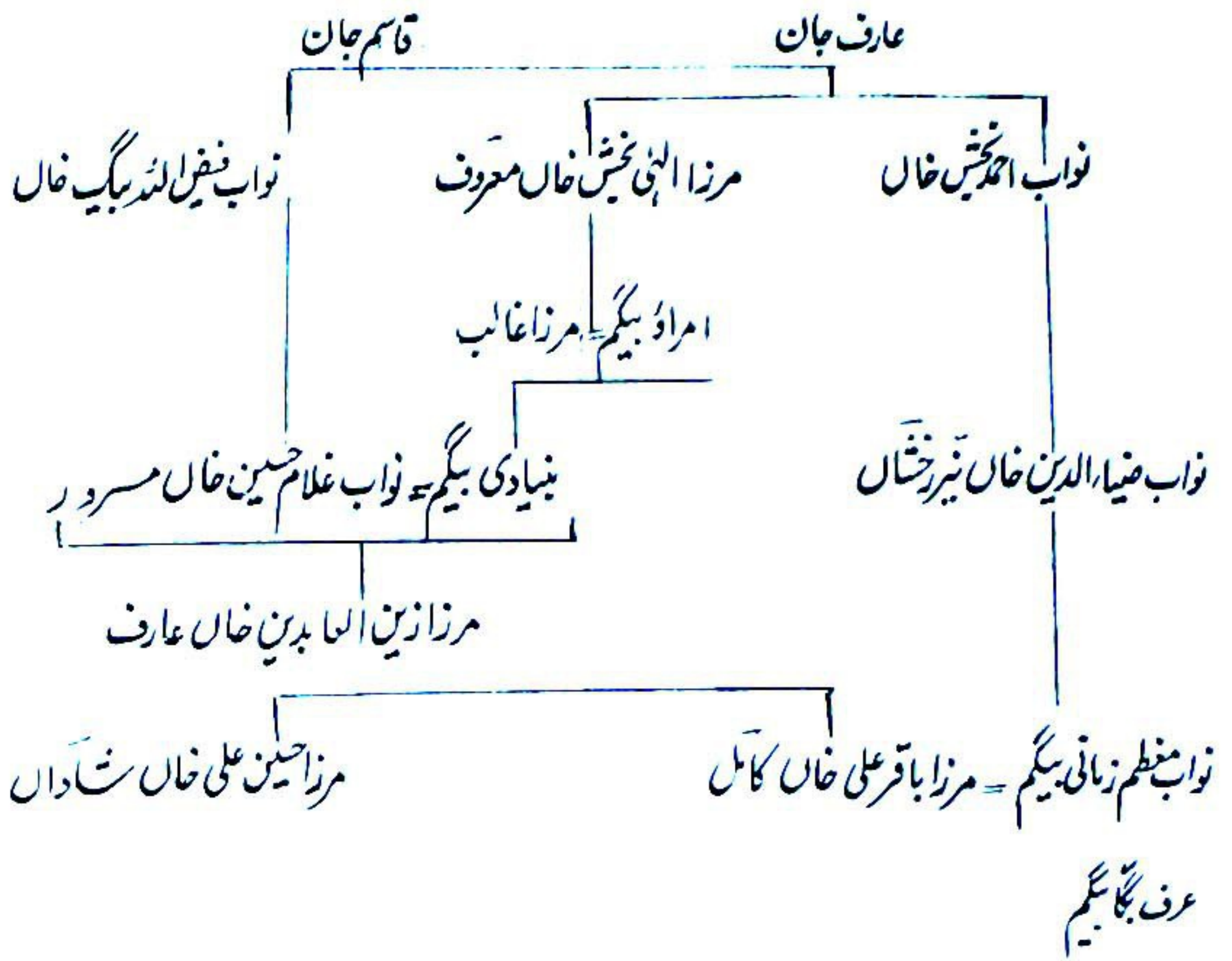
(بقیہ حاشیہ) اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں یہ ہم روزہ خوار ہیں وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے: کھلونا منگادو میں بھی بجار جاؤں گا!

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے حسین علی آکر پڑھ لے" انھوں نے جواب دیا "دادا جان آتا ہوں" اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے لوا دیجیے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا "بھئی انھوں نے ایک ٹھیکرا دے مارا۔ دیدے بیس روپے"۔

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "ابے لمڈو! یہاں آؤ" ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا! منہ سے کھا، میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں"۔

اس میں شک نہیں کہ بگاّ بیگم صاحبہ نے غالبؔ کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لیے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے قیافے سے بات کی ہے، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سج سج چلتے تھے، بڈھے تھے، اسّی برس کی عمر تھی" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصّہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہو گا کہ بگاّ بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالبؔ طبیعت کے لحاظ سے آزاد تھے، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[۱]۔ چنانچہ غالبؔ بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے"! مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلافِ مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگاّ بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں "بیٹی تو تو بچہ ہے، بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے!"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگاّ بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ "مرزا صاحب (پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے) ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے ہیں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دونوں بھی اسی تخت پر نکڑ پر ہو بیٹھے جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: "واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگاّ بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے مینہ بہت

---

[۱] اس ضمن میں "یادگارِ غالب" کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

برسنے لگا۔ پوتوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاؤتکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا (بہو)، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں: "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے! اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی" بس اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کیڑے پتنگے کا موسم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی!"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔ نوکروں میں کلو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے۔ کلو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہوئیں ہیں یا بڑھیاں۔ ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیاہ انھوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔

کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے۔ دال مربہ۔ پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن۔[1] جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والوں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ ددا تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال بیسن کی کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے

---

[1] بگا بیگم صاحبہ نے قدرتاً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔

سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے، کہنے لگے "ددا، یہاں تو آؤ" ددا گئیں تو ان سے کہا "پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکالی ہوتی"۔ ددا نے جواب دیا: "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں"۔ بولے: "اوہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے "بیوی سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سنتی"! اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی برا نہ مانو ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے لوگ مجھ کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں، بھونتے ہیں، تلتے ہیں، ابالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا: "دور ہو، نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!"

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے؟ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس اُن کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے"۔ جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے"۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا، جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے"۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سُرس کی گلی میں مارے گئے تھے[1]۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے"۔ میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنایا ہے۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے"۔

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا۔ بگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں بس مر ہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ جنیدو[2] بیگم کو بہت چاہتے

• فتح دہلی کے بعد ۱۸۵۷ء [1]۔ [2] بگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھیں۔ مرزا غالب انھیں محبت سے جیون بیگ کہتے تھے ان کی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی۔

تھے. پوچھا "جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ" احمد بیگ ان کے خادم تھے، انھیں بھیجا، مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا" یہ کہہ کر لیٹ گئے. کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے. اسی حالت میں ان کا دم نکلا"

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھوپر کی پھانک تھیں. جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں "اے اللہ تو کب بلائے گا" ایک روز میں نے پوچھا، پھپھی جان آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے لگیں: "بیٹی تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے."

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں

(نظرِ ثانی: ۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء)

مالک رام

میرزا غالبؔ

حالات۔ عادات۔ خصائل

میرزا غالب سے ان کی زندگی میں مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے خاندان کے ان سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیزداری بھی تھی۔ میرے والد ان کے ہم عمر اور ہجولی تھے اور وہ دونوں بچپن میں شیخ معظم کے مکتب میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے لیکن میری ملاقات ان سے بہت بعد کو ہوئی۔ میرزا صاحب میری پیدائش سے بہت پہلے ہی ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں آگرہ چھوڑ کر دلی چلے آئے تھے۔ پھر اگرچہ اس کے بعد بھی وہ دو ایک مرتبہ آگرہ تشریف لے گئے لیکن صغر سنی کے سبب میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔

ایک زمانے کے بعد جب کاروبار کے سلسلے میں پہلی بار میرا دلی آنا ہوا تو چلتے وقت والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ میرزا غالبؔ کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا اور ان سے میرا سلام شوق عرض کرنا۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء سے پانچ چھ برس پہلے کا ذکر ہے گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میرزا صاحب ان دنوں لال کنواں میں حضرت مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب کی حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ان پر جوا خانہ قائم کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ تین مہینے قید خانے میں رہے تھے۔ جب قید سے

دہلی کا قید خانہ جہاں غالب ۱۸۴۷ء میں تین ماہ قید رہے

نقشہ کابلی دروازہ دہلی قدیم و جیلخانہ و مہندیان
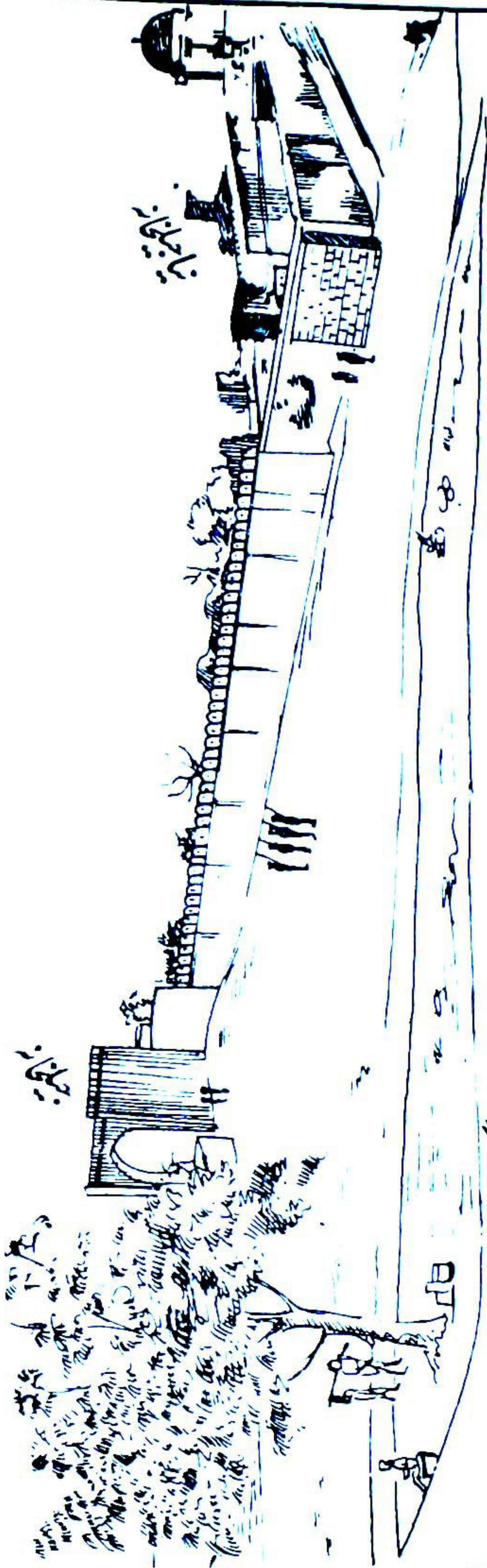
عمل مرزا شاہرخ بیگ

رہا ہوئے تو میاں کالے صاحب انھیں اپنے ہاں لوا لے گئے۔ میرزا صاحب نے بہت کہا کہ حضرت! آپ میرے بزرگ اور مخدوم ہیں، میں آزاد منش آدمی ہوں، میرے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف و پریشانی ہوگی لیکن کالے صاحب ایک نہ مانے اور مجبوراً میرزا صاحب کو ان کے مکان پر قیام کرنا پڑا۔ یہیں وہ مشہور لطیفہ پیش آیا تھا کہ ایک دن ایک صاحب مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور مبارک باد دی کہ شکر ہے خدا کے فضل سے آپ قید سے آزاد ہوئے۔ اس پر میرزا بولے: "کون بھڑوا آزاد ہوا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں۔" میرزا غالب اس مکان میں ستمبر ۱۸۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۲ء تک رہے تھے۔

یہاں دلّی میں کام سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ جلد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن یہی فکر تھی کہ بن ملے واپس گیا تو قبلہ والد صاحب ناراض ہوں گے۔ اس لیے جوں توں کر کے واپسی سے ایک دن پہلے مغرب کے قریب ان کے مکان پر گیا اور اطلاع کرائی۔ ملازم مجھے اندر لے گیا۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ ایک تخت بھی قریب میں پڑا تھا میرزا صاحب ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ بعض اور اصحاب دوسرے مونڈھوں پر تشریف رکھتے تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں صاحب خانہ حضرت میاں کالے صاحب تھے۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ اور بھی دو تین صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے پہنچ کر آداب عرض کیا اور چپکے سے ایک طرف تخت کے سرے پر بیٹھ گیا۔

میرزا صاحب نے بے تکلفی کے لہجے میں فرمایا: آئیے آئیے، تشریف رکھیے، فرمائیے۔

میں نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا کہ میں اکبرآباد کا رہنے والا ہوں اور صرف سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اس پر وہ مسکرا کر کچھ کہنے کو تھے کہ نہ معلوم حاضرین میں سے کس نے کوئی سوال کر دیا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ، ڈاڑھی صفاچٹ، نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا تھا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ سرخ و سفید رنگ، جس میں چمپئی

دبک تھی، سر پر لمبے لمبے پٹھے۔ قلموں پر لٹکتے ہوئے بال۔ سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر
کشیدے کا کام تھا۔ بدن پر تنزیب کا انگرکھا۔ اور نیچے ایک بر کا سفید پاجامہ۔ پاؤں میں
گیتھلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی سٹک تھی اور کش لگا رہے تھے۔ نواب شیفتہ چالیس سے
اوپر تھے۔ ان کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ بات بہت ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔
نواب ضیاء الدین خاں ان دنوں جوان تھے، تیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ بارعب کتابی
چہرہ۔ بھری بھری ڈاڑھی۔ شربتی آنکھیں۔ حکیم احسن اللہ خاں اور مولانا نصیر الدین دونوں بزرگ
بڑی نورانی شکلوں کے مالک تھے۔ حالانکہ حاضرین میں سب وجیہہ اور باوقار لوگ موجود تھے۔ پھر بھی
اس سارے مجمع میں میرزا صاحب کی شخصیت خاص طور پر نمایاں تھی۔

دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ شعر و شاعری، کچھ تصوف، کچھ قلعے کے لطیفے۔
غرض کہ دو گھڑی بڑے لطف کی صحبت رہی۔ اس کے بعد احباب رخصت ہونے لگے۔
میں اس انتظار میں رہا کہ ذرا فراغت اور یکسوئی ہو لے تو اپنا تعارف کراؤں۔ چنانچہ جب
سب صاحب رخصت ہو لیے تو میں نے جرأت کر کے گذارش کی کہ میں خاص طور پر حاضر خدمت ہوا
ہوں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں تو بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک حضرت والد صاحب
قبلہ اور آگرے کے دوسرے احباب کا حال پوچھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کہاں اترے ہو اور
کب تک قیام ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایک عزیز کے یہاں پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا ہوں اور
انشاء اللہ کل واپس جا رہا ہوں۔ فرمایا کیا معنی کہ وہ عزیز ہیں اور میں دشمن تھا۔ میاں تمھیں اپنے
اور ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم! تمھارے والد تو میرے لنگوٹیے یار ہیں ہم مکتب
میں، کریا اور لامقیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ دن بھر ایک ساتھ کھیلتے تھے اور ایک کو دوسرے کے
بغیر چین نہیں آتا تھا۔ تمھارے والد پڑھنے لکھنے اور آموختے میں بہت ہوشیار تھے۔ آہ!
کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میں نے باقاعدہ طور پر مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا، دس بارہ برس کی عمر سے
پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خان صاحب یعنی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان (میرزا صاحب کے
نانا جان) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی بہت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا۔ لیکن بے کار۔

معلوم نہیں میرے سر پر آوارگی کا بھوت، کچھ اس بُری طرح سوار تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منہ نہیں کیا۔ (پھر مسکرا کے کہنے لگے) اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی تک تک سے:

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے کچھ اپنے آپ سے۔ جب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا۔ بھائی کو سلامِ شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے اور یہ شعر سُنانا۔

مالذتِ دیدار، زپیغام گرفتیم
مشتاقِ تو، دیدن زشنیدن نشناسد

اور ہاں دیکھو، اب کے جو دلّی آنا ہو تو میرے ہی پاس ٹھہرنا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

(۲)

دوسری بار میں نو دس مہینے بعد ۱۸۵۳ء کی گرمیوں میں دلّی آیا اور جرأت کر کے میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں پہلے سے دے رکھی تھی وہ ان دنوں بلی ماراں میں حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں کرایہ پر رہتے تھے۔ یہ مکان بہت ہوادار اور مشرق سے کھلا تھا، اس لیے دریا کی طرف سے خوب ہوا آتی تھی۔ محل سرا اور دیوان خانہ بھی الگ الگ تھے لیکن اس میں ایک نقص تھا کہ کمرے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

میں پہنچا تو میرزا صاحب بڑی گرم جوشی سے ملے اور فرمایا کہ میں بہت خوش ہوا کہ تم نے اسے اپنا گھر سمجھا۔ تمھارے والد میرے بھائی ہیں اور تم میرے بھتیجے اور بیٹے ہو۔ پھر فرمایا دیکھو کوئی شرم اور تکلف کی بات نہیں۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو بے جھجک مانگ لینا۔ اگر کھانے میں کوئی خاص چیز

پکوانے کی خواہش ہو تو دوا سے کہہ دو، پک جائے گی۔ اب آؤ تمھیں تمھاری چچی کے پاس لے چلوں۔

اس کے بعد وہ مجھے اندر بیگم صاحبہ کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ باقر علی خاں اس وقت پانچ چھ برس کا تھا اور حسین علی خاں ڈھائی تین کا۔ باقر علی خاں مستقل طور پر رہتا تو اپنی دادی اماں کے پاس تھا لیکن اس وقت یونہی کھیلتے کھیلتے ادھر آ نکلا تھا، حسین علی خاں البتہ میرزا صاحب ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرزا صاحب نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور رشتے میں بھتیجے ہوتے ہیں، کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔ تمھارے پاس ٹھیریں گے ذرا خیال رکھنا، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں آداب بجالایا۔ بیگم صاحبہ نے دعا دی اور فرمایا "بیٹا، تکلف کا خانہ خراب، اگر تمھیں کوئی چیز چاہیے تو کسی نوکر سے کہہ دو، یا مجھے اندر کہلوا بھیجو۔ مہیا ہو جائے گی، اور اگر شرماشرمی میں رہے تو تم جانو۔"

میں شام کے قریب پہنچا تھا اور سفر کی تکان کے سبب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اشتہا بھی نہیں تھی۔ میرزا صاحب نے کالے خاں (عرف کلو) داروغہ سے کہا کہ دیکھو آپ کا پلنگ باہر کے دالان میں لگا دو اور پانی کا لوٹا پاس رکھ دو تاکہ صبح مانگنے کی ضرورت نہ رہے میں تھکا ماندہ تو تھا ہی بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔

اگلی صبح کو اٹھا تو دیکھا کہ میرزا صاحب مجھ سے پہلے جاگ چکے ہیں اور ابھی ابھی دیوان خانے میں آکر بیٹھے ہیں۔ میں بھی ہاتھ منہ دھو آداب عرض کر کے ان کے پاس جا بیٹھا۔ دیوان خانے میں سفید چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ ایک طرف قرینے سے لگن میں پیچوان رکھا تھا۔ قالین کے کنارے، چاندی کا پاندان پڑا تھا۔ کمرے میں تین چار پیتل کے اگالدان دان تھے اور ایک کونے میں بڑی سی چلمچی دھری تھی۔ تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا کیوں بھائی حقہ کر دگے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے۔ کہنے لگے۔ بادام اور شہد ہے کوئی حرام چیز نہیں بات یہ ہے کہ ایک زمانے سے مجھے

گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ چنانچہ گرمی ہو کر جاڑا۔ روزانہ صبح نہار منہ۔ یہ ٹھنڈائی پیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لیے مصری خاص طور سے بیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور بہت خشک اور میٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔

ہم ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ڈاکیہ آیا اور تین چار خط دے گیا۔ میرزا صاحب چھاپنے اور خط پڑھنے لگے۔ ان میں ایک خط غالباً منشی ہرگوپال تفتہ کا تھا جنھیں وہ مرزا تفتہ کہتے تھے۔ دوسرا بریلی والے قاضی عبدالجمیل جنون کا تھا۔ دو اور خط اب یاد نہیں رہا کہ کن کے تھے۔ جب خط پڑھ چکے تو کہنے لگے کہ لو صاحب میں نواب قلعہ جاتا ہوں دس بجے تک واپسی ہوگی۔ تم چاہو یہاں بیٹھو، چاہو گھومنے چلے جاؤ۔ قلعے سے واپسی پر کھانا کھائیں گے، اگر جاؤ تو اس وقت تک گھر پر پہنچ جانا۔

میں سیر کے لیے باہر جانے ہی والا تھا کہ میرزا صاحب کے دو تین ملاقاتی آ گئے۔ ایک تو میر افضل علی عرف میرن صاحب کے خسر بزرگوار جناب مولوی مظہر علی صاحب تھے۔ دوسرے پنڈت شیوجی رام مونس میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ ان کا نوجوان بیٹا بال مکند بھی تھا مولوی مظہر علی تو اسی محلے میں میرزا قربان بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ میرزا صاحب کے مسکن اور ان کے گھر کے درمیان ایک میر خیرات علی کی حویلی تھی۔ پنڈت شیوجی رام کا مکان کچھ فاصلے پر کوچہ پنڈت میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میر احمد حسین میکش آ گئے۔ یہ بھی میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان اصحاب کو دیکھ کر کلو حقہ تازہ کر کے لے آیا۔ سب نے کلو سے کہا کہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں ہمارا آداب کہلوا دو۔ کلو نے آواز دے کر وفادار لونڈی کو بلوایا، معلوم ہوا کہ وہ باہر سودا سلف لینے گئی ہے۔ نیاز علی چھوکرے نے جھانک کے پوچھا: کیوں داروغہ جی کیا چاہیے۔ کلو نے جواب دیا: ابے، بیگم صاحبہ سے یہ کہو کہ مولوی مظہر علی صاحب اور میر احمد حسین اور پنڈت شیوجی رام آداب کہتے ہیں اور پنڈت جی کا صاحب زادہ بال مکند بندگی عرض کرتا ہے

جب اندر اطلاع ..... ہوئی تو دّدا گلوریوں کی تھالی لیے آئی اور کہا کہ بیگم صاحبہ سب کو آداب اور بال مکند کو دعا کہتی ہیں اور یہ کہا ہے کہ میرزا صاحب اب آئے جاتے ہیں۔ آپ بیٹھیے اور حقّہ پیجیے اور پان کھائیے۔ ہم سب بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ دس بجے کے لگ بھگ میرزا صاحب قلعے سے لوٹے۔ سب نے کھڑے ہو کر آداب عرض کیا وہ صدر میں مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور لگے ایک ایک سے گھر بار کا حال پوچھنے۔ مولوی صاحب سے پوچھا کہ میرن صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ پنڈت شیوجی رام سے دریافت کیا کہ کہو تمھارے محلے میں اب موسمی بخار کا کیا حال ہے۔ بال مکند سے اس کی تعلیم کے متعلق سوال کیا۔ میکش سے اس کے گھر والوں کا پوچھا کہ شہر میں ہیں یا اپنے میکے بہرام پور گئے ہوئے ہیں۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے، اس پر دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور میں، دونوں بچّوں کے ساتھ اندر گئے۔

اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت بھتّہ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ روے کا حلوہ تھا دو تین قسم کا سرکے اور تیل کا اچار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت اور ترکاری سب میں چنے کی دال پڑی ہے۔ دلمے میں کم اور گوشت اور ترکاری میں زیادہ۔ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دو ایک نوالے کریلے کے ساتھ کھائے تھوڑے سے چاول بھی چکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔

جب کھانا کھا چکے تو اٹھے۔ ددّا پانی کا لوٹا اور بیسن کی کٹوری لے آئی۔ آپ نے بیسن سے ہاتھ دھو لیے کہ ہاتھوں کی چکناہٹ چھوٹ جائے۔ باہر دیوان خانے میں آئے اور پلنگ پہ دراز ہو گئے۔ فرمایا نیند نہیں آتی۔ لیکن لیٹنے کی عادت ہے۔ جب تک دو ایک گھنٹے آرام نہ کر لوں نہ کھانا ہی ہضم ہوتا ہے نہ کوئی کام ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے حقے کے کش لگاتے رہے۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ پوچھنے لگے کہو کہیں سیر کو گئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نکلنے ہی والا تھا کہ یہ دوست آگئے اور ان کی خاطر

سے رک گیا. فرمایا واہ اس کی کیا ضرورت تھی. وہ بیٹھتے تم اپنے کام پر چلے جاتے. میں
ایک زمانے سے بالعموم ہر روز صبح کے وقت قلعے کو جاتا ہوں. بالخصوص جب سے حضرت ظلِ سبحانی
نے خاندان تمر کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا ہے یہ بلاناغہ کا دستور ہے. میری غیر حاضری میں
بھی دو ایک دوست ہمیشہ یہاں موجود ہوتے ہیں، حقہ پیا، پان کھایا، کبھی کوئی خاص ملنے
والے ہوں تو تمھاری بچی چاہیں تو انھیں کچھ کھانے کو بھی بھیج دیتی ہیں جب لوٹ کے
آتا ہوں تو ان سے دو گھڑی کی مجلس رہتی ہے.

یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت جنت مکانی بہادر شاہ ظفر بہت بیمار ہو گئے تھے اور ان
کی جان تک کے لالے پڑ گئے تھے. اگرچہ اب بیماری کی وہ خطرناک صورت تو نہیں رہی
تھی اور پہلے سے کچھ افاقت تھی لیکن ابھی ان کی حالت تشویش سے خالی نہیں تھی اس لیے
میں نے پوچھا کہ حضرت بادشاہ سلامت کی صحت اب کیسی ہے. کہنے لگے: طبیب علاج معالجہ
کر رہے ہیں اور حالت آگے سے بہتر بتائی جاتی ہے. لیکن خطرہ پوری طرح رفع نہیں ہوا.
اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے. ان کا دم غنیمت ہے. آج بھی جب میں گیا ہوں
تو خواب گاہ ہی میں حاضری ہوئی. ولی عہد بہادر، میرزا فخرو بھی وہاں بیٹھے تھے. میرزا سلیمان
شکوہ کے پوتے میرزا نورالدین، لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں، وہ بھی تھے. یہ رشتے میں اعلیٰ حضرت
کے بھتیجے ہوتے ہیں اور اپنے والد میرزا کام بخش اور دادا کی طرح شیعانِ اہل بیت میں سے
ہیں. حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے. دو ایک مصاحب بھی دست بستہ کھڑے تھے. میں
نے اطلاع کرائی، تو اندر جانے کی اجازت ملی. میں نے مجرا عرض کیا اور ایک طرف ہٹ کر
کھڑا ہو گیا. کمزوری کا کچھ نہ پوچھو. پہچانے نہیں جاتے. پہلے ہی کون سے سام و نریمان تھے
پھر عمر کا تقاضا. یوں سمجھو کہ اس اگلے شعبان میں اسّی برس کے ہو جائیں گے. رہی سہی کسر
اس بیماری نے پوری کر دی. سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں. بہت رک رک کر دو ایک باتیں کیں
ارشاد فرمایا. آج ایک عجیب بات ہوئی. فجر کی نماز کے بعد یونہی ذرا میری آنکھ جھپک گئی تو
میں نے دیکھا کہ میں حضرت عباس علمبردار کی درگاہ پر علم چڑھا رہا ہوں. اس پر میرزا
نورالدین نے عرض کیا کہ جہاں پناہ، یہ رویائے صادقہ اور اشارہ غیبی ہے. اس خواب کو ظاہر

ہیں پورا کرنا چاہیے۔ فرمایا بہت اچھا خدا نے ہمیں صحت دی، تو ہم حضرت کی درگاہ پر سونے کا علم چڑھائیں گے۔ سب حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا اور دعا کی کہ شافیِ مطلق جلد صحت بحال کرے اور حضور والا اپنی منت پوری کریں۔

پھر فرمایا: ایک بات میری یاد رکھو، خدا ان پر فضل کرے گا اور اب یہ اچھے ہو جائیں گے میرا یہ ایمان ہے کہ جو شخص بھی اہلِ بیت سے محبت کرے گا، خدا اس سے محبت کرے گا۔

وہ دو ڈھائی بجے اٹھے۔ ہاتھ منہ دھویا اور قالین پر آن بیٹھے۔ پہلے تھوڑی دیر حقہ پیتے رہے۔ پھر دوستوں کے خطوں کے جواب لکھے لیکن گرمی اس بلا کی تھی کہ اس دوران میں انھوں نے تین چار بار پانی پیا ہوگا۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی جس پر صافی لپٹی ہوئی تھی پاس رکھی ہوئی تھی اسے اٹھاتے اور تھوڑا سا آبخورے میں انڈیل کر پی لیتے۔ پانچ بجے کے قریب داروغہ جی کو بلایا اور حکم دیا کہ . . . دیکھو میاں کلو، اب گرمی بہت ہوگئی ہے۔ دوپہر کو یہاں بیٹھنا مشکل ہے۔ کل سے ہماری اندر کی کوٹھری تیار کرا دو اور خس کی ٹٹی کا بھی انتظام کر دو۔ ذرا خیال رکھنا۔ خس تازہ اور چھوٹی چھوٹی ہو جس میں پانی دیر تک ٹھہر سکے، اور خوشبو بھی ہو، اور اب برف کا ذخیرہ رکھنا چاہیے۔ میرزا صاحب اپنے حکم احکام ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ کلیان کہار نے آکر اطلاع دی کہ ابھی ابھی باہر صدر الصدور جی پالکی سے اترے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرزا صاحب جھٹ سے کھڑے ہو گئے اور صدر دروازے تک جا کر مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی پذیرائی کی۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ پہلے مفتی صاحب کو ایک مونڈھے پر بٹھایا۔ پھر خود مٹیے میں بھی ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے شیفتہ، صہبائی، نیر رخشاں، داغ اور ظہیر بھی آ گئے۔ داغ اور ظہیر چونکہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے مؤدبانہ حریے پاس تخت پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب قادر الکلام تو تھے ہی اچھی خاصی مجلسِ مشاعرہ گرم ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے میرزا صاحب سے فرمائش کی کہ کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو سنائیے۔ میرزا صاحب نے پہلے تو عذر کیا لیکن جب مفتی صاحب کے ساتھ صہبائی بھی اصرار کرنے لگے تو فرمایا شعر گوئی کام دل و دماغ کا ہے۔ دنیا داری کے جھمیلوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ قلعے کی حاضری اور دوست احباب کی خدمت سے فرصت ملے تو انسان کچھ فکر بھی کرے، اس پر آج کل آسمان سے آگ برس رہی ہے

گرمی کے مارے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں۔ ایک غزل تھوڑے دن ہوئے کہی تھی اس کے چند شعر عرض کرتا ہوں:

چاک از جیبم بہ داماں می رود — تا چہ بر چاک از گریباں می رود

جوہرِ طبعم درخشاں ست، لیک — روزم اندر ابر، پنہاں می رود

گر بود مشکل، مرنج اے دل، کہ کار — چوں رود از دست آساں می رود

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست — خود سخن در کفر و ایماں می رود

آید از ذوق نشناسم کہ کیست — تا رود، پنداشتی، جاں می رود

می برد، اما نہ یک جا می رود — می رود، اما پریشاں می رود

اوّلِ ماہ است و از شرمِ تو ماہ — آخرِ شب، از شبستاں می رود

کیست تا گوید، بداں ایواں نشیں

آنچہ بر غالبؔ ز دربان می رود

حکیم مومن خاں کے انتقال کو مشکل سے سال بھر ہوا تھا معلوم نہیں کیسے ان کا ذکر چل پڑا۔ اس پر میرزا صاحب فرمانے لگے: "صاحب بڑی آن بان کا آدمی تھا۔ ایسا رنگین مزاج اور زندہ دل اور خوددار شخص بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ بلکہ غزل میں ایک نئی روش کا مخترع تھا۔ جب تک اس کا شعر ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھا جائے۔ اس کا پورا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مجھے تو اس کا یہ شعر نہیں بھولتا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نفسِ مضمون۔ لطفِ زبان، اسلوبِ بیان، غرض اس کی کس کس بات کی تعریف کی جائے جب تک کسی شخص نے عشق بازی کی نہ ہو اور کسی کے فراق کا مزہ چکھا نہ ہو۔ اسے یہ مضمون سوجھ ہی نہیں سکتا۔ زبان کا کیا کہنا۔ اور "گویا" میں جو پہلو ہے وہ تو کہنے کی بات ہی نہیں۔ سب پر طرّہ یہ کہ سہل ممتنع ہے یہ ماورائے شاعری کچھ اور چیز ہے اور محض خدا کی دین۔ ریختہ میں اس پایے کے شعر بہت کم ہیں۔ میں نے تو مرحوم سے ایک بار کہا تھا کہ بھائی میرا سارا دیوان لے لے

اور یہ شعر مجھے دے دے۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگے۔ "صاحب مومن کے مرجانے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا۔ قافلہ خالی ہوتا جاتا ہے۔ مرحوم میرا یار اور ہم عمر تھا۔ میں جب آگرے سے یہاں آیا ہوں تو یہی پندرہ سولہ برس کی عمر تھی۔ شاید وہ دو ایک سال مجھ سے چھوٹا ہو۔ لیکن ذہن کا شروع سے بہت تیز تھا۔ اس نے ابتدا میں چند غزلیں نصیر کو دکھائی تھیں۔ لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نصیر کی قادر الکلامی میں شک نہیں مگر ان کے استعارے اور تشبیہیں ایسی ہی ہیں جیسے پیاز، کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں، گودے کا نام نہیں۔ اس کے برخلاف مومن نے طبیعت معنی آفریں پائی تھی۔ بھلا کیسے نبھتی۔ بس جلد ہی یہ گھبرا کر ان کے جال سے نکل بھاگے اور پھر کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اس چالیس بیالیس برس کے عرصہ میں کبھی کوئی رنج یا ملال ہمارے درمیان نہیں آیا۔ حضرت اتنی لمبی مدت کا تو دشمن بھی میسر نہیں آسکتا، دوست کہاں سے ہاتھ آتا ہے۔ میں نے اس کے مرنے پر ایک رباعی کہی تھی ؎

شرطست کہ روے دل خراشم، ہمہ عمر
خونابہ برخ، ز دیدہ پاشم، ہمہ عمر
کافر باشم، اگر بہ مرگِ مومن
چوں کعبہ، سیہ پوش نہ باشم، ہمہ عمر"

باتوں میں اور شعر خوانی میں کسی کو وقت کا خیال نہ آیا۔ آخر مفتی آزردہ چونکے اور کہا کہ معاف فرمایئے گا آپ کی پرلطف باتوں اور کلام میں وقت کا اندازہ نہ رہا۔ اب اجازت دیجیے۔ اگلے جمعہ کے دن غریب خانے پر مشاعرہ ہے۔ چند دوست جمع ہو رہے ہیں آپ بھی ضرور قدم رنجہ فرمایئے گا۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں اور نواب ضیاء الدین خاں آنے کا وعدہ کر چکے ہیں طرح "گر بیا نم نمی آید، دامانم نمی آید" طے ہوئی ہے لیکن اس کی قید نہیں۔ آپ جو چاہیں پڑھیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ نیر رخشاں برابر سے بولے تو

میں وعدہ کرتا ہوں کہ جمعہ کو انھیں ساتھ لیتا آؤں گا۔

تھوڑی دیر میں سب صاحب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے جب میدان صاف ہو گیا تو کلو نے آن کر پوچھا کہ آپ اسی جگہ کھانا کھائیں گے یا اندر چل کر، بولے، میرے لیے تو یہیں لے آؤ، یہ چاہیں تو بے شک اندر چلے جائیں، میں نے کہا، نہیں میں بھی یہیں کھا لوں گا۔ چنانچہ کلو اور ایاز دونوں ہمارا کھانا وہیں مردانے میں لے آئے، میرزا صاحب نے صرف تین چار شامی کباب، کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ نوش جان فرمائے اور اس کے بعد مٹی کے آبخورے سے شراب پینے لگے۔ معلوم ہوا کہ گرمیوں کا معمول ہے کہ سرِ شام کلو شراب بوتل سے آبخورے میں ڈال دیتا ہے، اگر برف موجود ہوئی تو آبخورہ اس میں رکھ دیا۔ تاکہ شراب ٹھنڈی رہے، ورنہ لال تند کی صافی پانی میں تر کر کے آبخورے پر لپیٹ دی جائے گی۔ اور آبخورہ ادھر ہوا میں لٹکتے ہوئے چھینکے پر رکھ دیا جائے گا۔ تاکہ ہوا لگنے سے صافی خشک ہو تو اس سے آبخورہ ٹھنڈا ہو جائے۔

شراب کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے نمکین بادام، گزک کے طور پہ کھاتے رہے دس بارہ بادام کھائے ہوں گے۔ شراب میں برابر کا عرقِ گلاب ملاتے گئے، فرمانے لگے اس سے شراب کی حدت کم ہو جاتی ہے ایک زمانہ تھا کہ کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے یا شام کے قریب جب چاہا دو تین گلاس پی لیے۔ بارش کا دن ہوا تو اور زیادہ پھر رات کی معمولی شراب اس کے علاوہ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، مزاج پہلے ہی سے سوداوی تھا ان بے اعتدالیوں نے اسے اور آگ کا پتلا بنا دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ صافی شراب گھونٹ بھر بھی نہیں پی سکتا۔ اس کے پینے سے سینہ جلنے لگتا ہے اور حلق میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں اس لیے اسے گوارا بنانے کو اس میں عرق گلاب ملاتا ہوں اور مقدار تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ برائے نام رہ گئی ہے میں نے ایک مقطعے میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

میں نے جرأت کر کے کہا کہ اتنے پینے سے چھوڑ دینا اچھا ہے، ایسے گناہ بے لذت سے حاصل؟ بولے بھائی ٹھیک کہتے ہو لیکن میاں ذوق نے کیا سچ کہا ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۳۵۔ ۴۰ برس کی عادت۔ اب چھٹے تو کیونکر، بہر حال شرمسار ہوں، اسے حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں لیکن اس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ حضرت احمد مصطفےٰ اور امام علی مرتضیٰ کے صدقے میں بخش دے۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا، دیر تک چہکتے رہے۔ اور آدھی رات کے قریب سونے کے لیے پلنگ پر گئے۔

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کے میرزا صاحب اندر کی کوٹھری میں چلے گئے۔ مجھ سے فرمایا یہاں گرمی میں اکیلے بیٹھے کیا کرو گے۔ چاہو تو تم بھی اندر آ جاؤ۔ چنانچہ ہم دونوں کے لیے کلو نے چارپائیاں بچھوا دیں۔ اور ہم ان پر دراز ہو گئے۔ فرش پر پانی کا خوب چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ کوٹھری کی شرقی سمت گلی میں ایک بڑی سی کھڑکی کھلتی تھی۔ اس پر خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ کلو نے ایاز چھوکرے کو مقرر کر دیا کہ ہر آدھ پون گھنٹے بعد اس پر پانی ڈالتا رہے۔ میرزا صاحب نے بدن کے سارے کپڑے اتار دیے۔ صرف ایک پاجامہ رہ گیا۔ پلنگ پر لیٹ گئے اور حقہ پیتے رہے۔ کمرے میں پانی کی صراحی اور برف رکھی تھی، پیاس محسوس ہوتی تو اٹھ کر پی لیتے جب عصر کا وقت ہوا اور سائے لمبے ہونے لگے تو کوٹھری سے نکلے۔

آج فرمایا دیکھو میاں، دلی کی خصوصیات میں سے ایک مسجد جامع کا شام کا بازار بھی ہے۔ چلو آج تمھیں تماشا دکھا لائیں۔ چنانچہ کلو کو حکم ہوا کہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔ کلیان ہمارے ساتھ جائے گا۔ اگر ہماری غیر حاضری میں کوئی صاحب تشریف لائیں تو انھیں بٹھایا جائے مغرب کے بعد مکان پر پہنچ جائیں گے۔

میرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی واپس کر دی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔

ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازی گر اپنے کرتب دکھا رہا ہے یار لوگ اس کے گرد پرا باندھے کھڑے ہیں، کہیں بھان متی کا تماشہ ہو رہا ہے اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف خوانچہ والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ چلتے چلتے مرزا صاحب ایک جگہ رک گئے، اور کلیان سے کہا جاؤ کلن کی دکان سے رات کے لیے چار آنے کے سیخ کے کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوا لایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں۔ اور مرزا صاحب نے بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خاں کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دو رویہ درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس، عجیب پرلطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی، اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی فضا میں محظوظ ہوئی۔ سیکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں بھی اگر اکیلا ہوتا تو شاید وہاں کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ لیکن میرزا صاحب کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی کہ نہ معلوم کون کون صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس لیے ان کے ساتھ واپس آگیا۔

جمعہ کے دن شام کے کھانے کے بعد نواب ضیاء الدین خاں کہ قریب ہی قاسم جان کی گلی میں رہتے تھے اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر آگئے اور کہا کہ چلیے حضور، صدر الصدور کے مشاعرہ میں چنانچہ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے، راہ میں سے نواب شیفتہ کو کوچہ چیلان سے ساتھ لیا اور لدے پھندے ہم سب مفتی صاحب کے مسکن محلہ چتلی قبر میں پہنچے۔ دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو چکا ہے۔ قلعہ سے بعض شہزادے بھی آئے ہوئے تھے۔ جن میں سے میرزا خضر سلطان، میرزا انجا در شاہ شاکی، میرزا محمد قویش واقف، میرزا نور الدین شاہی اور میرزا عالی بخت عالی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عجیب بات دیکھی کہ سب شہزادوں کا ایک سا حلیہ اور ایک سی وضع اور ہر ایک کے ہاتھ میں بٹیر تھی۔ ان میں سے بیشتر "حافظ جیو" عبدالرحمن احسان مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ خود استاد ذوق بھی موجود تھے۔ داغ اور ظہیر اور محمد حسین آزاد تھے۔ صہبائی اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے تھے۔ میرزا غالب کے شاگردوں میں سے قربان علی بیگ خاں

سالک. جواہر سنگھ جوہر. غلام حسن خاں محو. یوسف علی خاں عزیز۔ اور بعض دوسرے اصحاب موجود تھے۔ ایک ولایت آمدہ شاعر سحابی بھی شریک مجلس تھے۔

مشاعرہ دس، ساڑھے دس بجے کے قریب شروع ہوا۔ پہلے اردو کے شاعروں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ان میں سے بعض کا کلام واقعی بہت پختہ اور دل نشیں تھا اساتذہ نے بھی بخل سے کام نہ لیا۔ اور ان کا دل بڑھانے کو خوب داد دی۔ خصوصاً داغ اور سالک اور ظہیر کی غزلوں کی بہت تعریف ہوئی۔ آخر بس اساتذہ کی باری آئی۔ اب نوجوان اور نوآموز طبقہ خموشی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے آزردہ نے کہ میزبان اور صاحب خانہ تھے۔ اپنی غزل سنائی۔ غالب اور صہبائی اور ذوق نے بہت تعریف کی اور آزردہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد نیر رخشاں، شیفتہ صہبائی وغیرہ نے اپنا کلام سنایا آخر میں شمع میرزا غالب کے سامنے آئی۔ انھوں نے پہلے ایک غیر طرحی غزل سنائی۔ اس کے تین چار شعروں کی بہت تعریف ہوئی تھی۔

ہر چہ فلک نخواستست ہیچ کس از فلک نخواست ۔۔۔ ظرفِ فقیہ مے نجست بادہ ماگزک نخواست

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز ۔۔۔ ہم محکِ تو زر ندید، ہم زرِ من محک نخواست

رندِ ہزار شیوہ را، طاعتِ حق گراں نبود! ۔۔۔ لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

آخری شعر پر آزردہ تڑپ اٹھے۔ اس کی خاص طور پر داد دی اور اسے دو تین بار پڑھوایا۔ اس کے بعد میرزا صاحب نے طرحی غزل سنائی جس کے چند شعر میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

چہ عشقیں از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمی آید ۔۔۔ بنوعے گفت، می آیم، کہ می دانم، نمی آید

گزشتم، زاں کہ بر زخم دلِ صد پارہ، خوں گرید ۔۔۔ خود اورا خندہ بر چاک گریبانم، نمی آید

بوستن بگستہ و در سایۂ دیوار نشستہ ۔۔۔ بکوئش، رشک بر مہر درخشانم، نمی آید

دعائے خیر شد، در حقِ من، نفریں بجاں کردن ۔۔۔ ز نفریں بس کہ می رنجد بہ لب جانم، نمی آید

ولش خواہد، کہ تنہا سوے من روے آورد، لیکن — فریب ہم رہاں، دانم، زنا دانم، نمی آید

دبیرم، شاعرم، رندم، ندیم، شیوہ ہا دارم — گرفتم رحم بر فریاد و افغانم، نمی آید!

ندارم بادہ غالبؔ گر سحر گاہش، سرا ہے

بہ بینی مست، دانی کز شبستانم، نمی آید

سب شعروں کی خوب خوب داد ملی. پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ انھوں نے ساری غزل ہلکے ترنم سے پڑھی، پہلی بار مصرعِ اولیٰ یک بارگی پڑھ جاتے پھر اسے آہستہ آہستہ دہراتے اور ایک لحہ توقف کے بعد اسی لہجہ میں دوسرا مصرعہ سناتے. جب کوئی صاحب داد دیتے یا مصرع اٹھاتے تو میرزا صاحب کا دہنا ہاتھ بے اختیارانہ تھوڑا سا اُٹھ جاتا اور بس. ورنہ یوں وہ نہایت دل جمعی سے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور پہلو تک نہیں بدلا.

میرزا غالبؔ کی غزل کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوا اور اس کے بعد حاضرین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے. آزردہ نے سب صاحبوں کا شکریہ ادا کیا. ہم بھی چار ساڑھے چار بجے کے قریب واپس مکان پر آئے.

یہ آٹھ دس دن جو میں میرزا صاحب کے مکان پر رہا مجھے کبھی نہیں بھولیں گے. چونکہ میں جس کام سے آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا اس لیے میرزا صاحب سے اجازت لے کر آگرے چلا گیا.

(۲)

اس کے بعد میں لگ بھگ دو برس تک دلی نہ آسکا. اب کے میرا ۱۸۵۵ء میں آنا ہوا. میرزا صاحب ابھی تک اسی بلی ماروں والے مکان میں رہتے تھے. میں شام کے قریب پہنچا تھا وہ بہت لطف اور مہربانی سے ملے. ان سے مل کر میں اندر گیا. جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں بندگی عرض کی. انھوں نے دعا دی سفر کا پوچھتی رہیں کہ کہیں راہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی اس کے بعد میں باہر آیا. میرزا صاحب دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور اپنے دوسرے ملنے والوں کی باتیں کرتے رہے. پھر پوچھا، سناؤ کاروبار کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا مندا تو ہے لیکن شکر ہے، بھلی بری گذران ہوتی جاتی ہے. کسی کا کچھ دینا نہیں. یہی غنیمت ہے.

اس تین چار برس میں میرزا صاحب کی ظاہری شکل وصورت میں بہت فرق آ گیا تھا

پہلی بار جب ملے ہیں۔ تو ڈاڑھی گھٹی ہوئی تھی۔ اب چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن اس کے بالعکس سر منڈا ہوا تھا۔ سامنے کے دو دانت ندارد، اس لیے آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ کمر میں بھی خفیف سا خم آ گیا تھا۔ غرض میں نے انھیں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور پایا۔ البتہ طبیعت میں وہی پہلی سی چستی اور گفتگو میں شوخی موجود تھی۔

ان دنوں موسم کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اگرچہ یوں گرمیوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی دن کو سخت گرمی پڑتی تھی۔ البتہ رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ حسبِ معمول دوپہر کے بعد اندر کی کوٹھری میں گزارتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔ یہی کوئی تین کا عمل ہوگا۔ ہم ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے لطف لے رہے تھے۔ کہ باہر دروازے پر کچھ شور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ کھلا آگے آگے حسین علی خاں اور اس کے پیچھے باقر علی خاں اور ان دونوں کے پیچھے مغلانی۔ حسین علی خاں بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ چیختا بھی جاتا تھا اس کے ہاتھ میں کوئی لکڑی کا کھلونا تھا۔ معلوم ہوا کہ باقر علی خاں چاہتا ہے کہ حسین علی خاں سے یہ کھلونا دے دے۔ اور وہ دینا نہیں چاہتا بس اس پر کھٹا چھنی ہو گئی۔ بیگم صاحبہ گھر پر نہیں تھیں اس لیے حسین علی خاں، پناہ مانگنے کو دادا جان کے پاس دوڑا آیا تھا۔ ہمارے پلنگ کچھ لیسے اونچے نہیں تھے۔ حسین علی خاں دوڑا دوڑا آیا اور میرزا صاحب کے پلنگ پر چڑھ گیا۔ وہ باہر مٹی اور گرد و غبار میں کھیلتا آیا تھا۔ کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا اس سے اس کے پاؤں گیلے ہو گئے۔ اس کے اوپر چڑھنے سے سفید چادر پر جو گل کاری ہوئی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میرزا صاحب نے جو ڈانٹا تو بڑا لڑکا باقر علی خاں تو غائب ہو گیا لیکن حسین علی خاں وہیں پلنگ پر بیٹھا مچلنے اور بسورنے لگا۔ چونکہ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے میرزا صاحب نے خیال کیا کہ اب خفا ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بچے کو چمکارا اور پیار کیا۔ پھر مغلانی کو آواز دی اور اسے اس کے حوالے کیا۔ کلو سے بستر کی چادر بدلوائی اور دوبارہ لیٹ گئے۔

چند لمحے بعد کہنے لگے تم سے ایک دل کی بات کہوں میں اس خانہ داری سے کبھی خوش نہیں رہا۔ جب میری شادی ہوئی ہے تو مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ شادی کہتے کسے ہیں اور اس کے جھنجٹ اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ خیر اس کا کیا غم۔ کیونکہ اگر معلوم بھی ہوتا تو میں کیا

کر سکتا تھا۔ ہمارے بزرگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اولاد کا اپنی شادی بیاہ کے بارے میں بولنا پرلے سرے کی بے حیائی ہے۔ میں ٹھہرا قلندرانہ وضع کا آدمی، میری یہ آرزو، کہ ایک شطرنجی اور لوٹا کندھے پر ڈالوں، لکڑی ہاتھ میں لوں اور پیادہ پا چل نکلوں، آج یہاں، کل وہاں ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست۔ اور یہ قبیلہ داری کے تمام اصولوں کے خلاف۔ خدا نے اولاد دی اور لے لی۔ غم کسے نہیں ہوگا۔ کہ یہ قدرتی امر ہے لیکن دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ میں نے اس پر صبر شکر کیا کہ یوں بھی تنہائی میری آزاد طبیعت کے منافی نہیں تھی۔ غرض لسٹم پسٹم گذرتی جا رہی تھی۔ لیکن قدرت بڑی ستم ظریف ہے۔ اس نے کہا، ذرا ٹھہر تو جا، تو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔ تین برس ہوئے، پہلے زین العابدین خاں کی بیوی مری اور پھر وہ آپ بھی چل بسا۔ حسین علی خاں کو میری بیوی یہاں لے آئی۔ بڑا بھائی اپنی دادی کے پاس جا رہا۔ چند مہینے ہوئے وہ نیک بخت بھی جنت کو سدھاری اور باقر علی خاں بھی یہاں آگیا۔ اسے کہتے ہیں غم نہ داری بز بخر۔ کچھ بے مروتی کر کے کس سے کہوں کہ تو ان بچوں کو لے لے میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے بس چپ چاپ، قضا و قدر کی شعبدہ بازی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ غرض اسی طرح دل سوزی کی باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ میں نے غور کر کے سنا تو زیرِ لب یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

نہ شامِ ما را سحر نویدے، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدے
چو حاصلِ ماست ناامیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ

اگلے دن صبح کے وقت بریلی سے قاضی عبدالجمیل جنون کے بھیجے ہوئے آموں کے دو ٹوکرے پہنچے۔ میرزا صاحب نے قاضی صاحب کے ملازم کو جو ٹوکرے لایا تھا انعام دیا اور ٹوکرے اپنے سامنے کھلوائے، کچھ آم راستے میں خراب ہو گئے تھے وہ پھکوا دیے دس دس آم دو جگہ نواب مصطفیٰ خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں بھجوائے اور باقی کو ٹھنڈے پانی کی ناند میں رکھوا دیا۔ تیسرے پہر گھر کے سب لوگ آم کھانے کے لیے جمع ہو گئے۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ میرزا صاحب نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا حضرت یہ کیا۔ کہنے لگے سچ کہوں نیت نہیں بھری مگر بھائی کیا کروں معدے میں ہضم کی وہ پہلی سی طاقت نہیں رہی، ہائے کیا دن تھے،

جوانی کے عالم میں، کہ طبیعت میں جوش تھا اور صحت برقرار تھی۔ عصر کے قریب آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ ابھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ اب آم کھانے کا کیا مزہ، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، کھاؤں تو ہضم کیسے کروں۔ جوانی کیا گئی کہ زندگی کا لطف جاتا رہا۔

ایک دن بڑا دل چسپ لطیفہ ہوا، جب ہم دونوں دیوان خانے میں جا کے بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ ان کے کمر بند میں نو دس گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ میں حیران کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ رات، شاید بے خبری کے عالم میں انھوں نے یہ گرہیں لگائی ہوں۔ کیونکہ بعض لوگوں کو ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ سوتے میں کوئی کام کرتے ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے مذاق کی سوجھی میں نے ان سے کہا۔ قبلہ کیا رات کو تسبیح پھیرتے رہے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں تو، لیکن کاغذ قلم لو اور لکھتے جاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور انھوں نے کمر بند کی پہلی گرہ ٹٹولنا شروع کی۔ پھر فرمایا لکھو مطلع ؂

اے ذوقِ نوا سنجی، بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے، بر بنگہ ہوش آور

اور اس کے بعد گرہ کھول دی۔ اس طرح انھوں نے مجھے پوری غزل لکھوائی۔ ہر ایک شعر کے بعد وہ ایک گرہ کھول دیتے۔ حتیٰ کہ نو کی نو گرہیں کھل گئیں اور غزل مکمل ہوگئی۔ خیر غزل تو میں نے لکھ لی لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ یہ کیا طلسم ہے وہ بھی میری کیفیت کو بھانپ گئے۔ پہلے تو ہنستے اور میری بدحواسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر بولے۔ بات اصل یہ ہے کہ رات جب بستر پر جاتا ہوں تو کبھی کبھی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہو جاتی ہے، اب تو ایک مدت سے یہ شوق ہی چھوٹ گیا ہے۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ میں دن میں شعر کہتا ہی نہیں تھا۔ عام طور پر رات کو سرخوشی کے عالم میں فکر کیا کرتا تھا۔ اب بھلا اس وقت کون اٹھ کر روشنی کا انتظام کرے اور لکھنے کا سامان ڈھونڈھے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب شعر ہو جاتا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتا۔ اس طرح دس دس بارہ بارہ گرہیں لگا کے سو رہتا۔ صبح کو اٹھتا اور ٹٹول ٹٹول کر حافظے سے نکال کے شعر قلم بند کر لیتا۔ اب تو مہینوں اور برسوں

گذر جاتے ہیں کوئی تازہ فکر ہوتی ہی نہیں۔ رات یونہی یہ زمین خیال میں آگئی۔ طبیعت نے راہ دی اور میں نے غزل پوری کرلی۔ پرانی عادت کے مطابق کمر بند کا سہارا لیا۔ اگرچہ مجھے اندیشہ تو تھا کہ یہ کہیں نسیان کی نذر نہ ہو جائے۔ لیکن اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ تاہم تم نے دیکھا کہ پورے نوکے نو شعر یاد آگئے۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جوانی کے دنوں میں کیا کیفیت تھی۔ اچھا اب قلم دوات اور کاغذ میری طرف بڑھاؤ، نواب انوار الدولہ بہادر اور منشی نبی بخش کو خط لکھوں اور یہ غزل ان کی خدمت میں تحفہ بھیجوں۔ آج ان دونوں صاحبوں سے زیادہ کوئی اور، اس کلام کا مستحق نہیں۔

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نرسد!

خاص طور پر منشی نبی بخش کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے انھیں نہیں دیکھا مجھے ٹھیک طور پر یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ شعر گوئی اور شعر فہمی میں کتنا بعید فرق ہے۔ جب تک یہ غزل ان دونوں صاحبوں کے پاس نہیں پہنچ جاتی مجھے چین نہیں آئے گا۔

اس کے بعد انھوں نے خط لکھے اور لفافوں پر پتے لکھ کر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر میں کلو آیا۔ اس نے خط لفافوں میں ڈالے، ان کو بند کر کے ٹکٹ لگائے اور ڈاکخانے چلا گیا۔

شیخ ابراہیم ذوق، نومبر ۱۸۵۴ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔ حضرت ظلِّ سبحانی ۴۶۔۴۷ برس ان سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اتنی لمبی مدّت کی دوستی اور محبت، صدمہ ہوا ہی چاہیے۔ انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن نبھ نہ سکی۔ شاہی خاندان میں شعر و شاعری اور علم و ادب کا مذاق شروع سے تھا۔ مگر اول اول یہ ذوق کچھ دبا دبا سا تھا۔ وہ لوگ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ نری باتیں ہی بنانا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ تلوار کو نیام میں زنگ لگنے لگا۔ اور اس کی جگہ قلم نے لے لی۔ پھر تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخری زمانے میں قلم ہی قلم رہ گیا اور تلوار اٹھا کے طاق پر رکھ دی گئی۔ ظفر کی بھی یہی حالت تھی۔ شاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ملک ہندوستان کی پادشاہی تو برائے نام رہ گئی تھی لیکن ملکِ سخن کی تاجوری بے شک ان کے حصے میں آئی، اتنے زمانے کا شوق۔ ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دن خاموش رہ سکتے چنانچہ انھوں نے پھر شعر گوئی شروع کر دی اور اب کے اصلاح کا فرض میرزا غالب کے سپرد ہوا۔

میرزا صاحب کا دستور یہ تھا کہ قیلولے کے بعد عصر کے وقت جہاں پناہ کی غزلیں بناتے تھے۔ ایک دن جب کام سے فارغ ہو چکے تو میں نے کہا قبلہ! میں نے آج تک حضرت ظل اللہ کو قریب سے نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی بڑی تمنا ہے۔ کہنے لگے یہ کیا مشکل ہے۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے، فرمایا، آج کل روزانہ شام کو نور گڑھ کے پاس جمنا کی ریتی میں، تپنگ بازی ہوتی ہے۔ ایک طرف قلعۂ معلّٰی کے بادشاہی پتنگ باز ہوتے ہیں اور دوسری طرف ناظر حسین میرزا کے ساتھی۔ آج جہاں پناہ نے حکم دیا تھا کہ تم بھی وہاں آیا کرو۔ اب کہو، حکم حاکم، جانا ہی پڑے گا لیکن آج تو نہیں، البتہ کل سے جاؤں گا، تم بھی چلنا، میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ اور جی بھر کر دیکھ لینا۔

اگلے دن سہ پہر کو میرزا صاحب سو کر اٹھے، منہ ہاتھ دھویا اور پالکی میں سوار ہو گئے میں پیدل ساتھ ہو لیا۔ نور گڑھ کچھ دور تو تھا ہی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو بلا مبالغہ سیکڑوں پتنگ باز جمع ہو رہے ہیں اور ہزاروں تماشائی اہلے گہلے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں مجمع ہو، وہاں بھلا خوانچے، پھیری والے کیسے نہ پہنچیں اور بھیک منگتوں کو کون روک سکتا ہے۔ کمرے اور کمریاں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلی سے لگائے ہر آئند و روند سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ غرض کہ یہاں ایک نئی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ قسم قسم اور رنگ برنگ کے تپنگ اور تکل آسمان میں ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا رنگین اور پھولدار قالین ہوا میں اِدھر سے اُدھر اڑ رہا ہو۔

اعلیٰ حضرت کو میں نے پہلی بار اتنی نزدیک سے دیکھا۔ لمبوترا چہرہ، پتلی ستواں ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی بھنویں، نہایت تیز اور بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ چوڑا دہانہ۔ نیچے کا ہونٹ نسبتاً نمایاں اور اس پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ کلّے صاف اور ٹھوڑی پہ دو ڈھائی انگل کی سفید براق ڈاڑھی۔ شرعی خشخاشی لبیں، قد میانہ اور سینہ چوڑا تھا۔ لیکن شانے تنگ اور ڈھلواں تھے۔ رنگ خاصا سانولا تھا۔ حالانکہ سن مبارک اس وقت اسّی سے اوپر تھا۔ اس کے باوجود چہرے مہرے سے چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ انھیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں کسرت کا شوق رہا ہے چنانچہ ان کی جوانی میں مشہور تھا کہ ہندوستان بھر میں ڈھائی شہ سوار ہیں ایک یہ ایک ان کے چھوٹے بھائی میرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ لباس میں نیچے قباتی اور

اس کے اوپر چارقب، سرپردستار اور دستار کے اوپر گوشوارہ، جیغہ، سرپیچ اور تاج شاہی اس پر تین طرے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا، اور ایک سوا ایک موتی کا مالا۔ بازوؤں پر نو رتن۔ ہاتھ میں موتیوں کی سمرن۔ زرنگار چوکی پر آلتی پالتی مارے تشریف فرما تھے اس وقار اور متانت کی مورت دیکھنے سے مجھ پر جو وحشت طاری ہوئی تھی اب میں اس کا بیان نہیں کرسکتا۔

آگے پیچھے شہزادوں اور سلاطینوں اور امیروں وزیروں کا جمگھٹا تھا۔ چند سربرآوردہ حضرات بیٹھے تھے۔ باقی سب مرتبے سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ بعض شہزادے بھی پتنگ اڑا رہے تھے اور حضور والا سیر دیکھ رہے تھے میرزا خضر سلطان بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے جو پتنگ اڑا رہے تھے، اتنے میں ان کا پتنگ کسی سے پیچ لڑ گیا۔ وہ گھبرا کر کھینچم کرنے لگے۔ میرزا صاحب نے ان سے کہا۔ صاحب عالم، یہ موقع کھینچم کا نہیں، بلکہ ڈھیل کا ہے۔ اس پر انھوں نے ڈھیل چلائی، جب دیکھا کہ ڈوبتے ڈوبتے پتنگ بہت دور نکل گئے ہیں تو میرزا صاحب نے ان سے کہا کہ دو چار ٹھمکیاں دے کر دیکھیے تو کہ مخالف کا کیا ارادہ ہے۔ انھوں نے ایک آدھ ہی ٹھمکی دی ہوگی کہ دوسرا پتنگ چکرانے لگا۔ میرزا صاحب نے شہزادے سے کہا کہ اب اگر آپ پھرتی سے جھٹکا دیں گے تو مخالف سنبھل نہیں سکے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھوں نے ایک ہی جھٹکا دیا تھا کہ دوسرا پتنگ کٹ گیا۔

اعلیٰ حضرت اس پر بہت مسرور ہوئے۔ لطف سے فرمایا۔ اماں، میرزا صاحب، ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ ادب سے بولے، پیر و مرشد، خودستائی ہوتی ہے، ورنہ کہوں کہ یہ خانہ زاد کیا نہیں جانتا۔ مجھے بھی کسی زمانے میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ بلکہ میں نے نہایت ابتدائی زمانے میں پتنگ کے تلازمے سے مثنوی کے طور پر چند شعر بھی کہے تھے حضور والا بولے اچھا اچھا ہمیں بھی سنائیے تو میرزا صاحب نے گزارش کی، عالم پناہ، جان کی امان پاؤں، صرف چند شعر ہیں اور وہ بھی نہایت ابتدائی مشق۔ سننے سنانے کے لائق نہیں۔ حضور نے مسکرا کر ارشاد فرمایا، کوئی پروا نہیں، ہم سنیں گے، اس پر میرزا صاحب کہنے لگے۔ الامر فوق الادب بہ نظر اصلاح ملاحظہ ہوں۔ پھر یہ چند شعر تحت اللفظ سنائے ؎

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی　　لے کے دل سر رشتۂ آزادگی!

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا　　اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا، اے دل، ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں

بیچ میں ان کے نہ آنا، زینہار — یہ نہیں ہیں گے، کسو کے یارِ غار

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ، ڈورے ڈال کر

اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ

سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے، دل ان سے الجھانا تجھے

یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت، اس پر اڑاتے ہیں تجھے

ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد، ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ پتنگ کے لیے اس شعر کی تضمین بھی کسی کو نہیں سوجھی ہوگی۔ میرزا صاحب نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ چونکہ دیر ہو چلی تھی اور شام کی ہوا میں خنکی ہوتی جا رہی تھی اس لیے حضرت بادشاہ سلامت، واپسی کے لیے مغرب کے قریب تختِ رواں پر سوار ہو گئے اور سب کو واپس جانے کی اجازت دی۔ ہم بھی چراغ جلے مکان پر پہنچے میرزا صاحب بہت تھک گئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے تین چار شامی کباب نوش فرمائے، شراب پی اور پڑ رہے۔

اس کے دو دن بعد میں آگرے چلا گیا۔

(۴)

اس کے دو برس بعد غدر کا ہنگامہ ہوا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ دلی اور دلی کے احباب پر کیا گزری جب فساد کی آگ فرو ہوئی تو والد صاحب قبلہ نے مجھ سے کہا کہ بیٹا جاؤ اور میرزا صاحب کی خیریت کی خبر لے آؤ۔ چنانچہ میں آیا۔ یہ ۱۸۵۸ء کے شروع کا ذکر ہے۔ ابھی تک شہر میں پورا امن نہیں ہوا تھا۔ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہندوستانی امیر کی گرفتاری یا نظربندی ضبطیِ جائداد یا پھانسی کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ شہر میں باہر سے آنے جانے پر بھی بہت پابندیاں

ہیں اور باہر سے آنے والوں کو شہر کے فوجی حکام سے خاص ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ میں نے بھی دو دن ٹھہرنے کا ٹکٹ لیا ۔ سہ پہر کو دلّی پہنچا اور سیدھا بلّی ماروں میں میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔

شام کو میرزا یوسف علی خاں عزیز اور منشی ہیرا سنگھ دردؔ اور پنڈت شیوجی رام آن پہنچے۔ میرزا یوسف علی خاں اپنے والد میرزا نجف علی خاں کی وفات کے بعد مستقل طور پر دلّی آ رہے تھے۔ اور ان دنوں اسی محلے میں میرزا صاحب کے مکان کے قریب ہی ایک متمول امیر کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ وہیں محلے کے کچھ اور بچے بھی ان سے تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح گویا مکتب کا سا طور ہو گیا تھا۔ منشی ہیرا سنگھ دردؔ میرزا صاحب کے پرانے دوست اور مہربان، رائے چھجمل کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حوض قاضی کے پاس گندی گلی میں رہتے تھے۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی، منشی جواہر سنگھ جوہرؔ (تحصیلدار صاحب) دونوں، میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

اسی زمانے میں آگرے سے میرزا حاتم علی مہرؔ نے اپنی مثنوی 'شعاعِ مہر' میرزا صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ عزیزؔ اسے بلند آواز سے پڑھتے رہے۔ اور ہم سب سنتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ غرض رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اگلے دن شام کے قریب ہم دیوان خانے میں بیٹھے تھے کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک رجسٹری خط لایا۔ میرزا صاحب نے کھولا تو معلوم ہوا کہ میرزا تفتہ نے سو روپے کی ہنڈوی اپنے استاد کی خدمت میں بھیجی ہے۔ میرزا صاحب نے ہنڈوی صحیح کر کے کلیان کے حوالے کی اور اسے نیل کے کٹڑے میں کسی مہاجن کے ہاں بھیجا۔ جانے آنے کی دیر ہوئی۔ وہ جا کے روپیہ لے آیا۔ انھوں نے پچاس روپے اندر محل میں بھیج دیے۔ کلّو داروغہ نے پچیس روپے کے لگ بھگ، دست گرداں اُدھار لیا تھا، وہ اسے دیے اور باقی رقم اپنے بکس میں رکھ لی۔ فرمانے لگے۔ رات تم نے دیکھا کہ منشی ہیرا سنگھ اور پنڈت شیوجی رام آئے ہوئے تھے۔ اب جب سے میرزا یوسف علی خاں یہاں آ گئے ہیں، یہ بھی دن رات کا اکثر حصہ یہیں گزارتے ہیں، ورنہ صرف یہ دونوں صاحب باقاعدہ آتے رہتے ہیں، کتنا کثیر الاحباب شخص تھا، کوئی وقت نہیں جاتا تھا جب دو چار دوست میرے پاس موجود نہ ہوں، بلکہ اکثر میری غیر حاضری میں بھی دیوان خانہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ یا اب یہ حال

ہوگیا ہے کہ اس ہنگامے میں اگر یہ دو تین صاحب بھی یہاں نہ ہوتے، تو گویا میں شہر میں نہیں کسی ویرانے میں رہتا تھا. شہر میرے ملنے والوں سے خالی ہوگیا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا یہاں موجود، نہ میں کسی کے پاس جا سکوں، زندہ ہوں مگر زندگی دوبھر ہوگئی، نو دس مہینے سے پنشن بند ہے، کہو یہ سارا زمانہ کیسے گذرا ہوگا، خدا جیتا رکھے برخوردار تفتہ کو کہ اس نے یہ سو روپے بھیج کر جلالیا ہے ابھی نہیں معلوم، اور کیا کچھ دیکھنا نصیبوں میں لکھا ہے، خیر یہ بھی جوں، توں کٹ جائے گی ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب

خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اس زمانے میں ان کی سرکاری پنشن بند تھی. قلعہ کی تنخواہ تو بند ہونا ہی چاہیے تھی. اس لیے بہت تنگی ترشی سے گذارا ہوتا تھا. حضرت والد صاحب قبلہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ موقع دیکھ کے انھیں آگرے آنے کی دعوت دینا. میں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ملنے کا، اس لیے میں نے عرض کیا کہ ابھی یہاں کی حالت خطرے سے خالی نہیں آپ چند دن کے لیے آگرے تشریف لے چلیے وہاں خدا کے فضل سے آپ کا اپنا گھر ہے. عزیز اقارب، دوست احباب موجود ہیں. آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی پھر جب امن و امان ہوگیا تو واپس چلے آئیے. فرمانے لگے یہ ٹھیک ہے کہ حالت یہاں کی تشویشناک ہے، لیکن مجھے اپنی بے گناہی پر بھروسا ہے، میں فراری یا روپوش نہیں. میرے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا کسی نے میری مخبری نہیں کی. انگریزی حکام میری شہر میں موجودگی سے واقف ہیں. اکتوبر سال گزشتہ میں کرنیل براؤن صاحب کے سامنے حاضر ہوا تھا اور انھیں کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں. اس لیے اگر کچھ خطرے کی بات ہوتی، تو اب تک معلوم ہوگیا ہوتا. بے شک قلعہ کے ملازموں پر شدت ہے، لیکن خاص طور پر انھیں لوگوں پر، جو اس ہنگامے کے دوران میں نئے نئے وابستہ ہوئے تھے، میں تو آٹھ دس برس سے تاریخ لکھنے پر مقرر تھا اور تین چار برس سے شعروں کی اصلاح کی خدمت بھی بجالاتا رہا. یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ان دنوں میں قلعے سے اپنے تعلقات بالکل قطع نہیں کر لیے تھے. لیکن بھائی سوچو تو، یہ کر بھی کیسے سکتا تھا، اگر تلنگوں کو میرے بارے میں کسی قسم کا شبہہ بھی ہوجاتا تو میری اور میرے اہل و عیال کی تکا بوٹی کر ڈالتے. اس لیے وہاں جاتا بھی رہا اور اصلاح کا کام بھی بدستور کرتا رہا. لیکن یہ کوئی

نئی بات تو نہیں تھی۔ بلکہ خیال کرو تو یہ مزدوری تھی، پیٹ پالنے کے لیے اور حیلہ تھا جان بچانے کے لیے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے انگریز کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی، لیکن میرا مقدور ہی کیا تھا کہ میں کچھ کر سکتا بس خاموش بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ دیکھیے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، نظر اپنی بے گناہی پر، خیال کرتا ہوں کہ اب شاید امن ہونے کے ساتھ ہی پنشن بحال ہو جائے۔ رہا یہاں سے کسی دوسری جگہ جانا، تو یہ کیسے ممکن ہے اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مجھے باز پرس اور دار و گیر کا خوف ہے اور میں قصوروار ہوں۔ اس صورت میں اگر پنشن کھلنے کا کوئی امکان ہے تو وہ بھی جاتا رہے گا۔ ناصاحب، اس وقت یہاں سے نکلنا مصلحت کے خلاف ہے، بھائی سے کہنا، گھبرائیں نہیں، وہ بھی ہمارے ہی بزرگ تھے، جنھوں نے بھوکے پیاسے خدا کی راہ میں جان تک دے دی۔ دن ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے، یہ وقت بھی گزر جائے گا اگر حالات موافق ہوئے تو میں پھر کسی وقت آگرے کا چکر لگاؤں گا۔

(۵)

۱۸۶۰ء میں والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ تمھاری تجارت کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کرو۔ وہاں یوں بھی کاروبار زیادہ ہے، پھر اس پر بڑا شہر اور حکومت کا مرکز ہونے کے باعث وہاں ترقی کی زیادہ گنجائش ہے۔ میں نے بعض مقامی دوستوں سے مشورہ کیا۔ میرزا صاحب سے بھی خط کے ذریعے پوچھا۔ سب نے اس رائے پر صاد کیا۔ اس پر میں خدا کا نام لے کر ۱۸۶۱ء کے شروع میں یہاں دلی آ گیا

میرزا صاحب نے حکیم محمد حسن خاں والا مکان جولائی ۱۸۶۰ء میں چھوڑ دیا تھا اور اب اسی بلی ماروں میں ایک دوسرے مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان اگرچہ پہلے والے سے وسیع تھا لیکن اس میں تکلیف یہ تھی کہ محل سرا اور دیوان خانہ ایک جگہ نہیں تھے۔ یعنی زنانہ حصہ ایک جگہ تھا اور مردانہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا اگرچہ تھا اسی گلی میں۔ یہ مکان وہ ہے جو بلی ماروں سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے الٹے ہاتھ کو پڑتا ہے۔ اس کے برابر نکڑ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مکان سے متعلق میرزا صاحب نے یہ شعر کہا تھا ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　اک بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں نے پوچھا قبلہ وہ پہلا مکان کیوں چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا آرام دہ مکان تھا۔ فرمانے لگے۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بہت تنگ تھا۔ بھائی سچ ماننا میرا اس میں دم گھٹتا تھا۔ لیکن چونکہ کوئی اور ڈھنگ کا مکان ملتا نہیں تھا۔ اس لیے آٹھ برس تک اس میں پڑا رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء تک جب فساد شروع ہوا ہے، برابر چار روپے مہینہ اس کا کرایہ دیتا رہا۔ جب فساد ہوا تو حالات سے مجبور ہو کر میں کرایہ نہ دے سکا۔ تین برس تک پنشن بند رہی۔ کھانے کو روٹی اور پینے کو شراب تک میسر نہیں تھی۔ چار روپیہ مہینہ کرایہ کہاں سے دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین برس کا کرایہ، کم و بیش ڈیڑھ سو روپیہ چڑھ گیا۔ بارے خدا خدا کر کے مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن جاری ہوئی اور پچھلا بقایا بھی وصول ہوا۔ تو میں نے تین سال کا کرایہ یک مشت ادا کر دیا۔ لیکن اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ اگلے ہی مہینے جون کے آخر میں مالک مکان نے اسے حکیم غلام اللہ خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے مکان خالی کر دینے کو کہا۔ وہ اس میں رد و بدل کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس کے بعض حصوں کو نئے سرے سے بنوانا چاہتے تھے۔ تم نے اسے دیکھا ہی ہے۔ تھا بھی بہت پرانا۔ بڑی مشکل سے یہ جگہ ملی۔ اگرچہ اس میں محل سرا اور دیوان خانہ الگ الگ ہونے کی تکلیف ہے لیکن اس سے کہیں کھلا ہے۔ بہرحال اب پایانِ عمر، ان باتوں کی شکایت کیا۔ اب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ ان باتوں کی فکر ہو۔ آہ۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس زمانے میں روزانہ عصر کے وقت ان کے عزیزوں میں سے بعض لڑکے ان کے دیوان خانے میں جمع ہو کے فارسی پڑھتے تھے۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں تو گھر ہی پر تھے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے سعید الدین احمد خاں اور عارف کے بھتیجے (یعنی میرزا حیدر حسن خاں کے چھوٹے بیٹے) محمد حسن خاں (عرف خضر میرزا) زیادہ حاضر باش تھے کبھی کبھی میرزا علی بخش خاں کے صاحبزادے غلام فخر الدین بھی آ نکلتے تھے۔ پڑھانے والے معلم کا بھلا سا نام تھا۔ مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ میرزا صاحب پاس بیٹھے سنتے رہتے کبھی کبھی خود بھی تشریح و توضیح کرنے لگتے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی ہوتے جاتے۔ چلتے وقت

بچوں کو مٹھائی یا کوئی اور چیز کھانے کو ضرور دیتے۔ یوں بچوں کی نگرانی کے ساتھ ان کی بھی گھڑی بھر کی تفریح ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سب بچے گلستاں کا سبق لیتے تھے جب میرزا تفتہ کی مثنوی "سنبلستاں" چھپ کر آئی تو میرزا صاحب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو تفتہ کے بھیجے ہوئے دونوں نسخے دے دیے۔ اور معلم کو ہدایت کی کہ آئندہ انھیں یہ کتاب پڑھائی جائے۔

باقر علی خاں بہت متین اور خاموش طبع تھا۔ اس کے برخلاف حسین علی خاں حد درجہ شوخ اور کھلنڈرا۔ پڑھنے کے نام سے بھاگتا تھا۔ میرزا صاحب بلاتے "ارے حسین علی سبق پڑھ لیا وہ ایک دفعہ تو کہتا، آیا دادا جان۔ اور پھر غائب غلّہ کسی طرف کھسک جاتا۔ کھیل کود کا اسے لپکا تھا۔ زبان کا بھی چٹورا تھا۔ میرزا صاحب کہتے تھے، لڑکے بادشاہ ہیں جب اپنے سر پڑے گی تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔

۱۸۶۳ء کے برس انھوں نے بڑی مصیبت دیکھی۔ انھیں تھوڑی بہت چرک دھانس تو ہمیشہ ہی رہتی تھی۔ اور کچھ نہ ہوا تو سلسل بول اور قبض کے دونوں مرض تو موجود ہی تھے کہ جان کے ساتھ لگے تھے۔ لیکن اس سال مزید یہ ہوا کہ جنوری کے مہینے میں ان کو پھوڑوں کی تکلیف شروع ہوئی۔ اوّل ایک معمولی سی پھنسی داہنے ہاتھ پر نکلی۔ ان کی بے احتیاطی سے یہ بڑھ کر پھوڑا بن گئی۔ اس کے بعد بائیں پاؤں میں ورم ہوا اور ساتھ ہی پاؤں اور ایڑی سے ہوتا ہوا پنڈلی تک آ ماس ہو گیا۔ پھر دوسرا ہاتھ اور پاؤں پکڑے گئے اور آخر میں تو جسم کا یہ حال ہو گیا جیسے سرد جزاغاں ہو۔ سارے بدن پر درجن بھر چھوٹے بڑے پھوڑے اور ہر ایک پھوڑا اچھا خاصا گہرا۔ حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں صاحبوں نے تشخیص کی کہ احتراق خون کا شدید حملہ ہوا ہے جو عمر بھر کی شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ آخر باہمی مشورے سے یہ ٹھہری کہ سب سے پہلے پاؤں کے پھوڑے کو پکڑ کر گندا مواد خارج کیا جائے تاکہ کہیں اس کا زہر سارے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ چنانچہ دو تین دن نیم کے پتوں کا بھرتا بندھتا رہا جب ورم خوب پک گیا اور اس کا منہ بن گیا تو نشتر سے سوراخ دے کر گندا مادہ نکالا گیا۔ حکیم صاحب نے پھوڑوں پر لگانے کے لیے ایک مرہم کا نسخہ لکھ دیا۔

ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ حکیم محمود خاں ہی کا آدمی روزانہ صبح کے وقت آتا تھا اور زخموں کو صاف کر کے مرہم لگاتا اور مرہم رکھ کر باندھ دیتا تھا۔ جب وہ سلائی سے زخم صاف کرتا اور پیپ نکالتا تو ہم دیکھنے والے کانپ کانپ اٹھتے تھے لیکن آفریں ہے ان پر، وہ ماتھے پہ بل نہیں لاتے تھے۔ اور یہ تکلیف چند دن یا چند ہفتے نہیں بلکہ مسلسل کتنے مہینے تک رہی۔ وہ روزانہ نہایت اطمینان اور تحمّل سے مرہم پٹی کرواتے رہے بلکہ پاس دیکھنے والوں کو حوصلہ دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا محال ہوتا تھا۔ چنانچہ دن رات بستر پر پڑے رہتے۔ بھوک، پیاس بالکل ضائع ہوگئی تھی، کھانا گھر سے آتا تو وہ لیٹے لیٹے ہاتھ دھوکر دو چار لقمے حلق سے اتار لیتے۔ رات کو نیند کم آتی تھی۔ بلکہ اسے نیند کہنا ہی نہیں چاہیے۔ ایک غفلت کی سی کیفیت ہوتی تھی اور کہیں خوش قسمتی سے پل بھر کے لیے آنکھ لگ گئی تو کسی پھوڑے میں ٹیس اٹھتی۔ اور وہ بلبلا کے جاگ اٹھتے، اسی طرح سوتے جاگتے رات گزر جاتی۔ اٹھ نہیں سکتے تھے۔ کھڑے ہونے سے پنڈلیاں لرزنے لگتیں۔ وہیں پلنگ کے پاس اوٹ میں حاجتی دھری تھی ضرورت ہوئی تو کھسل پڑے اور پھر اسی طرح کھسکتے کھسکتے واپس پلنگ پر آکر پڑ گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت اسی دوران میں انھیں نقرس کی شکایت بھی ہوگئی۔

اس تکلیف کے باوجود اس زمانے میں بھی، احباب کی فرمائشیں بدستور جاری تھیں شاگرد اصلاح کے لیے کلام بھیجتے۔ دوست اور ملنے والے شوقیہ خطوط لکھتے۔ وہ کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ سب کو لیٹے لیٹے جواب لکھتے۔ ایک دن فرمانے لگے حیران ہوں کہ لوگ مجھے ابھی تک زندہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں مردے سے بدتر ہوں، بہرحال یہ دونوں باتیں آدھی سچ ہیں اور آدھی جھوٹ۔ موت کی صورت میں نیم مردہ ہوں اور زندگی کی حالت میں نیم زندہ ع

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

نومبر کے آخر میں تندرستی اتنی عود کر آئی تھی کہ مرہم پٹی موقوف ہوگئی تھی لیکن اس لمبی بیماری کا یہ نشان رہ گیا کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں مستقل طور پر اینٹھ کے مڑی اور ٹیڑھی ہوکر رہ گئیں۔ جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی اور زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ کمزوری کا تو ذکر

ہی کیا، خود کہتے تھے کہ صاحب جسم میں جتنا خون تھا، وہ پیپ ہو کر نکل گیا اب تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی اسے کھاتا ہوں کبھی پیتا ہوں۔

میں ۱۸۶۴ء کے نوروز کے دن سہ پہر کے وقت مزاج پرسی کو گیا۔ اندر صحن میں ایک دالان تھا، جہاں شام تک دھوپ رہتی تھی۔ یہیں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اب جاڑو کے موسم میں ان کا معمول تھا کہ کھانا کھا کے دھوپ میں لیٹ جاتے اور جب تک ہوا میں سردی نہ محسوس ہونے لگتی وہیں پڑے رہتے۔ میں آداب عرض کر کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ ان کے برادرِ نسبتی میرزا علی بخش خاں فوت ہو گئے ہیں۔ وہ کتنے برس سے سلطان جی کے قریب کی بستی عرب سرائے میں رہتے تھے۔ مدت سے صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہیں پچھلی رات کو فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے جنت کو سدھارے فرمانے لگے۔ مرحوم میرا بہت ہمدرد اور دلی یار تھا۔ مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں، ورنہ جنازے کے ساتھ جاتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں گئے ہیں۔ کفن دفن کا سارا انتظام وہی کریں گے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات یاد آ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب علاؤ الدین احمد خاں اور میرزا علی بخش خاں میں آپس میں کچھ کشیدگی تھی۔ اگرچہ نواب صاحب نے مرحوم کی وفات پر دو تین مادہ ہائے تاریخ نکالے تھے لیکن نہ خود ہی انھیں نظم میں لکھا نہ کسی دوسرے کو یہ کام کرنے کی اجازت دی۔ بلکہ انھوں نے کسی مجلس میں مرحوم کے خلاف بعض ایسے کلمات کہے جن سے ان کی دلی رنجش کا اظہار ہوتا تھا۔ اس پر میرزا صاحب نے انھیں خط لکھا کہ میت کو نیکی سے یاد کرنا چاہیے اب تمھارا اپنی عداوت کو ظاہر کرنا نامناسب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسرے عزیزوں کے دل ملول ہوں گے۔ بتاؤ بھلا اس سے تمھیں کیا حاصل ہوگا۔ بس اب خاموشی بہتر ہے۔

اسی سال (۱۸۶۴ء) عارف کے بڑے صاحب زادے باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کی اکلوتی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم سے ہوئی۔ دولھا ۱۷ برس کے تھے اور دلہن ۱۲۔۱۳ برس کی۔ دونوں میرزا کے ہاتھوں میں پلے تھے۔ اور انھیں اپنی اولاد کی طرح

عزیز تھے۔ ایک دن کا لطیفہ مجھے آج تک یاد ہے۔

میں اس دن کسی کام سے صبح سویرے ہی میرزا صاحب کے پاس گیا تھا۔ وہاں باتوں میں دیر ہو گئی۔ اتنے میں گھر سے عنایت اللہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے حکم ہو تو نکالا جائے۔ میرزا صاحب نے مجھ سے فرمایا آؤ کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھالو کہاں اب اتنی دور جاؤ گے۔ میں ان کی محبت کے پیشِ نظر انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ انھوں نے عنایت سے کہا کہ بیگم صاحبہ سے کہو کہ کھانا نکلوائیں۔ ہم دونوں آرہے ہیں ادھر ملازم گیا ادھر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حد درجہ کمزور ہو گئے تھے لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ حالانکہ محل سرا دور نہ تھی۔ پچاس قدم کا فاصلہ نہیں ہوگا۔ لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے ان کی سانس پھول گئی، بہرحال جب تھوڑا آرام کر لیا تو دسترخوان پر بیٹھے۔ نوکر نے ان کے سامنے ایک پیالہ گوشت کے شوربے کا رکھا۔ میں نے دیکھا کہ خلاف معمول کسی چیز میں بھی چنے کی دال نہیں۔ میرزا صاحب بھی اس پر بہت حیران ہوئے۔ پوچھا کیوں بھئی، دال گھر میں نہیں تھی۔ تو بازار سے منگوالی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا میں منگوا دیتا۔ بیگم صاحبہ دوسرے دالان میں بیٹھی تھیں وہیں سے جواب دیا۔ نہیں دال تو گھر میں موجود ہے لیکن بہو، چنے کی دال نہیں کھاتی۔ اس لیے کسی چیز میں نہیں ڈالی گئی۔ خدا دے ایسا موقع میرزا صاحب کو، جھٹ سے بولے۔ واہ پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئی۔ ارے چنا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی اب اگر بہو، چنے کی دال نہیں کھاتیں تو یہ گویا خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ سب ہنسنے لگے۔ بیگم صاحبہ خفگی سے بولیں، بس انھیں تو باتیں بنانا آتی ہیں۔ بچاری بچّی ہے۔ ہوا کیا اگر وہ ایک چیز پسند نہیں کرتی تو اس کی مرضی۔ ٹھیکہ تھوڑی ہے کہ جی چاہے نہ چاہے ضرور کھائیے۔

زندگی کے آخری تین چار برس میں ان کی تندرستی بہت خراب ہو گئی تھی۔ دن دن بھر پڑے رہتے تھے کوئی بے تکلف کا ملنے والا آجاتا تو اٹھ کے بیٹھ جاتے ورنہ سارا وقت چارپائی پر لیٹے رہتے۔ گرمیوں میں دن بھر کوٹھری میں گزر جاتی اور رات کو دو آدمی اٹھا کر صحن میں لے آتے جاڑوں میں دن کے وقت دھوپ میں لیٹے رہتے۔ رات کو سونے کا کمرہ خوب آگ سے گرم کروا دیتے تھے۔ خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ صبح کی تبرید بدستور تھی۔ دوپہر کو صرف ایک پیالہ بھر

گوشت کا پانی۔ بوٹی۔ روٹی۔ چاول سب کچھ بالکل مفقود۔ سرِشام تولہ دو تولہ بھر شراب اسی قدر گلاب میں ملا کر پیتے تھے۔اور بس۔ دوستوں کے خط۔ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں دن کٹ جاتا۔ خود زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لکھتے تھے تو انگلیاں اکڑ جاتی تھیں، اور درد کرنے لگتی تھیں کوئی دوست آ جاتا تو اس سے خطوط کے جواب لکھوا لیتے تھے۔آپ بولتے جاتے تھے وہ لکھتا جاتا تھا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اب یہ چراغِ سحری ہیں۔ ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء کو وہ حسبِ معمول لیٹے ہوئے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تکلیف نہیں تھی لیکن ایک نیم غشی کی کیفیت ضرور تھی۔ ہوش میں آئے تو کلّو نے پوچھا کہ حضور کھانا لاؤں۔ بولے آج ہم کھانا میرزا جیون بیگ کے ساتھ کھائیں گے جاؤ اسے بلا لاؤ۔ اس سے اشارہ باقر علی خاں کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم کی طرف تھا انھیں میرزا پیار سے میرزا جیون بیگ یا جنیا بیگم کہا کرتے تھے۔ یہ اس وقت چار برس کی تھیں۔ کلّو انھیں بلانے کو محل سرا میں گیا۔ یہ سو رہی تھیں۔ بگا بیگم۔ ان کی والدہ نے کہا۔ ابھی کھیلتے کھیلتے سو گئی ہے۔ جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں۔ کلّو نے آ کے کہا کہ حضور وہ آرام کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ جگنے پہ بھیجدیں گی۔ یہ سن کر بولے اچھا تو جب وہ آئے گی۔ ہم اسی وقت کھانا کھائیں گے۔ اتنا کہہ کے تکیہ پر سر رکھا اور لیٹ گئے۔ لیٹنے کے ساتھ ہی بیہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع کی گئی۔ دونوں صاحبوں نے رائے دی کہ دماغ پہ فالج گرا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس جس نے سنا دوڑا آیا۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آٹھ پہر اسی بیہوشی میں گزرے۔ نہ طبیبوں کی کچھ پیش گئی نہ کسی اور کی۔ نہ دوا کارگر ہوئی، نہ دعا۔ اور ہوتی بھی کیسے، ان کا وقت آن لگا تھا۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ فروری کو دوپہر ڈھلے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

غلام رسول مہر

غالب کی خاندانی پنشن

میرزا غالب کے خاندانی احوال اور ذاتی سوانح کا ہر گوشہ پوری طرح روشنی میں آچکا ہے اور اب ان میں سے کسی چیز کو معرض بحث و تحریر میں لانا مفید مشغلہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس سلسلے میں بعض ایسی چیزیں شائع ہو چکی ہیں جن کو میرے محدود علم کے مطابق اب تک انتقاد کی میزان میں نہیں تولا گیا اس لیے ان کی حقیقی حیثیت واضح نہیں ہو سکی۔ ان میں ایک مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا ہے جو خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان کے متعلق اپریل ۱۹۳۱ء کے رسالہ "اردو" میں چھپا تھا۔

خواجہ امان میرزا غالب کے عزیزوں میں شمار ہوتے تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق ان کا اور میرزا غالب کا رشتہ دو تین پشت اوپر جا کر مل جاتا تھا اس لیے زیر غور مضمون میں مرزا کے اب وجد کا ذکر بھی آ گیا، نیز خاندانی پنشن کا مسئلہ بالکل نئے رنگ میں پیش ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ ان بیانات کی حیثیت کا اندازہ کر لینا چاہیے اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کے دعاوی درست ہیں تو میرزا غالب کے سوانح میں مناسب ترمیمات ضروری ہیں۔ اگر درست نہیں ہیں تو پھر ان کی نادرستی کے وجوہ سامنے آجانے چاہئیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دورِ حاضر کے جلیل القدر اصحابِ تحریر میں سے تھے ان کے رشحاتِ

قلم کو عام مضمون نگاروں کے بیانات کی طرح باآسانی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ارشادات

میں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ارشادات کو سہولتِ بحث کی غرض سے دو حصّوں میں بانٹ لیا ہے۔ ایک حصّہ خاندانی حالات کے متعلق اور دوسرا حصّہ پنشن کے متعلق۔ خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے۔

۱۔ مرزا غالب اور خواجہ امان کے اجداد سمرقند سے بدخشاں آئے۔ اس وقت اس خاندان میں دو بھائی رہ گئے تھے۔ بڑے کا نام ترسم خاں اور چھوٹے کا نام رستم خاں تھا۔

۲۔ ترسم خاں کی شادی بدخشاں ہی کے ایک امیر کے ہاں ہوگئی۔ ان کے ہاں تین اولادیں ہوئیں دو لڑکے نصراللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں۔ اور ایک لڑکی۔

۳۔ اس خاندان کو ذرا فراغت نصیب ہوگئی تھی کہ ترسم خاں کا وقت آ لگا اور وہ بدخشاں ہی میں فوت ہوگئے۔ بھائی کے مرنے کا رستم خاں کو کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ پھرتے پھرتے بخارا پہنچے اور وہیں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے خاندان میں شادی کرلی۔ اس شادی کی وجہ سے رستم خاں کے خاندان میں بہ لحاظ اعزاز، خواجگی کا خطاب آ گیا۔

۴۔ اس بیوی کے بطن سے صرف ایک لڑکا خواجہ قطب الدین خاں پیدا ہوا۔ رستم خاں کا انتقال ہوگیا۔ ننھیال میں قطب الدین کی پرورش ہوئی۔ جوان ہوکر شادی کی۔ ان کا لڑکا حاجی خاں تھا

۵۔ خواجہ حاجی خاں پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا کہ اس کے والدین بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جب یہ خبر ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو پہنچی تو وہ اپنے بھائی عبداللہ بیگ خاں کے ساتھ بخارا سے بدخشاں گئے۔ کچھ دنوں بھتیجے کے پاس رہے۔ پھر ہندوستان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ بدخشاں سے برلاس قوم کے ایک امیرزادے مرزا جیون بیگ سبزپوش بھی ساتھ ہوگئے۔

۶۔ پہلے یہ قافلہ اٹک میں ٹھہرا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لاہور میں رہے پھر دہلی پہنچے۔ اس زمانے میں شاہ عالم ثانی دہلی کا بادشاہ اور ذوالفقارالدولہ نجف خاں سلطنت کا وزیر تھا۔

۷۔ ان سب نے ملازمت کرلی۔ پرگنہ پہاسو مدد خرچ کے لیے ملا۔ پھر کسی بات پر نواب سے

پہنچ گئی۔ اور یہ نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے گئے۔

۸۔ اکبر آباد پہنچ کر مادھوجی سندھیا والیِ گوالیار کے نوکر ہو گئے۔ نصر اللہ بیگ خاں کمانڈر خواجہ حاجی خاں رسالدار اور مرزا جیون بیگ پلٹن کے کمیدان۔

۹۔ پھر مرہٹوں نے شکست کھائی۔ نجف خاں سے نصر اللہ بیگ خاں اور اس کے ساتھیوں کی صلح ہو گئی اور اول الذکر کی شادی نواب احمد بخش خاں کی ہمشیرہ سے ہوئی۔

۱۰۔ عبداللہ بیگ خاں مذہبی آدمی تھے۔ پھر اچانک گھر بار چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے ہاں ملازم رہے۔ بعد میں حیدر آباد چلے گئے۔ واپس آ کر راجہ بختاور سنگھ والی الور کی ملازمت میں گڑھی کے محاصرے میں کام آئے۔ اور راج گڑھ میں سپرد خاک ہوئے۔

غور طلب امور

ظاہر ہے کہ اگر ان ارشادات کو درست سمجھا جائے تو مرزا غالب کے ان بیانات کو غلط ماننا پڑے گا کہ ان کا دادا پہلے پہل ہندوستان آیا یا ان کے والد دہلی میں پیدا ہوئے یا نصر اللہ بیگ خاں ان کے چچا نہیں بلکہ تایا تھے۔

ہمیں یہاں مرزا غالب کے پشنگی افراسیابی اور سلجوقی ہونے کے متعلق بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ مرزا کا عقیدہ یہ تھا اس میں کلام نہیں، انھوں نے اپنے خاندان کے متعلق یہی سنا ہو گا لیکن محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی سلاطین انھی تورانیوں کی نسل کے تھے جن کی سطوت و شوکت کا افسانہ فردوسی نے شاہنامہ میں سنایا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نسب نامہ اس وقت بنایا گیا جب سلطان سنجر سلجوقی نے بغداد کے عباسی خلیفہ کی صاحبزادی سے نکاح کی خواہش کی تھی اور مقصد یہ تھا کہ سلجوقی خاندان کو قدیم و باجبروت تاجداروں کا خاندان دکھلایا جائے۔

ترسم خاں اور رستم خاں کے حقیقی بھائی ہونے کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مستند ذخیرۂ معلومات موجود نہیں۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ نصر اللہ بیگ خاں ترسم خاں کے بیٹے تھے اور بدخشاں میں پیدا ہوئے تو کئی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

لاینحل الجھنیں

مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل باتیں پیش نظر لائیے۔

۱۔ رستم خاں بھائی کی وفات سے اس درجہ متاثر و متألم ہوا کہ بدخشاں

کی سکونت ترک کرنے کے سوا اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی لیکن اسے یہ خیال نہ آیا کہ کم سن اور یتیم بچوں کا نگراں کون ہوگا۔

۲۔ بخارا پہنچ کر اس نے شادی کی جس سے ایک بچہ پیدا ہوا اور رستم خاں فوت ہوگیا پھر اس بچے نے جوان ہو کر شادی کی اور اس کے بیٹے خواجہ حاجی نے عالم وجود میں قدم رکھا۔ وہ جوانی کے قریب پہنچا تو اس کے باپ رستم خاں کے اکلوتے فرزند کا بھی انتقال ہوگیا۔ اگر یہ ساری مدت تیس برس بھی فرض کی جائے اور سمجھا جائے کہ رستم خاں کی علیحدگی کے وقت نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں علی الترتیب چار سال اور دو سال کے تھے تو خواجہ حاجی کے باپ کی وفات کے وقت ان کی عمریں چونتیس اور بتیس برس کی ہونی چاہئیں۔

۳۔ پھر وہ لوگ بدخشاں سے بخارا گئے۔ خواجہ حاجی کو ساتھ لے کر ہندوستان کا قصد کیا۔ پہلے اٹک بعدازاں لاہور ٹھہرے۔ اس وقت میر معین الملک عرف میر منو پنجاب کا گورنر تھا جس نے اخیر ۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔ گویا نصر اللہ بیگ اور عبداللہ بیگ کی ولادت ۱۷۱۷ء، ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ہوئی۔

۴۔ ۱۷۷۱ء کے بعد وہ دہلی پہنچ کر نجف خاں سے وابستہ ہوئے۔ جو ۱۷۷۲ء میں فوت ہوا۔ غرض میرزا غالب کی شادی جب اکبرآباد میں ہوئی تو ان کی عمر کم وبیش ۔، برس کی ہوگی اور غالب کی ولادت کے وقت انھیں کم از کم اسی برس کا ماننا پڑے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ان بدیہی نتائج کو مستحق قبول اور شایان تسلیم سمجھے گا۔

مرزا غالب کے بیانات

اس کے برعکس مرزا غالب کے بیانات بالکل واضح غیر مشتبہ اور ہر لحاظ سے قابل یقین ہیں۔

۱۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا دادا ہندوستان آیا تھا۔ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ باپ سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں "از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد" اگر اس کا نام ترسم خاں تھا تو وہ مرزا کے دادا کے وقت تک زندہ تھا۔

۲۔ خود مرزا کے بیان کے مطابق ان کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ: دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے (نہ کہ بخارا یا بدخشاں سے) دہلی آیا۔ پچاس گھوڑے

اور نقارہ و نشان سے پادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو پرگنہ جو سمرو بیگم کی سرکار سے ملا ہوا تھا وہ اس کی جائیداد مقرر ہوا۔"

۳۔ پھر خواجہ حالی مرحوم کا بیان ہے کہ غالب کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ان کی دو بہنیں متعدد اولادیں تھیں۔ مرزا غالب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔

۴۔ میرزا کا بیان ہے کہ ان کے والد دہلی میں پیدا ہوئے "پدرم عبداللہ خاں بہ شاہجہاں آباد بوجود آمد و من بہ اکبر آباد۔"

یہی بیانات معیارِ صحت پر پورے اترتے ہیں۔ چونکہ والد کی وفات کے وقت میرزا کی عمر زیادہ سے زیادہ چار برس کی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی دو برس کے تھے اور بہن آٹھ دس برس کی ہوگی۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ عبداللہ بیگ جوانی کے عالم میں فوت ہوئے۔

اب اس امر پر غور کیجیے کہ نصراللہ بیگ، عبداللہ بیگ خاں سے بڑے تھے یا چھوٹے تو اس بارے میں بھی ابتدا سے کبھی کوئی اختلاف نہیں کیا گیا۔ سب نصراللہ بیگ خاں کو مرزا کا تایا نہیں چچا ہی سمجھتے رہے اور خود میرزا نے بھی لکھا ہے "کا بیش پنج سال بعد گزشتنِ برادر، پے، مہیں برادر برداشت و مرا در یں خرابہ تنہا گزاشت۔"

خواجہ حاجی کا معاملہ

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ آیا خواجہ حاجی خاں اور مرزا غالب کا خاندان ایک تھا؟ اگر خواجہ حاجی رستم خاں کا پوتا تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ رستم خاں ترسم خاں کا بھائی نہ تھا وہ مرزا قوقان بیگ خاں کا بھائی ہوگا اگر ترسم خاں اور رستم خاں ناموں کے ہم صورت ہونے کے باعث بھائی فرض کیے جائیں تو خواجہ حاجی کے سلسلۂ نسب میں کم از کم ایک کڑی کا اضافہ ضروری ہے۔

نیز سمجھ لینا چاہیے کہ خواجہ حاجی، مرزا غالب کے دادا کے ساتھ ہندوستان نہیں آیا تھا بلکہ کم از کم چالیس برس کی عمر کے بعد آیا۔

ہمیں اوپر کے سلسلۂ نسب کے متعلق یقینی معلومات حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مرزا غالب کی ہمشیر کی شادی مرزا جیون بیگ برلاس کے فرزند، مرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ اور مرزا جیون بیگ

کی صاحبزادی امیرالنسا بیگم خواجہ حاجی سے بیاہی گئی۔ اس طرح مرزا غالبؔ، مرزا جیون بیگ اور خواجہ حاجی کے خاندانوں میں رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس سے پیشتر کے تعلق کا ہمارے سامنے کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مرزا غالبؔ کی ہمشیر نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد بیاہی گئی۔ جب کہ اس خاندان کا دورِ ریاست و جاگیرداری ختم ہو چکا تھا اور وہ محض وظیفہ خوار رہ گیا تھا

خواجہ حاجی خاں کون تھا؟

مرزا غالب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کے ساتھ کوئی قریبی خاندانی تعلق پہلے سے موجود نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ خواجہ حاجی پسرِ بارگیر (سائیس)، جدِ من و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و از سہ پشت نمک خوارِ من۔

۲۔ فلاں بیگ (اشارہ ہے مرزا افضل بیگ ابن مرزا جیون بیگ کی طرف جو شاہ دہلی کی طرف سے کلکتے میں وکیل تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق انھیں مقرب الدولہ، معزز الملک دلاور جنگ کے خطابات حاصل تھے) و شوہر خواہرش (خواجہ حاجی) ہر دو در رسالہ نصراللہ بیگ بے چارہ نوکر بودند۔ اینہا از سہ پشت نمک پروردۂ آبائے من اند و آں کا فرِ غدار (خواجہ حاجی) پس از مردنِ عمِ من پراگندہ چندرا کہ فلاں بیگ ہمزآناں بود با خود گرد کردہ نقد و جنس و اسپ و فیل و خیمہ و خرگاہِ عمِ مرا پاک خورد۔

۳۔ حاجی فلاں بہ خاندان نصراللہ بیگ آں کردہ است کہ یزید بہ آلِ رسولؐ۔ تنہا من نے گویم، عالمے گواہِ ایں دعویٰ است۔ از دہلی تا اکبرآباد صد ہزار کس دریں جزوِ زماں موجود اند کہ می دانند آنچہ کہ من می گویم۔

۴۔ خواجہ حاجی را۔ خواجہ حاجی خاں مرحوم بہ کدام تمسک و کدام علاقہ تواں گفت۔ احمد بخش خاں آں کہ برائے خواجہ حاجی پدری کرد و اورا از ناکسی بہ کسی رسانید۔ پیوستہ خواجہ حاجی نوشت و خواجہ حاجی گفت۔

حقیقت کا سراغ

ان بیانات میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے جو مقدمے کی کشمکش کے باعث پیدا ہوئی۔ لیکن خواجہ حاجی اور مرزا غالب کا نسبی تعلق ثابت ہونے کے بجائے زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ جوشِ عداوت مسلّم مان لینے کے باوجود یہ بات قیاس میں نہیں آ سکتی کہ مرزا نے دانستہ خاندان کے رشتے کو یوں بے تکلفی سے نظرانداز کر دیا ہو۔ ان میں سے

ہنری بیان (۴) اُس خط سے ماخوذ ہے جو مرزا احمد بیگ خاں تپاں کو لکھا گیا تھا اور وہ نواب احمد بخش مرحوم کے نسبتی بھائی یعنی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے ماموں تھے چونکہ نواب احمد بخش خاں کے ہم خاندان تھے. اس لیے مرزا غالب اور خواجہ حاجی خاں کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں گے. یقین نہیں آسکتا کہ مرزا غالب نے ان کی زبان سے اپنے ایک ہم جد کے نام کے ساتھ "خان" کا لفظ سن کر بے وجہ تردید کی جرأت کی ہو. ان حالات میں میرا اندازہ یہی ہے کہ خواجہ حاجی اور مرزا غالب کا خاندان ایک نہ تھا یا اگر ان میں کوئی تعلق ہوگا تو بعید سا ہوگا. البتہ یہ درست ہے کہ جب جھگڑے مٹ گئے. پنشن کے مقدمے کا فیصلہ مرزا غالب کے خلاف صادر ہو گیا تو خواجہ حاجی کے بیٹے بدرالدین اماآن کے ساتھ ربط وضبط نئے سرے سے پیدا ہو گیا. اور مرزا انھیں اپنا بھتیجا کہنے لگے.

پنشن کا معاملہ پنشن کے سلسلے میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱. بھرت پور سے صلح کے بعد اپریل ۱۸۰۵ء کو جدید بھرتی کی ہوئی فوج توڑ دی گئی. اس میں مرزا نصراللہ بیگ خاں کی فوج بھی موقوف ہو گئی لیکن مرزا اور ان کے خاندان والوں کو جن میں خواجہ حاجی بھی شامل تھا. پانچ ہزار روپے سالانہ کے دو پرگنے سونگ سونا (کذا فی الاصل) اور پونا ہانہ مضافات ہوڈل تحصیل فیروزپور جھرکہ میں بطور جاگیر عطا ہوئے.

۲. ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں نصراللہ بیگ خاں نے وفات پائی. ان کے بعد خواجہ حاجی نے جو خاندان میں سب سے بڑے تھے. جاگیر کا دعویٰ کیا. نواب احمد بخش خاں نے ستہادت دی. اور جاگیر اس شرط پر خواجہ حاجی کے نام بحال ہوئی کہ نصراللہ خاں کے پس ماندوں کی پرورش بھی کی جائے.

۳. نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی خاں سے کہا کہ آپ کا علاقہ میرے علاقے سے ملا ہوا ہے اور آپ کو مال گزاری وصول کرنے میں مشکلیں پیش آتی ہیں بہتر یہ ہے کہ علاقہ میرے سپرد کر دو میں اس کی آمدنی پہنچا دیا کروں گا.

۴. قرار پایا کہ ان پرگنوں کی آمدنی میں سے تین ہزار روپے سالانہ مرزا نصراللہ بیگ

کے پس ماندوں کو اور دو ہزار روپے خواجہ حاجی خاں کو ملیں۔

۵۔ خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ ان کی معاش ان کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان کو ملی۔ مرزا غالب کو خیال پیدا ہوا کہ سرکار نے جو پرگنے دیے تھے وہ دس ہزار سالانہ کے تھے اور صرف ان کے چچا نصراللہ بیگ کو دیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے اپنے دونوں عزیزوں (خواجہ جان اور خواجہ امان) پر دعویٰ دائر کر دیا۔

۶۔ کول بروک ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ انگریزی نے مرزا غالب کے موافق رپورٹ کی لیکن گورنر جنرل نے یہ تصفیہ کیا کہ یہ سند سر جان میلکم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اس زمانے میں لارڈ لیک کے سکریٹری تھے اور اس کے متعلق نواب احمد بخش خاں کی شہادت ہونی ضرور ہے چنانچہ نواب کی شہادت ہوئی اور فیصلہ مرزا غالب کے خلاف ہوا۔

۷۔ نواب احمد بخش کی وفات پر ان کے فرزند نواب شمس الدین احمد خاں کو بہ سلسلۂ قتلِ فریزر پھانسی کی سزا ملی اور ریاست ضبط ہو گئی تو خواجہ جان اور خواجہ امان کے نام پچاس پچاس روپیہ ماہانہ اور ان کی والدہ کے نام بیس روپے ماہانہ کا وظیفہ جاری ہوا۔

اصلیت کیا تھی؟

لیکن یہ پوری داستان معلوم و مسلّم واقعات کے سراسر خلاف ہے مثلاً: ۱۔ نصراللہ بیگ خاں کو سونکھ (SONEKH) اور سونسا (SONSA) جاگیر میں ملے تھے۔ اور ان کی آمدنی مرزا غالب کے قول کے مطابق لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ جب انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ضلع متھرا پر قبضہ کیا تو سونسا جنرل پرن (PERRON) کی جاگیر میں تھا جو سندھیا کی فوج میں ملازم تھا۔ اس وقت صرف سونسا کی آمدنی کا اندازہ بیس ہزار روپے تھا (ملاحظہ ہو متھرا گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۶)

۲۔ سونکھ اور سونسا تحصیل متھرا میں بھرت پور کی ریاست سے متصل واقع ہیں۔ متھرا سے ایک سڑک دیگ کو اور دوسری بھرت پور کو جاتی ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیان یہ پرگنے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں فیروز پور جھرکہ سے متصل کیوں کر مانا جائے۔

۳۔ پونا ہانہ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل تھا جیسا کہ اس جاگیر کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ضلع گوڑگاؤں کے گزیٹیر (صفحہ ۲۴) میں بھی یہی مرقوم ہے اس کے علاوہ نواب

احمد بخش خاں کو سانگرس، بچھور اور نگینہ کے پرگنے دیے گئے تھے۔

۴۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ نواب فیروز پور جھرکہ اور سانگرس کے لیے سالانہ پانچ ہزار، پونا ہانہ، بچھور، اور نگینہ کے لیے سالانہ بیس ہزار سرکار انگلشیہ کو دیا کریں۔

۵۔ نصراللہ بیگ کے انتقال کے ساتھ ہی سونکھ سونسا کی جاگیر انگریزوں نے سنبھال لی ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کے پچیس ہزار روپے اس شرط پر معاف کر دیے کہ وہ دس ہزار روپے نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کو دیں، مرحوم کے رسالے کے پچاس سواروں کو جن کا افسر خواجہ حاجی تھا اپنے انتظام میں لے لیں اور قیام امن کے لیے حکومت سے کوئی امداد نہ مانگیں۔

۶۔ ایک مہینہ تین دن بعد یعنی ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور حکم حاصل کر لیا جس کا مضمون یہ تھا کہ پانچ ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کو دیے جائیں اور ان میں خواجہ حاجی بھی شامل ہوگا۔

مرزا غالب کا دعویٰ

نصراللہ بیگ خاں کا انتقال یقیناً ۴ مئی ۱۸۰۶ء سے پہلے ہوا۔ خواجہ حاجی اگر اس مرحوم کی جاگیر کا دعویٰ کر سکتا تھا تو سونکھ اور سونسا کے لیے کر سکتا تھا جو نواب احمد بخش خاں کی جاگیر سے متصل نہ تھی لیکن ایسا کوئی دعویٰ ہمارے سامنے نہیں۔ ۴ مئی ۱۸۰۶ء اور ۷ جون ۱۸۰۶ء کے درمیان اگر کوئی دعویٰ پیش ہوا تو اس کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ۴ مئی والے حکم میں نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کے لیے دس ہزار روپے مقرر ہوئے تھے اور خواجہ حاجی کے پچاس سواروں کو نواب سے متعلق کر دیا گیا تھا، جون کے حکم کی رو سے دس ہزار کی رقم گھٹا کر آدھی کر دی گئی اور خواجہ حاجی کو نصراللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کر دیا گیا۔

۱۸۲۲ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہوا فیروز پور جھرکہ کی ریاست نواب احمد بخش خاں نے اپنے فرزند شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دی اور خود قطب صاحب میں اپنے مرشد حضرت مولانا فخرالدین فخر عالم کے پاس مشغولِ ذکر و عبادت ہو گئے۔ اس وقت مرزا غالب کو پنشن کے لیے مقدمے کا خیال آیا اور وہ دہلی سے کلکتہ گئے۔ راستے ہی میں تھے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مقدمہ کلکتہ میں دائر ہوا اور مدعا علیہ والیِ فیروز پور تھا۔ خواجہ حاجی کے بیٹوں پر نہ دعویٰ کیا گیا اور نہ ان سے مرزا غالب کو براہِ راست سروکار تھا۔ دعویٰ یہ تھا کہ والیِ فیروز پور نے پہلے منظور شدہ

حکم کے خلاف پنشن کی رقم آدھی کردی. پھر اس آدھی میں خواجہ حاجی کو شامل کرلیا. ان دونوں باتوں کا ذمہ دار والیٔ فیروزپور تھا نہ کہ خواجہ حاجی اور اس کے فرزند۔

گواہوں کا معاملہ اس سلسلے میں احمد بخش خاں سے شہادت لینے کا معاملہ ناقابلِ فہم ہے جب تک وہ زندہ تھا مقدمہ پیش ہی نہیں ہوا تھا اور جب مقدمہ پیش ہوا گواہوں کی ضرورت پڑی اس وقت تک نواب احمد بخش جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ چکے تھے۔

کول بروک نے مرزا غالب کے حق میں رپورٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بلا کا رشوت خور تھا اور مقدمہ پیش ہونے سے پہلے ہی موقوف ہوگیا. اینڈریو اسٹرلنگ مرزا کے حق میں رپورٹ کرنے سے پیشتر ہی فوت ہوگیا، سر جان میلکم سے صرف یہ پوچھا گیا تھا کہ ۷ر جون ۱۸۰۶ء والا حکم، جسے مرزا غالبؔ جعلی قرار دے رہے تھے، لارڈ لیک کے مہر و دستخط سے جاری ہوا یا نہیں ؟ میلکم نے گواہی دی کہ اس پر مہر اور دستخط لارڈ لیک کے ہیں. گویا حکم جعلی نہیں، لیکن مرزا غالبؔ کے دعوے کی بنا محض یہ نہ تھی کہ یہ حکم جعلی ہے بلکہ اصل بنا یہ تھی کہ پہلا حکم (دس ہزار والا) سرکار کی منظوری سے جاری ہوا اور اس کی نقل دفتر میں موجود ہے. لیکن ۷ر جون والا حکم نہ سرکار کی منظوری سے جاری ہوا. نہ اس کی نقل دفتر میں موجود ہے لہٰذا اسے منسوخ کیا جائے، آئندہ دس ہزار روپے سالانہ ملا کریں. اور مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر جتنی رقم کم ادا ہوئی وہ یک مشت دی جائے۔

مزید سوالات پھر اس سلسلے میں بعض اور باتیں بھی غور طلب ہیں. اگر نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد خواجہ حاجی خاندان میں سب سے بڑا رہ گیا تھا اور مزعوم جاگیر اس کے نام بحال ہوئی تھی. تو کیا وجہ تھی کہ پانچ ہزار میں سے اس نے صرف دو ہزار لیے اور تین ہزار نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندوں کو دے دیے؟ اگر وہ واقعی خاندان کا سرخیل اور اس وجہ سے جاگیر اپنے نام بحال کرانے کا حق دار تھا تو یا تو پوری رقم خود لے کر سارے خاندان کے افراد و طبقات کے گزارے کا ذمہ اٹھاتا یا بڑا حصہ خود لیتا اور کمتر دوسروں کے حوالے کرتا۔

نیز کیا وجہ ہے کہ اس کی وفات پر دو ہزار روپے اس کے پس ماندوں کو نہ ملے اور صرف ۱۲۰ روپے اس کے دو بیٹوں اور بیوی کو دیے گئے؟ اگر اصل جاگیر اس کے نام تھی تو محض اسی کے حصے میں کیوں ایک دم ایک ہزار آٹھ سو اسی کی کمی ہوگئی. جب کہ نصراللہ بیگ کے حقیقی متعلقین کی رقم بدستور باقی رہی؟

بہرحال واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کو مرزا کے ہم جد ہونے پر بھی نصراللہ بیگ کے پس ماندوں میں شامل کرنا غلط تھا اسے دو ہزار روپے صرف اس وقت تک ملتے رہے جب تک پچاس سوار نواب احمد بخش خاں کی ملازمت میں تھے جب وہ فوت ہوا، سوار الگ ہوئے تو تنخواہ بھی جاتی رہی۔ نصراللہ بیگ کے حقیقی پس ماندوں کا وظیفہ کسی خدمت پر موقوف نہ تھا اس لیے اس میں کوئی قطع و برید نہ ہوئی۔

مخالفوں کا زور و اثر

بلاشبہ نواب احمد بخش خاں مرحوم نے مرزا غالب کے خاندانی وظیفے میں کمی کرائی۔ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کیا کچھ کہہ کر لارڈ لیک سے دوسرا حکم جاری کرایا۔ اور کس بنا پر خواجہ حاجی کو نصراللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کیا!

یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرزا غالب کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ذی وسائل تھے۔ وہ انگریز ریزیڈنٹوں پر اثر ڈال سکتے تھے۔ مرزا افضل بیگ کلکتہ میں شاہ دہلی کا وکیل تھا۔ اور نواب شمس الدین خاں کے بے نہیں لیکن اپنے بھانجوں (ابنار خواجہ حاجی) کے لیے تمام ممکن تدبیریں کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ مرزا غالب کے خلاف "جامِ جہاں نما" (کلکتہ) میں کوئی تحریر شائع کرادی۔ چنانچہ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> "امروز تازہ حالے بہ مشاہدۂ اوراقِ "جامِ جہاں نما" روئے داده کہ جز برآں بے آبروئی نتوانستم کرد۔ غالب کہ شما ہم درآں اوراق نگرستہ باشید۔ واللہ، باللہ، ثم تاللہ، آنچہ از حالِ منِ مسکین درآں ورق مندرج است ہمہ کذب بہتان وگزاف است"

صرف طلب حق

مرزا نے مقدمہ اس لیے دائر کیا تھا کہ اپنا حق حاصل کریں اور وہ ضرورت مند بھی تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

> من مردِ حق جوے حق پرستم، راست می گویم، وحق می جویم نہ عدوے شمس الدین خاں صاحبم ونہ دشمنِ خواجہ حاجی و پسرانش، شمس الدین خاں برادرِ زنِ من است و خواجہ

حاجی پسر بارگیر جدِ من و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و
از سہ پشت نمک خوارِ من. از احمد بخش خاں کہ برادرِ زنِ
عمِ من (نصر اللہ بیگ) و برادرِ پدرِ زنِ من (الہٰی بخش خاں
معروف) بود، دو شکایت داشتم و دارم، یکے تقلیلِ مقدار
وجہِ پرورش بے وقوعِ جرم و گناہ، دوم شمولِ خواجہ حاجی
بے ثبوتِ وجہِ استحقاق"۔

ان امور میں شبہہ کی قطعاً گنجائش نہیں اور مرزا فرحت اللہ بیگ نے غالب کے خاندانی حالات، پنشن کے معاملات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے نزدیک نہ درست ہے اور نہ قابلِ قبول واللہ اعلم بالصواب۔

(۲۰ مارچ ۱۹۴۹ء)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

روئداد مقدمۂ مرزا غالبؔ

غدر کے بعد دلّی میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا، مرزا نے فارسی لغت کی مشہور کتاب ' برہان قاطع ' کو دیکھنا شروع کیا، اس کے مؤلف محمد حسین کے اجداد تبریز سے آئے تھے اور اگرچہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دکن میں رہے مگر ' تبریزی ' کہلاتے تھے۔

مرزا کو اس کتاب میں غلطیاں نظر آئیں جنھیں انھوں نے ایک مختصر کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام ' قاطعِ برہان ' رکھا۔ چنانچہ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

> " اس درماندگی کے دنوں میں ' برہانِ قاطع ' میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزار ہا لغت غلط، ہزار ہا بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادرہوا۔ میں نے سودو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور ' قاطعِ برہان ' اس کا نام رکھا ہے "

یہ کتاب بہ قول مولانا حالی ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں پہلی بار اور ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں بہ اضافۂ دیگر مضامین و فوائد ' درفشِ کاویانی ' کے نام سے دوبارہ چھپی۔

اس پر مرزا کی بڑی مخالفت ہوئی اور جواب میں "محرقِ قاطع" "ساطعِ برہان" "قاطعِ قاطع" اور "مویدِ برہان" کتابیں لکھی گئیں۔

"ساطعِ برہان" کے جواب میں "نامۂ غالب" اور "مویدِ برہان" کے جواب میں "تیغِ تیز" خود مرزا نے دو رسالے لکھے اور "محرقِ قاطع" کے جواب میں "دافعِ ہذیان" "لطائفِ غیبی" اور "سوالاتِ عبدالکریم" تین رسالے مرزا کے دوستوں نے شائع کیے مگر "قاطعِ قاطع" کا جواب نہ خود مرزا نے لکھا اور نہ کسی اور نے خواجہ حالی نے اس سے متعلق "یادگارِ غالب" میں ایک لطیفہ لکھا ہے: فرماتے ہیں۔

"مولوی امین الدین کی کتاب "قاطعِ قاطع" کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا "حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا"؟ مرزا نے کہا "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"

"تیغِ تیز" میں بھی مرزا نے لکھا ہے کہ ایسے ادنیٰ درجے کے آدمی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا میری شان کے خلاف ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر وہ اس خیال پر قائم نہ رہے، بلکہ انھوں نے مولوی امین الدین پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش کر دی اور ۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کو عرضی دعوے داخلِ عدالت کر دیا۔ خواجہ حالی اس مقدمہ کے متعلق "یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں:

"مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جو "قاطعِ برہان" کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدعی نے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع

فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے، یا نہیں ؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو، ان مولوی کا مرزا سے ملنا جلنا تھا، کسی نے پوچھا: حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی ؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

بہ ہر چہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیارِ بے کسیِ من شرافتِ نسبی است"

اس مقدمے کی پوری مسل کی نقل اب اتفاق سے ہمیں دستیاب ہوگئی ہے اور ذیل میں تمام و کمال شائع کی جارہی ہے۔ اس کے مطالعے سے اس مقدمے کے تمام حالات بہ خوبی واضح ہوجاتے ہیں۔ اس مقدمے کے دوران میں مولوی ضیاء الدین کی پیشی کے وقت کسی نے حاکمِ عدالت کے کان میں کہہ دیا کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیے" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے میں دہلی سے جو انگریزی اخبار "مفصلائٹ" نکلتا تھا اس میں ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو ایک خط چھپا تھا جس کا مکتوب نگار بڑے تعجب سے لکھتا ہے۔

"میں سخت حیران و پریشان ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی۔ اس رعایت سے غالب کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں۔ لیفٹننٹ گورنر کے دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا تھا۔

یہ پورا انگریزی خط رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۳۹ء کے پرچے میں ہم شائع کر چکے ہیں۔ اس علمی مناقشے کا بدترین مرحلہ یہی مقدمہ تھا۔ اس کی مسل مل جانے سے مقدمے کی پوری کیفیت صحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مسودے کی عبارت اکثر جگہ گنجلک ہے۔ دو چار مقام پر ایک آدھ لفظ پڑھا نہیں گیا، اس کے

متعلق فٹ نوٹ میں حسبِ ضرورت صراحت کردی ہے، اور جہاں شبہ رہا وہاں قوسین میں سوالیہ (؟) علامت بنادی ہے۔]

پیش گاہ صاحب ایں سررشتہ

چونکہ مقدمہ جات فوجداری نمبری مسٹر اشاکڈن صاحب پیش ہوتے ہیں یہ مقدمہ انہی صاحب بہادر کے اجلاس میں پیش ہوگا، اور صاحب عزت وغیرہ کو بحال شدہ صاحب بخوبی جانتے ہیں، یہ خط بخدمت اشاکڈن صاحب بہادر پیش ہووے۔

۲ دسمبر ۱۸۶۷ء

صاحب والا مناقب عالی شان سرچشمہ لطف واحسان جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی دام اقبالہٗ۔

بعد عرضِ مدارجِ تعظیم و تسلیم گزارش کرتا ہوں کہ مجھے ایک شخص پر ازالہٗ حیثیت عرفی کی دانش کرنی منظور ہے۔ اس واسطے اگرچہ میرے مدارجِ عزت آپ کو خوب معلوم ہیں لیکن چونکہ اس دعوے کے بیان میں کچھ بیان اپنی عزت کا ضرور ہے لہٰذا عرض کیا جاتا ہے کہ میں قوم کا ترک ہوں، دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ اور چچا بہ ضعف سلطنت مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر سرکاری عمل داری[۱] سے پہلے ایک لڑائی میں مارا گیا۔ حقیقی چچا میرا نصراللہ بیگ خاں بہادر جرنیل لیک بہادر کا رفیق مع چار سو سواروں کے سرکشانِ ہند کی لڑائیوں میں شریک رہا۔ چار سو سوار کا بریگیڈیر اور لاکھ روپے کے پرگنے کا جاگیر دار تھا۔ جرنیل صاحب کے سامنے بہ مرگِ ناگاہ مرگیا۔ جاگیر موافق قرارداد سرکار میں بازیافت ہوئی اور میرے واسطے بہ عوض جاگیر کچھ نقدی سرکار سے مقرر ہوگئی۔

---

[۱] یہ لفظ نہیں پڑھا گیا

[۲] یعنی دہلی میں انگریزی عمل داری سے پہلے

پس میں رئیس زادہ بہ عوض جاگیر نقدی پانے والا ہوں۔ جاگیرداروں کے بعد میرا نمبر ہے اور باقی آپ کے دفتر سے لے کر دلّی کی کمشنری اور لاہور کی لیفٹنٹ گورنری، کلکتے کے گورنر جرنیل بہادر کے دفتر تک میرے مدارج عزّت بہ خوبی ثابت ہیں۔ ایک شخص امین الدین نام دلی کا رہنے والا کہ اب وہ پٹیالے میں راجہ کے مدرسے کا مدرس ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی، اگرچہ بنا کتاب کی بحث علمی پر ہے لیکن اس نے اس بحث علمی میں میرے واسطے وہ الفاظ ناشائستہ لکھے اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص کولی چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے، اور ایسی گالیاں نہ دے گا، ناچار میں نے منشی عزیزالدین صاحب کو اس مقدمے میں اپنا وکیل کیا ہے۔ امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سررشتۂ فوجداری میں یہ مقدمہ پیش ہو اور خاص آپ کی تجویز سے اول سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو اور کسی محکمہ ماتحت میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو۔ فقط۔

راقم اسداللہ خاں غالب

مرقوم دوم دسمبر ۱۸۶۷ء

اسداللہ خاں

زیر پیش گاہ مسٹر اسٹاکڈن صاحب اسٹنٹ کمشنر بہادر

منشی وزیر علی۔ دیبی پرشاد گواہان حاشیہ نے جانب مقر سے شہادت سامنے ہو کر باقرار صالح مضمون مختار نامہ کو تصدیق کرایا۔ لہٰذا تصدیق مختار نامہ عمل میں آئی۔

مورخہ ۹ اپریل

العبـــــــــد

جوالا ناتھ شرف　　　　جائے دستخط

جو مجھ کو بہ نام امین الدین ساکن دہلی، مدرس مدرسہ پٹیالہ بابت ازالۂ حیثیت حسب دفعہ ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیرات ہند بہ صیغۂ فوجداری نالش کرنی منظور ہے، لہٰذا میں نے اپنی طرف سے عزیزالدین وکیل سررشتہ کو واسطے گزارنے عرضی اور پیروی کرنے مقدمے کے وکیل کیا۔ وکیل مذکور جو کچھ سوال و جواب پیروی

مقدمۂ ہذا میں کرے جملہ ساختہ پرداختہ اس کا مثل ذات خاص اپنی کے قبول و منظور ہے، اس واسطے یہ یہ مختار نامہ لکھ دیا گیا۔

گواہ شد	العبد	گواہ شد
دیبی پرشاد	محمد اسد اللہ خاں	منشی وزیر علی

المرقوم چہار دہم دسمبر ۱۸۶۷ء

آج وکیل نے کتاب پیش کی، حکم ہے کہ یہ کاغذات بروز سوموار کے پیش ہوں اور وکیل مدعی انگریزی میں ترجمہ ان الفاظ کا مع اس عبارت کے جہاں یہ الفاظ واقع ہوئے ہیں، کراکر پیش کرے، اور مقدمہ درج رجسٹر کیا جائے۔

۱۲ دسمبر ۱۸۶۷ء
دستخط حاکم

حکم ہے کہ
مختار نامہ تصدیق کیا جاوے اور وکیل پہلے کتاب پیش کرے

۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء

جناب عالی

جو حال عزت و اقتدار میرے موکل کا گورنمنٹ میں ہے، اس کی تصریح دفاتر سرکاری اور آمد خطوط اور چٹھیاں حکام، خصوص سکریٹری گورنمنٹ پنجاب و نواب گورنر جرنیل بہادر کشور ہند سے بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ مسمی امین الدین ساکن دہلی، حال مدرس پٹیالہ نے ایک کتاب قاطع القاطع[2] ... بہ

---

[1] بظاہر یہاں چاردہم نہیں، بلکہ چہارم ہونا چاہیے اس لیے کہ ۴ کو چٹھی لکھی ہے کو مختار نامے پر دستخط کیے، ۹ کو مختار نامہ تصدیق ہوا، ۱۲ کو تاریخ پیشی مقرر ہوئی۔ یہ امر بداہتہً نا قابل قبول ہے کہ ۹ کو مختار نامہ تصدیق ہوا اور ۱۴ کو غالب نے وکالت نامے پر دستخط ثبت کیے۔

[2] یہاں سے غالباً مندرجۂ ذیل الفاظ غائب ہیں۔ "بہ جواب قاطع"

بریان مصنفۂ موکلم تصنیف کی، اس میں ایسے الفاظ ناشایستہ بلکہ دشنام مغلظ نسبت موکلم تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا ہے کہ جس سے نیکنامی کو نقصان پہنچنے کا باعث ہوا، اور ازالۂ حیثیت کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند میں درج ہے، وقوع میں آوے، پس مدعاعلیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جس کی سزا تعزیرات ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے، لہٰذا امیدوار ہوں کہ بعد تحقیقات معروضۂ فدوی کے مدعاعلیہ کو سزا مندرجۂ دفعات مذکورہ فرمائی جاوے کہ آئندہ عزت داران سرکار کا کوئی مزیلِ حیثیت کا نہ ہووے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تفصیل ان الفاظ مندرجۂ مشتہرۂ کتاب کہ جس سے ازالہ حیثیت کا ہوا، وہ مع نمبر صفحہ:

نمبر صفحہ	الفاظ مزیلۂ حیثیت
۱۳	بایں بےچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است
۱۴	پیشِ حاکمِ وقت رفتہ زخمِ نہانیِ خویش وانماید
۲۳	ایں خرعیسیٰ نمذین را برپشتِ خود نہادہ است
۲۳	بہ دشنام پردازم
۲۸	میانِ خونِ حیض غوطہ خورد
۱۷، ۴۲	کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخر بہ کار بردہ
۱۸، ۱۹، ۴۲	سیلی وگردنی ہا را برائے او بنیاد نہند
۵۱	فصد باید کشاد تا جوشش فرو گردد
۱۸، ۶۱	ایں خبطی
۲۰، ۶۲	از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دہلی رسیدہ است
”	معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است

علاوہ اس کے اور بہت جگہ ایسے الفاظ ہیں، ملاحظۂ کتاب سے واضح رائے عالی ہوں گے۔

عرضی

کمترین عزیز الدین وکیل اسد اللہ خاں پنشن دار سرکاری
عرف مرزا نوشہ معروضہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء

یہ ممکن نہیں۔ ۲۴ جنوری ۱۸۶۸ء
دستخط

صاحب والامناقب عالی شان سرچشمۂ لطف واحسان جناب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی زادشوکتہٗ
بعد تنظیم و تکریم و اظہار آرزوئے مواصلت کثیر الافادت التماس یہ ہے کہ تخمیناً تیسرا مہینہ ہے
کہ میں نے بہ وکالت منشی عزیز الدین صاحب کے عدالت فوجداری ازالۂ حیثیت پیش کیا، وکالت نامہ
تصدیق ہوگیا، اور میرا خط مع وکیل کے حضور میں گزرا، اور آپ نے وہ مقدمہ تجویز کے واسطے
صاحب والا قدر اسٹاکٹن صاحب بہادر کے سپرد کیا۔ میری خوشی تو اس میں تھی کہ وہ مقدمہ
آپ تجویز کرتے۔ اب بصد گونہ عجز و زاری استدعا کرتا ہوں کہ کاغذات مقدمہ وہاں سے
منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ امین الدین مدعاعلیہ کی طلبی کا حکم
ٹپیالہ کو جائے اور بعد اس کے حاضر ہونے کے بہ مواجہ اس کے اور میرے وکیل کے مقدمہ
تجویز ہوکر میری دادرسی ہو اور مدعاعلیہ کو سخت سزا ملے۔ تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی
کو ایسے کلمات فحش و ناسزا نہ لکھے، مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے اس تابع دار قدیم کی عرضی قبول
کریں گے اور بہ ذات خود میری دادرسی فرمائیں گے۔ فقط

راقم اسد اللہ غالب
۲۴ جنوری ۱۸۶۸ء

جو کہ ہماری تبدیلی اس ضلع سے ہوگئی۔
حکم ہوتا ہے کہ
میرے بعد بہ حضور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر پیش ہووے

۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء

دستخط

از پیش گاہ مسٹر اوبرین صاحب بہادر

حکم ہوا کہ

پرسوں کے واسطے مدعا علیہ بہ اجرائے سمن طلب ہووے۔ فقط

۵ فروری ۱۸۶۸ء

عرضی مولوی امین الدین مدعا علیہ کی بیچ مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی مرزا اسد اللہ خاں غالب مدعی کے معروضہ تاریخ ۸ ماہ فروری ۱۸۶۸ء [اس کی نقل کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس واسطے نہیں کی گئی]

اطلاع نامہ بنام مولوی امین الدین [اس کی نقل نہیں کی گئی]

اظہار وکیل مدعی

نام میرا عزیز الدین، وکیل مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ

"قاطع القاطع" میں امین الدین نے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ "صاحب برہان بایں بیچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است"، بار دیگر صفحہ مذکور میں ہے "پیشِ حاکمِ وقت رفتہ زخمِ پنہانیِ خویش وانماید، تا فریادش کارگر آید" صفحہ ۲۳ کی سطر ۱۴ میں ہے "ایں خرِ عیسیٰ نہ زین را بر پشت خود نہادہ است" صفحہ ۲۸ میں ہے "میاں خون حیض غوطہ خورد" صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۰ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی دریں جا تمسخر ہا بہ کار بردہ" صفحہ مذکور کی سطر ۱۸، ۱۹ میں لکھا ہے "سیلی و گردنی ہا را برائے او بنیاد نہند" صفحہ ۱۵ میں لکھا ہے "فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد" صفحہ ۶۱ کی سطر ۱۸ میں لکھا ہے "ایں خبطی[1]..." صفحہ ۴۶ کی سطر ۲۱ میں لکھا ہے "از خرابۂ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ است" صفحہ ۷۰ کی سطر ۱۱، ۱۲ میں لکھا ہے "معترض ازیں عضو صدمے دیدہ است"

---

[1] ایں خبطی در حقیقت ہر دو لغت از فرہنگ دیگر نشان می دہم

علاوہ اس کے جو کچھ اور لکھا ہے، ذیل میں گزارش ہے:

صفحہ	سطر	خلاصہ
۱۲۷	۱۶، ۱۷	اگر این چنین تہمت را حاکم منصف می دید، بینی چہ گویم گوشش می برید
۱۴۱	۱۵	بضاعت خواجہ ہمیں ازار است سہرکس را نشان می دہد
۱۴۲	۱۸	معترض خایہ را چرا گرفت، مگر برائے ترکیب نان خورش گرفتہ باشد
۱۴۴	۱۰	جشن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ است
۱۶۲	۲۰	گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید
۴۸	۲۱	گوش اواز بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند

ان الفاظ سے اور عبارت سے ازالۂ حیثیت عرفی میرے موکل کا ہے۔ میرے موکل کے بزرگ باشندے اکبرآباد کے تھے، فہرست گواہان کل داخل کروں گا۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بزبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا، صحیح ہے، مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔

حکم ہے کہ مدعی فہرست گواہان داخل کرے سوائے "قاطع القاطع" کے باقی کتابیں واپس ہوں چنانچہ واپس ہوئیں۔

۲۰ فروری ۱۸۶۸ء

جناب عالی

چوں کہ فدوی کو نقل الفاظ ہائے گزرانیدہ مدعی واسطے گزارنے معنے کے مطلوب ہیں لہذا بذریعہ گزارش درخواست ہذا امیدوار کہ نقل جملہ الفاظ ہائے گزرانیدہ مدعی فدوی کو عطا ہو جاویں۔ فقط

مولوی امین الدین

مختار نامہ از جانب مولوی امین الدین اسمی انبہ سہائے وکیل رنقل نہیں کیے گئے۔

فہرست گواہان مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ

۱	۲	۳
مولوی ضیاء الدین صاحب	مولوی سدید الدین خاں صاحب	حکیم حشمت اللہ خاں صاحب
پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری	استاد میور (؟) صاحب	سکریٹری اعظم

۴	۵	۶
محمد حمید الدین خاں صاحب عرف عبد الحکیم صاحب	مولوی ابراہیم صاحب	مولوی محمد حسین صاحب

۷

مولانا قمر الدین صاحب

فہرست گواہان مرزا اسد اللہ خاں غالب

۱	۲
مولوی منشی سعادت علی خاں صاحب	ماسٹر پیارے لال صاحب
مدرس کالج دہلی	سکریٹری

۳	۴
مولوی نصیر الدین صاحب مدرس	مولوی لطیف حسین صاحب
مدرسہ دہلی	مدرس

۵

منشی حکم چند صاحب مدرس

کالج دہلی

اطلاع نامہ ہا سمی ر ہ ، گواہان فریقین کہ جن کی نقل نہیں کی گئی ۔

نام میرا امین الدین ولد مولوی زین الدین قوم شیخ ساکن پٹیالہ عمر ۵۹ برس، پیشہ مدرسی

بیان ہے کہ

میں نے ایسا نہیں لکھا کہ جس میں ازالہ حیثیت عرفی مدعی کا ہو۔ یہ کتاب "قاطع القاطع" تصنیف میری ضرور ہے۔

سوال :- فرد قرارداد جرم تم کو سنائے جاتے ہیں، تم مرتکب جرم قرارداده کے ہوئے

یا نہیں؟ تمہارا کیا جواب ہے؟ کیونکر صفائی کرو گے؟

جواب :۔ فردِ جرم میں نے سنی. جواب یہ ہے اس کتاب میں تین قول ہیں : ایک تو محمد حسین برہان قاطع، دوسرا مرزا اسداللہ خاں مصنف "قاطع برہان"، تیسرا قول میرا "قاطع برہان" میں رد کیا ہے "برہان قاطع" کو اور میں نے تردید کری ہے "قاطع برہان" کی۔

صفحہ ۱۲ میں جو لکھا یہ برائے مثل ہے سوائے معنی تحت لفظی کے اور کچھ معنی میں نے نہیں خیال کیے، "زخم نہانی" مراد رنج دلی سے ہے، اور دیگر شاعروں نے بھی یہی معنی لیے ہیں، بہت شعر ہیں جن میں الفاظ "زخم نہانی" کو ڈالا ہے اور معنی اس کے رنج دلی لیے ہیں، سو اب یاد سے شعر پیش کروں گا۔

صفحہ ۲۳ میں جو لکھا ہے "خر عیسٰی . . . . "خر کے معنی نادان کے ہیں: لفظ عیسٰی صرف بطور مرکب کے ڈالا گیا ہے۔ یہ عبارت جو درج ہے کہ "بدشنام پردازم" معنی یہ ہیں کہ ساتھ گالی کے مشغول ہوتے ہیں، مگر آگے اس کے جو عبارت ہے[1] اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے درج کیا ہے کہ زبان ایسی خراب کرلی ہے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنی یہ ہیں کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو، اور کو[2] دیتے ہیں یہ الفاظ کچھ تحت مثل ہے "خون حیض" کا لفظ عرفی اور[2] . . . . اسکا لکھا ہے، اور یہ بھی معنی دیتا ہے کہ کیوں گنہ گار ہوتے ہو۔

صفحہ ۳۸ میں جو لکھا ہے لفظ "سوراخ" اور لکھا ہے "گوش[2] اور از بنا گوش برکنند" اس کے معنی یہ ہیں، کان کو اکھیڑ دو، یا کان کے سوراخ میں میخ مارو، یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں جب کوئی اعتراض کیا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ تمہارے کان اکھیڑے جائیں گے اور تمہارے کان بند کرائے جائیں گے۔

صفحہ ۴۲ میں جو درج ہے "کلال اکبرآبادی" کلال معنی میں سست کے لیے ہیں دوسری جگہ

---

[1] یہاں اصل عبارت کے کچھ لفظ رہ گئے ہیں

[2] یہاں اصل عبارت کے کچھ لفظ رہ گئے ہیں۔

لکھا ہے "سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند" اوپر کی عبارت سے اسے شامل کیا جائے تو معنی اس کے یہ ہوتے ہیں کہ خوشی کے شریک ہوئے۔

صفحہ ۱۵ میں لکھا ہے "فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد" یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں کہ جب کوئی اعتراض بے جا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ معنی اس کے تحت لفظی ہیں۔

صفحہ ۱۶ میں جو لکھا ہے "خبطی" اس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی برگشتگیِ مزاج۔

صفحہ ۶۶ میں ہے "از خرابۂ اکبر آباد بومے بہ دہلی رسیدہ است"۔ بوم کے معنی مدعی نے بھی اپنے قول میں جو اوپر درج ہیں زمین کے لیے ہیں۔ یعنی لکھا ہے "کاش از بوم دکھن دگرے برخیزد" چنانچہ میں نے بھی معنی زمین کے لیے ہیں معنی اس کے یہ ہوتے ہیں کہ زمین اکبر آباد سے ایک شخص آئے ہیں۔

سوال مدعی ـــــ خرابہ کا مضاف الیہ کون ہے؟ جواب اکبر آباد بوم ہے اور "ی" بوم کی واسطے تحسین کلام کے ہے۔ فقط

صفحہ ۷۰ میں جو لکھا ہے "عضو" میں نے اس کے معنی "خواندن" کے لیے ہیں، انھوں نے اپنے کلام میں جو اوپر درج ہے عضو کے معنی آلۂ تناسل کے لیے ہیں میری مراد یہ ہے کہ مدعی نے لفظ "عضو" سے کچھ صدمہ اٹھایا۔ رنج دیکھا ہے ازیں کی ضمیر قریب پر آتی ہے، بعید پر نہیں جاتی۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "بینی چہ گویم گوشتش می برید" اوپر کی عبارت سے ملا کر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا سزا دیتا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" یہ لفظ "ازار" مدعی کے قول میں درج ہے مگر معنی اس کے چادر کے ہیں اور یہی میں نے لیے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے "خایہ" اس کے معنی بیضۂ مرغ کے ہیں، میری مراد یہ ہے کہ معترض نے اس ہی لفظ "خایہ" کو بہ معنی خصیہ کیوں لیا۔ مگر نام واسطے خورش کے بہ معنی بیضۂ مرغ لیا ہو۔

لہ اوپر کی عبارت یہ ہے: "مضحکہا برائے خود آوردہ، رقص میونی می نماید و نشتر غمزہ در کار می فرماید نرم سور د سرور را ساز دہند و بعد خندہ بازی سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند"

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ "جستن خرس را یاد کردہ است ورقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معترض کی ایسی باتیں یاد کری ہیں کہ "جستن خرس ورقص بوزنہ" کہ بیکار ہیں یاد کری جاویں۔

صفحہ ۱۷۰ میں ہے، "گوش بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید" اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معترض نے چوری الفاظ کری ہے، اس کی سزا ملنی چاہیے۔

میں نے یہ کتاب صرف بہ بحث علمی چھپوائی ہے، گواہ میرے موجود ہیں۔

یہ جواب میرے مواجہ میں قلم بند کیا گیا۔ اس میں تمام بیان مشخص با خود مشتہادی صحیح و درست مندرج ہے۔

اظہار گواہ مدعی باقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ۲ مارچ ۱۸۶۸ء

نام میرا پیارے لال ہے ولد رام نرائن ہیڈ ماسٹر اسکول قوم کھتری ساکن دریبہ عمر ۳۰ برس کی پیشہ ماسٹری۔ بیان یہ ہے کہ صفحہ ۱۴ "قاطع القاطع" کی عبارت جس پر نشان سرخی کا ہے، میں نے پڑھی۔ معنی "حرکت ناکردنی" کے ہیں۔ "اعلام ضربت ہا کشیدہ" اس مقام پر وہ معنی لیے جاتے ہیں کہ جب بحالت مجامعت ضرب لگتی ہے۔ "زخم نہانی" کے لغوی معنی ہیں "پوشیدہ زخم"۔ مگر یہاں اس زخم سے مراد ہے کہ جو فعل بد سے عائد ہوئے، جو شخص پڑھ سکتے ہیں۔ وہ اس سے یہی مراد رکھیں گے۔

سوال از طرف مدعا علیہ ——— آپ مرزا نوشہ کے شاگرد ہیں؟

جواب ——— میں شاگرد نہیں ہوں

سوال دوسرا ——— آپ فارسی کما حقہ جانتے ہیں؟

جواب ——— عربی میں نہیں جانتا، اور عام فارسی بھی اچھی نہیں جانتا جس قدر جانتا ہوں معنی بیان کر دیے۔

سوال تیسرا ——— مدعی نے ترجمہ ان الفاظ کا انگریزی میں آپ سے کرایا تھا؟

جواب ——— ہاں مجھی سے کرایا تھا۔

صفحہ ۲۳ سطر ۱۵ میں لکھا ہے "خر عیسیٰ" اس کے معنی عیسیٰ کا گدھا، مگر یہاں مراد صرف گدھے۔

عینی کے لفظ سے کچھ حاصل نہیں۔ لکھا ہے "بدشنام پردازم" یعنی میں گالیاں دیتا ہوں۔

صفحہ ۲۸ سطر ۱۹ میں لکھا ہے "میاں خون حیف غوطہ خورد" اس کے معنی یہ ہیں کہ خون حیف میں غوطہ کھایا اور لفظ نسبت مخالف کے ہیں۔

سوال مدعا علیہ ــــ آپ مضاف مضاف الیہ کو جانتے ہیں؟

جواب ــــ جانتا ہوں۔

صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی" یعنی اکبر آباد کا کلال" سوائے اس کے اور کچھ معنی پیدا نہیں ہوتے۔ "رقص میموں" بندر کا ناچ "نشتر غمزہ" بہ معنے بدکاری۔

سوال مدعا علیہ ــ کلال بالفتح لفظ ہندی ہے اور یہ کتاب فارسی ہے، لفظ ہندی، فارسی میں آتا ہے؟

جواب ــــ دو طرح لفظ پڑھنے میں آتا ہے "کلال و کُلال" کلال کے معنی شراب کش اور کُلال کے معنی کمہار۔

صفحہ ۴۴ میں لکھا ہے "دست را بہ سیلی ولب را بدشنام باز کشاید" یعنی ہاتھ کو تھپڑ کے ساتھ اور لب کو گالی سے کھولا۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "فصد باید کشاید تا جنونش فرد گردد" فصد کے معنی ہیں نشتر سے خون نکالنا۔ "جنونش فرو گردد" یعنی جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے "خبطی" معنے اس کے جنونی ہیں۔

سوال مدعا علیہ: ــــ دوسرے معنی آپ جانتے ہیں؟

جواب: ــــ میں نہیں جانتا۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "آرے از خرابۂ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسید" معنی یہ ہیں کہ اجاڑ اکبر آباد سے ایک اتو دہلی میں پہنچا، سوائے اس کے اور کچھ معنی میرے نزدیک نہیں ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "عضو" لغوی معنے اس کے ہیں جسم کا کوئی حصہ مگر یہاں مراد عضو تناسل ہے بدیں مراد کہ معترض نے اس عضو سے صدمے اٹھائے ہیں، اور یہ بیان مصنف کا سمجھتا ہوں۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "بینی چہ گویم گوشش می برید" معنے یہ ہیں کہ ناک کا کیا کہوں کان اس کے اکھاڑیے۔ "گوشش" کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد"۔ اس کے معنے میں نہیں سمجھتا۔

صفحہ ۱۴۲ میں ہے "خایہ را چرا گرفت" اس مقام پر خایہ کے معنی عضو تناسل کے ہیں اگرچہ معنی اس کے بیضۂ مرغ بھی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں جو لفظ "منغ شوراخ" کا لکھا ہے اس سے مراد مقعد ہے۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" معنے یہ ہیں کہ خرس کے کودنے کو یاد کیا ہے اور بندر کے ناچنے کو ظاہر کیا ہے۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا کہ صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ۲ مارچ ۱۸۶۹ء

نام میر لطیف حسین ولد حکیم محمد خاں، شیخ، مدرس عربی فارسی ساکن کوچہ حکیم بقار اللہ عمر ۴۵ برس کی۔

بیان یہ ہے

صفحہ ۱۳ میں لکھا "حرکت ناکردنی" ناشایستہ کے معنی ہیں، خلاف وضع فطری، جو کوئی پڑھے یہ معنی لے گا۔

سوال مدعا علیہ — ان الفاظ کے معنی اور بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب — تحت لفظی معنی اور بھی ہو سکتے ہیں مگر اس مقام پر یہی معنی ہیں۔

صفحہ ۱۳ "زخم نہانی" کے معنی اس مقام پر "اندام نہانی" کے ہیں، اور ضرب سے وہی مراد ہے جو اس کام سے ضرب ہوتی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خر عیسیٰ"، اس کے معنی گدھا ہے، بے وقوف، عیسیٰ کا لفظ کوئی معنی

لہ بہ سوراخش تیغے زنند۔

نہیں دیتا، اس صفحہ میں لکھا ہے " بدشنام پردازم " معنی اس کے یہ ہیں کہ گالیاں دوں۔

صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے " میاں خون حیض غوطہ خورد " خون حیض وہ جو عورتوں کو ماہواری آتا ہے، ناپاک ہے، گالی نہیں ہے، کلمۂ سخت ہے، اور کچھ معنے نہیں ہو سکتے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے " بہ سوراخش میخے زنند " اس مقام پر سوراخ کے معنی مقعد کے ہیں لفظی معنی چھید کے ہیں، " سوراخش " کے شین کی ضمیر بطرف گوش کے ہو سکتی ہے، مگر اس مقام پر میری دانست میں معنی مقعد کے ہیں۔

صفحہ ۴۴ میں لکھا ہے " کلال اکبر آبادی " اگر ضم سے پڑھا جائے تو کمہار اور اگر فتح سے پڑھا جائے تو معنے مے فروش، دوسری جگہ لکھا ہے " سیلی وگردنی بارا برائے او بنیاد نہند " معنے یہ ہیں، ہاتھوں سے گردن پر مارنا۔

صفحہ ۴۳ میں لکھا ہے " دست را بہ سیلی ولب را بہ دشنام بازکشاید " معنی وہ ہیں کہ جو لفظی ہیں اور کچھ معنی نہیں ہوتے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ " فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد " یعنی فصد کھولنا چاہیے تو جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے " خبطی " اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوانہ۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے " معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ " " عضو " سے مراد عضو تناسل ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ " بینی چہ گویم گوشتش نی برید " " گوشتش " کی ضمیر بطرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے " بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہرکس را نشان می دہد " معنے یہ ہیں کہ یہی پاجامہ ہے جو ہر ایک کو دکھاتا ہے۔

سوال مدعا علیہ — ازار کے معنی اور بھی ہیں؟

جواب — مجھے معلوم نہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے " خایہ را چرا گرفت " معنی لفظی یہ ہیں کہ معترض نے لفظ " خایہ " کو کیوں لیا اور لفظ کیوں نہیں لیا، دوسرے معنی یہ ہیں کہ بیضے کو کس واسطے لیا۔ اور عربی میں " خایہ " بیضے کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ " جستن خرس را یاد کردہ است در قص بوزنہ بہ اظہار آوردہ " معنے یہ کہ کودنے

ریچھ کو یاد کیا۔ اور بندر کا ناچ ظاہر کیا ہے۔ یعنی ریچھ کی طرح وہ شخص کودا ہے اور بندر کا ناچ کیا ہے۔
ضعیف معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کودنا ریچھ اور بندر کا یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۷۶ میں لکھا ہے ، گوش و بینی چرا گویم دست خواہد بر برید و زبان بہ قفا خواہد کشید۔ سوائے معنی لفظی اور کچھ معنے اس کے نہیں ہو سکتے۔ میں ایسی تحریر کو بہت درست سمجھتا ہوں اور ہر ایک شخص کی سمجھ میں ایسا ہی آوے گا۔ جیسا میں نے بیان کیا ہے اور کوئی کتاب میں نے نہیں دیکھی جس میں ایسی عبارت درج ہو۔

سوال مدعا علیہ ـــ "قاطع برہان" آپ نے دیکھی ؟

جواب ـــ میں نے دیکھی

یہ اظہار گواہ کا ہمارے ، اہتمام سماعت میں آیا۔ مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے سنایا گیا ہے۔ اقرار کیا، صحیح ہے، مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعی :

نام میر النصیر الدین ولد محمد علیم الدین قوم سیّد ساکن کوچہ پنڈت عمر ۳۳ سال پیشہ روزگار۔
بیان یہ ہے کہ

میں فارسی اور عربی خوب جانتا ہوں اور انگریزی بہت کم جانتا ہوں۔ صفحہ ۱۴ میں جو لکھا ہے کہ وہ میں نے اس سے سابق بھی اس عبارت کو دیکھا ہے ، حرکت ناکردنی ، سے یہ مراد ہے کہ جو حرکت نہ کرنے کی ہو ، زخم نہانی ، کے وہ معنی ہیں کہ ، زخم پوشیدہ ، مگر اس جگہ مراد اس زخم سے ہے کہ جو دکھایا نہیں جاتا۔

سوال مدعا علیہ ـــ آپ مدعی کے شاگرد ہیں ؟

جواب ـــ میں شاگرد نہیں ہوں۔

صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے "بدشنام پردازم" معنے اس کے یہ ہیں کہ ، گالیاں دوں ،

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میان خون حیض غوطہ خورد" معنی خون حیض کے وہ ہیں کہ جو عورت کو ماہ بہ ماہ اندام نہانی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز نہایت نجس ہے اور ناپاک ہے، اور ایسا لفظ آج تک استعمال

میں نہیں آیا۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "گوش اواز بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخ سے مراد مقعد ہے اور یہ معنے عام جو اس عبارت کو پڑھیں گے، سمجھیں گے۔

صفحہ ۴۲ — کلال اکبر آبادی، خم سے مراد کمہار سے ہے اور فتحہ سے مراد شراب کش سے ہوتی ہے اس مقام پر دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ بہ معنی رنج بھی آتا ہے مگر اس جگہ معنے رنج کے نہیں دیتا، عربی میں معنی اس کے سستی ہیں۔ وہ بھی اس جگہ موزوں نہیں ہوتے۔ اس صفحہ میں "نشتر غمزہ" لکھا ہے اس کے معنی صرف بیہودگی کے ہیں۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "فصد باید کشاید تا جنونش فرو گردد" اس کے معنی ہیں کہ جنون ہو گیا ہے فصد کھولنی چاہیے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ "از خرابۂ اکبر آباد بوسے بہ دہلی رسیدہ است" یعنی جنگل اکبر آباد سے ایک الّو دہلی میں پہنچا ہے۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است" معنی اس عضو کے "عضو تناسل" سے مراد ہے، ٹکر کھانا۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید" پس ضمیر شین کی بہ طرف معترض ہے، ضمیر اس شین کی بہ طرف تہمت نہیں ہو سکتی۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" معنے اس کے یہ ہیں کہ اس کے پاس یہی پاجامہ ہے اور گالی کا کنایہ ہے کہ ہر کسی کو دکھاتا ہے کہ خریداری کرے۔

اس کے بعد صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے، "معترض خایہ را چرا گرفت" معنے "خایہ" کے خصیہ اور انڈے کو بھی کہتے ہیں، یہاں شاید مراد خصیہ لیے ہیں۔ جو کوئی پڑھے گا وہی اس کے معنی خصیے کے سمجھے گا۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ" معنے یہ ہیں کہ ریچھ کے کودنے کو یاد کیا ہے اور بندر کے ناچنے کو یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۶۷ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید" معنے اس کے یہ ہیں کہ کان اور ناک کو میں کیا کہوں ہاتھ کاٹے گا اور زبان ساتھ گدی کے کھینچے گا۔

سوال از طرف وکیل مدعی —— یہ الفاظ کس کی طرف بیان کیے گئے ہیں؟

جواب —— دیباچہ دیکھ کر بیان کرتا ہوں کہ نسبت مرزا اسداللہ کے ہیں؟

یہ الفاظ نوشتہ اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہوکر مظہر کو بزبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے پڑھ کر سنایا۔ اقرار کیا، صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی

نام میرا حکم چند ولد رام دیال قوم اہیر ساکن کھاری باؤلی عمر ۳۶ برس کی

بیان یہ ہے کہ

صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے "چہ حرکت ناکردنی کردہ است" اس کے معنے یہ ہیں کہ جو حرکت کرنے کے لائق نہیں ہے، وہ کی ہے یعنی اغلام کیا ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے "زخم نہانی خویش وانماید" زخم نہانی جائے مخصوص سے مراد ہے۔ میری رائے میں یہی معنے آتے ہیں، عام لوگوں کو میں نہیں کہہ سکتا ہوں مگر یقین ہے یہی معنے بیان کریں گے۔ اور یہ عبارت سابق بھی میں نے دیکھی ہے۔

سوال مدعا علیہ ۔ تمہاری تصنیف پر مرزا نے تصدیق لکھی؟

جواب —— ہاں لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے۔

صفحہ ۴۴ میں لکھا ہے "خرعیسیٰ" اس جگہ مراد خاص گدھے سے ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے: "بدشنام پردازم" اس کے معنی یہ ہیں کہ گالیاں دوں میں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "میاں خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنی وہی ہیں جو معنے لفظی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "بہ سوراخش میخے زنند" سوراخ کے معنے اس جگہ مقعد کے ہیں۔ شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے، بہ طرف گوش نہیں۔

صفحہ ۴۴ میں لکھا ہے۔ کلال اکبرآبادی۔ اگر لفظ عربی ہو تو بہ معنے سستی اور اگر بہ ضم ہو تو بہ معنے کمہار، اور بہ فتح ہے تو بہ معنے مے کش۔ دوسری جگہ لکھا ہے "سیلی و گردنی ہا را برائے او بنیاد نہند" اس کے معنی یہ ہیں کہ تھپڑ ماریں۔

صفحہ ۱۵ میں لکھا ہے "مگر فصد باید کشاد تا جنبش فرد گردد" سوائے لفظی معنے کے اور کچھ معنی نہیں۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے "خبطی" اس کے معنے "دیوانہ"

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے لفظ "عضو" کا اس عضو سے مراد آلۂ تناسل ہے۔

صفحہ ۱۲۰ میں لکھا ہے "بینی چہ گویم گوششں نا بریدہ" سوائے معنی تحت لفظی کے دوسرا مطلب نہیں ہے۔ "گوشش" کے شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازاراست ہر کس را نشان می دہد تا خریداری نماید" حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کے پاس یہ پاجامہ ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے۔

سوال مدعا علیہ — ہمیں کی ضمیر کس طرف جاتی ہے اور لفظ ازار کس کا لیا ہوا ہے؟

اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ "خایہ" کا لکھا ہے اس کے معنے خصیہ ہیں۔

صفحہ ۱۶۸ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است در رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" سوائے لفظی معنی کے اور کچھ بات پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید" معنے اس کے تحت لفظی کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

ظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر ۳ مارچ ۱۸۶۰ء

نام میر ضیاء الدین ولد محمد بخش ساکن دہلی پروفیسر عربی دہلی کالج۔

بیان یہ ہے کہ

میں نے سابق اس کتاب کو دیکھا ہے صفحہ ۱۳ میں جو عبارت لکھی ہے وہ "حرکت ناکردنی" یہ ہمہ الفاظ کسو خاص حرکت پر خصوصیت نہیں رکھتی۔ اس کے معنی وہ ہیں جو حرکت لائق کرنے کے نہ ہو

لفظ "ضربت ہا" لکھا ہے اس کے معنی مارنے کے ہیں، خصوصیت کسی دوسرے معنی پر نہیں رکھتا۔

"زخم نہانی" کے معنی یہ ہیں "زخم اندرونی" یا صدمۂ دل۔ استعمال منشے اس کے وطیان میں چاہئے جو کچھ لے لے، طرز عبارت سے جو کوئی دیکھے گا وہ معنی اس لفظ کے اور معنے کر کے خیال نہیں کر سکتا ہے۔ یہ عبارت نہ فحش ہے نہ ناسزا گوئی ہے۔ "زخم" موصوف اور "نہاں" اس کی صفت ہے، نہاں کے معنی کسی نے مقعد کے نہیں لیے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خرعیسیٰ" خر کے معنی بے وقوف ہیں اور لفظ عیسیٰ سے عظمت اور بزرگی ہوتی ہے۔ جیسے کہ فریزر[2] صاحب کمشنر دہلی یہاں مارے گئے ہیں ان کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ یہ ہے۔

چوں فریزر کمشنر دہلی۔ گشت مقتول از تفنگ بلا

از فلک چار میں ندا آمد خرعیسیٰ نمود واویلا[1]

"خرعیسیٰ" ایسا ہے جیسا کلب حسین اور کلب علی چنانچہ والیِ رام پور کا نام کلب علی خاں ہے معنے "کتے علی کے"۔

سوال وکیل مدعی — اس عبارت سے کیا مراد ہے؟

جواب — میرے نزدیک کوئی امر تضحیک کا نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸ میں جو لکھا ہے کہ "میاں خون حیض غوطہ خورد" یہ صنعت ایہام ہے، بہ لحاظ حقیقی معنے کے کسی طرح مذمت نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کام نہایت بے وقوفی سے کرنا، اور وہ کام جو نہیں کرنا ہے، معنی خون حیض کا پینا نہایت بے وقوفی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ خون حیض کو بہ لحاظ رنگ ناپاک مشابہت شراب سے ہے گویا کثرت شراب۔

سوال وکیل مدعی۔ اگر آپ کتاب کو دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

---

[1] لفظ صاف نہیں لکھا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ولیم فریزر کی طرف اشارہ ہے۔

[2] فریزر کمشنر دہلی ۱۸۳۵ء مطابق ۱۲۵۱ھ میں مارا گیا لیکن قطعہ مذکور کے آخری مصرعے سے یہ تاریخ نہیں نکلتی۔

جواب - لطیف عبارت ہے اس واسطے ہم ہنیں گے مگر تفضیک کسی طرح کی اس میں نہیں ہے۔ عرفی کا قول ہے ؎

خونِ حیض بہ دختر رز جوشد از لب ہائے من

خون حیض عورتوں کو آیا کرتا ہے۔ اگر مرد کی نسبت کہا جائے تو معنی بے وقوفی ہیں، جیسا کہ حیض الرجال مرد محمل نہیں ہے۔ حیض کے واسطے اس کے معنی عیب اور بدگوئی کے ہیں۔

صفحہ ۴۸ میں لکھا ہے کہ "گوش اواز بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بہ موجب قاعدے کے قریب کی ہوتی ہے یعنی بہ طرف کان۔ مطلب یہ ہے کہ کان کھولے جاویں مگر صرف لواطت والے اور معنی بھی سمجھ سکتے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی" بہ معنے مے فروش" مگر اس شخص کے واسطے جو دائم الخمر ہو عیب نہیں ہے بلکہ مرزا نوشہ کا شاگرد تخلص مے کش ہے جو شراب نہ پیوے اس کے نزدیک عیب ہے مگر مدعی دائم الخمر ہے اس واسطے اس کی نسبت کچھ تفضیک نہیں ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے "سیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند" یعنی ہنسیں ان کے اوپر اور اصل یہ ہی ہے۔

صفحہ ۱۵۱ میں لکھا ہے کہ "مقصد بایدکشاد" یہ محاورہ روزمرّہ کا ہے کچھ سختی کلام نہیں ہے۔

صفحہ ۱۶ میں ہے "خبطی" لغوی معنی اس کے یہ ہیں لڑ چلنا۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "از خرابۂ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ است" یہ صنعت ایہام ہے۔ مگر اس جگہ معنی زمین کے ہی اچھی طرح ہو سکتے ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے لفظ "ازیں عضو" اس ازیں عضو کی ضمیر بہ طرف قریب پھرتی ہے عضو تناسل کی طرف مگر کوئی کافی نہیں ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ خوب اس کو سزا دینا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے لفظ "ازار" اس کے معنی عربی میں چادر کے ہیں مگر ہندی میں پاجامے

۱؎ میر احمد حسین میکش بے چارہ بے گناہ غدر میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

۲؎ خبط بہ معنی دست و پازدن۔

کو کہتے ہیں۔ بہ کتاب فارسی اگر دیکھا جاوے تو بہ معنی چادر سمجھا جاوے گا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ "خایہ" کا لکھا ہے، یہ بھی صنعت ایہام ہے مگر اس مقام پر معنی بیضہ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں جو لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں اور ایسے مقام پر یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ جو حرکت بے جا ظہور میں آئی ہو جیسا کہ رقص۔۔۔۔

صفحہ ۱۷۲ میں جو عبارت لکھی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حاکم خوب سزا دے گا۔

عبارت متنازعہ کو ہم لطافت اور خوبی بیان تصور کرتے ہیں اور ایسی تحریریں دشنام یا ہتک نہیں سمجھتے۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم اے جانب تحریر ہو کر مظہر کو زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، واقع ۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء

نام سدید الدین والد کا نام رشید الدین قوم شیخ ساکن گلی امام عمر تخمیناً ۶۰ برس کی۔

بیان یہ ہے کہ:

میں نے ان دنوں میں اس کتاب کو دیکھا ہے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ "حرکت ناکردنی کردہ است" اس کے معنی یہ ہیں کہ "حرکت" بہ معنی ہلنا اور "ناکردنی" بہ معنی بے جا سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے خیال میں نہیں آتے لفظ "زخم نہانی" کے معنی زخم پوشیدہ ہیں یعنی زخم اندرونی، اگر بہ سبیل لطیفہ کوئی اور معنے ہوں تو مجھ کو معلوم نہیں "ضربت ہا کشید" کے معنی ہیں کہ کچھ مارا گیا ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ "خر عیسیٰ" اس کے معنی بے وقوف کے ہیں۔

صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے کہ دوسرا ذوق لکھتا ہے کہ "میں پھنس گیا" مصنف اس کا لکھتا ہے کہ ناپاک چیز میں پھنس گیا

سوال از طرف مدعا علیہ ۔ حیض الرجال کے معنی کیا ہیں؟

جواب ۔ بدگوئی کے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "گوش آواز بنا گوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے۔ معنی اس کے تحت لفظی ہیں۔

سوال وکیل مدعی ۔ اگر سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہو تو بھی ایسے الفاظ سخت ہوتے ہیں یا نہیں؟

جواب ۔ کچھ سخت الفاظ نہیں ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبرآبادی" اردو میں کلال مے فروش کو کہتے ہیں، مگر یہ کتاب فارسی میں ہے، اس واسطے بہ معنی مے نوش۔ "رقص میمونی" و "شتر غمزہ" کے معنی بیہودہ کلام ہے۔

سوال وکیل مدعی ۔ تحت لفظی معنی کیا ہیں؟

جواب ۔ صاف ہیں۔

صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ "دستش بستہ بہ لائے شراب انداز زند" اوپر[1] کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی شراب کے نہیں ہیں، اگر پیدا کرے جاویں تو معترض کے ہاتھ باندھ کر بہ لائے شراب ڈالیں۔

صفحہ . . میں معترض از یں عضو صدمے دیدہ است۔ معنی یہ ہیں کہ مصنف "قاطع برہان" یعنی اس جگہ معنے عضو کے عضو تناسل لکھا ہے، اور جگہ اس عضو کو دیکھا ہے۔ مصنف اس کتاب کا یہ قول ہے کہ معترض نے اس عضو سے کیا صدمہ دیکھا ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو عبارت لکھی ہے "ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید" اس کے معنی صاف ہیں اور معنی اس کے تحت لفظی ہیں دوسرے معنی یہ کہ "حاکم سزا دیتا" اور معنی نہیں۔

---

[1] اوپر کی عبارت یہ ہے۔

"می فرماید آدیزہ بہ زائے ہوز ہرگز نیست، ونہ اسم شراب است، من می گویم، کہ اگر در فرہنگ ہائے دیگر آدیزہ بزائے ہوز بہ معنی شراب باشد سزائے منکر چیست؟ می باید کہ دستش بستہ بہ لائے شراب انداز ند"

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" "ازار" معنے تہمد کے ہیں، امور نجیبہ کے نہیں، صرف علمی بحث ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ "خایہ" کا اس کے دو معنی ہیں ایک بیضۂ مرغ دوسرے خصیہ ہیں مگر چوں کہ اس مقام پر لفظ "نان خورش" اس واسطے معنی اس کے اس مقام پر بیضۂ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ" اس کے معنی حرکت لغو، اور کام بیہودہ کے ہیں۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے اس کے معنی تحت لفظی صاف ہیں۔

سوال عدالت — جو فقرے آپ نے پڑھے ہیں آپ ان کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب — میں فقروں کو لطائف سمجھتا ہوں، بحث میں ایسے بھی فقرے ہوتے ہیں فحش یا بدنامی کسو کی نہیں ہے نہ کسی کو برا معلوم ہوگا۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام ساعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے۔ وکیل مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح، بہ اجلاس مسٹر او برین صاحب بہادر ۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء

نام میر احسنت اللہ خاں ولد غلام نقش بند خاں قوم مغل ساکن مٹیا محل عمر ۴۴ سال پیشہ حکمت

بیان یہ ہے کہ

اس چار پانچ روز کے عرصہ میں مظہر نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے "حرکت ناکردنی، زخم نہانی، وضربت ہا" حرکت ناکردنی خصوص کس حرکت کے واسطے نہیں ہے: "ضربت ہا" کے تین معنی ہیں اول [1] ...... دوم پیدا کرنا سوم اپنا ہاتھ سر میں مارنا چہارم سستے نقصان کے بھی ہیں، اور "زخم نہانی" معنی دردِ دل کے ہیں، اور اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ "زخم نہانی" معنے رنج

---

[1] عبارت مسل میں درج نہیں۔

دوری حاصل کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خرعیسیٰ" اس کے معنی بے وقوف کے ہیں، اور خر کے معنے نادان ہیں، اور لفظ عیسیٰ بہت بزرگ ہے، اگر ہم کو "خرعیسیٰ" کہا جاوے تو ہم اپنی عزت سمجھیں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میاں خون حیض غوطہ خورد" اس کی مراد بے وقوف اور گندی بات سے ہے، اصل مراد اس کی مصنف سے پوچھی جائے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "بہ سوراخش میخے زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہے۔

سوال وکیل مدعی — اس مضمون سے کوئی شخص برا مانتا ہے؟

جواب — شعرا کے نزدیک قابل برا ماننے کے نہیں ہے۔ اگر کوئی جھوٹ ہم سے کہے تو برا مانیں، مگر برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال" کے معنی ہندی میں مے فروش کے ہیں اور عربی میں سست کو کہتے ہیں، یہ کتاب فارسی ہے، ہندی کے معنی نہیں ہو سکتے۔

سوال وکیل مدعی — فارسی میں کیا معنی ہیں؟

جواب — اس کا حال نہیں معلوم

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "از اکبرآباد بوم بہ دہلی رسیدہ" اس کے معنی یہ ہیں اور ترکیب مقلوب ہے، یعنی از بوم اکبرآباد معنے ہیں، اس جگہ معنی الو کے نہیں ہیں۔ واقعہ اور یہ معترض نے لکھا ہے کہ بوم مصنف نے لکھا ہے کہ اکبرآباد بوم۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "معترض از یں عضو صدمتے دیدہ است" اس کی ضمیر بہ طرف آلہ تناسل ہوتی ہے اور "ازیں" کی ضمیر بہ طرف قریب ہے۔

صفحہ ۱۲۰ میں جو لکھا ہے اس کے معنی تحت لفظی ہیں کہ اگر حاکم اس کی تہمت کو دیکھتا تو کان کاٹتا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ "بضاعت خوابہ ہیں ازار است ہر کس رانشان نی دہد تا خریداری نماید" معنے ازار کے چادر کے ہیں۔ خریداری کے معنی قبول کرنے کے ہیں

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ "خایہ" اس کے معنی بیضیہ مرغ کے ہیں۔ اور مرزا نے بھی اسی قول

ہیں معنے اس کے ببقیۂ مُرغ اوپر لکھے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ یاد آوردہ" معنی اس کے یہ ہیں کہ بے جا باتوں کو یاد کیا جیسا کہ "جستن خرس و رقص بوزنہ حرکت بے جا ہے۔

صفحہ ۱۶۲ میں لکھا ہے، "گوش و بینی چرا گویم دستش خواہد برید" معنی اس کے اوپر کی عبارت سے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیتا۔ میرے نزدیک سخت کلامی اس میں نہیں ہے۔ شعرا ایسی عبارت لطافت طوالت کے ساتھ خیال کرتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے، مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ

نام میر احمید اللہ عرف عبدالحکیم ولد محمد عبداللہ قوم سید عمر ۳۹ برس ساکن کلاں محل پیشہ روزگار

بیان یہ ہے کہ

میں نے اب یہ کتاب دیکھی صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے "ناکردنی، ضربت ہا و زخم نہانی"۔ "حرکت ناکردنی" کے معنی لفظی ہیں خصوصیت کسی حرکت پر نہیں۔ "ضربت ہا" کے معنی رنج و صدمے کے ہیں اور "زخم نہانی" کے معنی رنج کے ہیں اور اکثر شعرا نے بھی یہی معنی باندھے ہیں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے، "خر عیسیٰ" اس کے معنی یہ ہیں کہ "خر" بمعنی نادان، اور "عیسیٰ" نام پیمبر کا لفظ جس سے فخر ہو گیا۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میاں خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گار ہوئے، مگر در نفط[1] ہیں اگر دوسری دفعہ کوئی غلطی کرے گا تو اس عبارت کو باندھ جاوے گا۔ دیوان حافظ

---

[1] عبارت مشکوک ہے۔

ہیں کئی جگہ خون حیض درج کیا گیا ہے۔ اس وقت کوئی شعر یاد نہیں۔ یقین ہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز نے تحفہ اثنا عشریہ میں ان الفاظ کو لکھا ہے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "سزاوار بناگوش بر کنند یا میخے بہ سوراخش زنند" معنی اس کے لفظی ہیں۔ "سوراخش" کے شین کی ضمیر بطرف گوش ہے۔

صفحہ ۴۴ میں لکھا کہ "کلال اکبر آبادی" یہ کتاب فارسی ہے۔ فارسی میں کلال بہ معنی مست کے ہیں اور اردو میں بہ معنی مے فروش۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے کہ "آرے از خرابۂ اکبر آباد بومے بہ دہلی رسیدہ" معنی یہ ہیں کہ بوم اکبر آباد سے یعنی زمین اکبر آباد سے کوئی دہلی میں پہنچا۔

صفحہ۔ میں لکھا ہے کہ "ازیں عضو صد مئے دیدہ است" معترض کے دل میں ہے کہ "ازہمیں عضو" اس ہمیں کی اضافت بطرف عضو تناسل ہے اور ازیں عضو کی اضافت بطرف اس عضو کے ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حاکم سزا دیوے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" اور یہ قول ہے معترض کا جس میں لکھا ہے کہ "کلاہ را ازار نام نہادہ" مصنف نے لکھا ہے کہ یہ دہی ازار ہے۔ معنی چادر کے ہیں۔ صفحہ ۱۴۲ میں لفظ خایہ لکھا ہے۔ اس کے معنی بیضۂ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ "جبتن خرس را یاد کردہ است" اور "رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ" اس کے معنی نظر کرنے کے جہاں نے فاسد باندھ لیے ہیں۔

صفحہ ۱۶۷ میں لکھا ہے۔ اس کے معنی تحت لفظی ہیں۔ اگر اس چوری کو میں کہوں تو کان ناک کیا کہوں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔

ایسی عبارت کو برا نہیں سمجھتا ہوں، جہاں مناظرۂ علمی ہوتا ہے وہاں ایسی عبارت ہمیشہ ہوتی ہے بلکہ اوروں نے زیادہ اس سے لکھا ہے۔

اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ عبارت معمولی۔

جناب عالی!

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بہ نام مولوی امین الدین بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ ۴۹۹ سلہ عبارت مشکوک ہے۔

تعزیرات سند عدالت ہے، چنانچہ بہ فہمائی چند گرامی روسائے شہر باہم رضامندی ہوئی اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ باقی نہیں، مقدمہ داخل دفتر ہو جاوے۔

عرضے

عزیز الدین وکیل مدعی ۲۳ مارچ ۱۸۹۶ء

از پیشگاہ اوبرین صاحب بہادر

مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر۔ فقط

عبدالستار صدیقی

دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب

(۱)

سنا تھا دہلی میں کبھی کوئی ادبی انجمن "دہلی سوسائٹی" بھی تھی۔ اس انجمن کی مہر بھی بعض کتابوں پر دیکھی تھی جو، امید ہے، اب بھی دہلی کے دو ایک کتاب خانوں میں محفوظ ہوں گی۔ انجمن کے حال کی تفصیل معلوم نہ تھی۔ اُردو ادبیات کی تاریخ مدوّن نہیں پرانے جریدے (اخبار یا رسالے) جن سے ادب یا ادبی اداروں کا حال پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا، بہت کم محفوظ رہے ہیں۔ ہاں ہندستانی ادبیات کے فرانسیسی سوانح نگار گارساں دتاسی نے، اسے آفریں کہیے، اپنی تالیفوں میں ۱۸۷۷ء تک کے حالات، جہاں تک اور جیسے کچھ اسے مل سکے، اکٹھا کر دیے ہیں اور انجمن ترقی اردو (ہند) نے اس کے خطبوں اور تبصروں کو "خطباتِ گارساں دتاسی" اور "مقالاتِ گارساں دتاسی" کے نام سے اردو میں منتقل بھی کر لیا ہے¹۔ جو ماخذ آج نایاب ہیں، سب نہیں تو ان میں سے بہت سے دتاسی کے سامنے تھے۔ پھر بھی ہزاروں کوس دور بیٹھے کسی ملک کی زبان اور اس کے بڑھتے ہوئے ادب پر تبصرہ کرنا بہت بڑی منزل ہے۔ "دہلی سوسائٹی" کا حال، دتاسی کی تالیفوں میں کئی جگہ آیا ہے مگر ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا نہیں۔ ان بہت سی علمی یا ادبی انجمنوں کے ساتھ ساتھ جو ۱۸۵۰ء

---

¹ افسوس، اس کی "ہندوستانی ادب کی تاریخ" ابھی ترجمہ نہیں ہوئی۔

کے غدر کے تین ہی چار برس بعد سے قائم ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ دہلی سوسائٹی کا بھی کہیں کہیں نام آ گیا ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ یہ انجمن، جو ۱۸۶۵ء سے قائم تھی[1] اپنے اجلاسوں کی کارروائی اردو زبان میں ایک رسالے کی شکل میں شائع کرتی رہتی تھی۔ اور وہ رسالہ سوسائٹی کے سکریٹری منشی پیارے لال کے اہتمام سے نکلتا[2] اور دلی کے اس زمانے کے مشہور چھاپے خانے "اکمل المطابع" میں چھپتا تھا[3]۔ مغل سلطنت کی پرانی راجدھانی کے اکثر سربرآوردہ باشندے اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔ اس کے جلسوں میں بیشتر عام منفعت کے مطالب پر مقالے پڑھے جایا کرتے تھے۔ ان پر دلچسپ مباحثے بھی ہوتے تھے اور پھر اس کا خلاصہ انجمن کے ماہانہ رسالے میں درج کیا جاتا تھا[4]۔

دتاسی کو ہندوستان کے ادبی اور علمی حالات معلوم کرنے کی فکر ہر وقت رہتی تھی اور کسی ممکن موقع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ بعض اداروں سے اسے براہ راست اطلاع ملتی رہتی تھی۔ گو ان کی تعداد بہت کم تھی۔ "دہلی سوسائٹی" نے ظاہراً ایسا نہیں کیا، سرکاری رپورٹیں جو شائع ہوتیں، اسے آسانی سے ملتی رہتیں۔ کچھ انگریزی اور ہندوستانی اخبار بھی سلسلہ وار اس کے پڑھنے میں آیا کرتے۔ پھر بھی بہت سے اخبار اور وقتی مطبوعات وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جو کبھی کبھار اسے مل جاتی تھیں اور ان کو غنیمت جان کے وہ انھیں سے کام نکال لیا کرتا تھا۔ انھیں میں "دہلی سوسائٹی" کا رسالہ بھی ہے جس کا اسے غالباً ایک سے زیادہ شمارہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ جو کچھ حال اس نے اس سوسائٹی کا لکھا ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ رسالے کا پہلا شمارہ، جس میں اس انجمن کے آغاز کی ساری روداد لکھی ہوئی ہے، اسے نہیں ملا، اور دوسروں کی زبانی

---

[1] گارساں دتاسی: تبصرہ بابت ۱۸۶۸ء، ص ۸۰ (اردو ترجمہ: مقالات، ج ۲، ص ۸۹)

[2] ایضاً خطبات ص ۴۰۸ (اردو ترجمہ ۶۷۰)

[3] تبصرہ بابت ۱۸۷۰ء، ص ۵ (مقالات حصہ ۱، ص ۴ اور تبصرہ بابت ۱۸۶۸ء، ص ۸۰ (مقالات حصہ ۲، صفحہ ۸۹)

[4] تبصرہ بابت ۱۸۷۰ء، ص ۸۰، دتاسی نے یہ اطلاع اخبار انجمن پنجاب "۱۸ اپریل ۱۸۶۴ء" سے اخذ کی ہے نہیں معلوم "ماہانہ" کا لفظ اس اخبار ہی نے لکھ دیا تھا، یا دتاسی کا اضافہ ہے۔

سے جو کچھ معلوم ہو گیا اسی پر قناعت کرنی پڑی۔ خاص کر "دہلی سوسائٹی" کے متعلق اس کی معلومات بیشتر تشنہ ہے اور کہیں کہیں غلط، جیسے یہ کہ سوسائٹی کا رسالہ "ماہانہ" تھا۔ بعض اطلاعیں آپس میں متناقص بھی ہیں۔ مثلاً ۱۸۶۸ء کے خطبے اور پھر ۱۸۷۰ء کے تبصرے میں سوسائٹی کے رسالے کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کر چکا ہے، مگر اپنے پہلے لکھے کو بھول کر ۱۸۷۲ء کے تبصرے میں کہتا ہے:

دہلی کی ادبی انجمن کا اب تک کوئی رسالہ شائع نہیں
ہوتا، لیکن اب اس نے اپنا رسالہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا
ہے اور اس کے پہلے شمارے کی "اتالیق پنجاب" کے
ایڈیٹر نے بہت تعریف کی ہے۔[1]

سوسائٹی کے رسالے کو جو وہ "ماہانہ رسالہ" (JOURNAL MENSUEL) کہتا ہے، صحیح نہیں۔ صورت یہ تھی کہ کم و بیش سال بھر کے اجلاسوں کی کارروائی مع ان مقالوں کے جو ان اجلاسوں میں پڑھے گئے تھے، سب یکجائی طور پر ایک شمارے میں جمع کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ماخذوں کی نایابی سراسر مایوس کرنے والی تھی اور اسی پر صبر شکر کر لیا تھا کہ دتاسی کی تحریروں سے کچھ تو حال معلوم ہو گیا۔ یہی کیا کم تھا کہ انھیں ادھوری اطلاعوں سے اتنا پتا لگ گیا کہ سوسائٹی کا رسالہ نکلتا تھا۔[2]

(۲)

بہت تلاش تھی کہ "دہلی سوسائٹی" کے رسالے کا کہیں سے ایک ہی شمارہ ہاتھ آ جائے، نہ آیا۔ بارے مخدومی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی نوازش سے ایک ہی نہیں، چار

---

[1] تبصرہ بابت ۱۸۷۲ء، ص ۴۴ (مقالات حصہ ۱، ص ۲۱۶)

[2] ادبیات کا شوق رکھنے والوں سے درخواست کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جہاں کہیں پرانی قلمی یا مطبوعہ کتابیں، اخبار، رسالے یا متفرق چیزیں ملیں ان کو محفوظ کرنے اور عام منظر پر لانے کو لازم جانیں تاکہ ادبی تاریخ کی تصحیح اور تدوین کسی حد تک تو ہو سکے۔

شمارے دیکھنے کو مل گئے، اور کئی برس ہوئے، ان میں سے ضروری یادداشتیں لکھ لیں۔ یہ چار اس طرح پر ہیں کہ پہلا موجود، دوسرا ندارد، تیسرا، چوتھا، پانچواں مسلسل موجود۔ پہلا بہت اہم ہے، کس واسطے کہ اس سے ادارے کی بنا اور اس کے سارے ابتدائی مرحلوں کی کیفیت پوری پوری معلوم ہوتی ہے۔

پہلے شمارے کی صورت یہ ہے: سرورق کا عنوان یہ شعر:

"صاحبا عمر عزیز است غنیمت دانش
گوے خیرے کہ توانی ببر از میدانش"

اس شعر کے نیچے "نمبرا" اور اس کے نیچے صفحے کے بیچ میں ایک دائرہ، اُس دائرے میں "رسالہ دہلی سوسائٹی" دائرے کے نیچے "۱۸۶۶ء" جو رسالے کے چھپنے کا سال ہے۔ اس سے نیچے دو سطریں، جو گویا عنوان کے دو مصرعوں کا جواب ہیں، مگر نثر میں: عبارت یہ: "صاحبان دہلی سوسائٹی کے ارشاد سے مطبع سراجی میں میرزا ولایت حسین کے اہتمام سے چھپا"۔ رسالے کی تقطیع بڑی آٹھ ورقی، مسطر ۲۰ سطری ہے۔[۱] اس شمارے کا حجم ۴۰ صفحے ہے اور آخر صفحے پر دو قطعہ، تاریخ راجہ دیبی سنگھ صاحب طرب کے کہے ہوئے درج ہیں۔

تیسرے اور اس کے بعد کے شماروں پر اس فارسی شعر کے بدلے، جو پہلے کے سرورق پر تھا، یہ اردو شعر ہے:

سوسائٹی کی بزمِ معلّیٰ کا ذکر ہے
یعنی علومِ حکمت و دانش کا ذکر ہے

چھاپے خانہ بھی بدل گیا ہے۔ ان تینوں شماروں پر ہے: "مطبع اکمل المطابع دہلی میں میر

---

[۱] دتاسی نے ۱۸۷۰ء کے تبصرے (ص ۵) میں اس شعر کا صرف ترجمہ فرانسیسی نثر میں دیا ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ پہلا شمارہ، جس پر فارسی شعر چھپا تھا، اسے نہیں ملا۔ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء کے تبصروں میں اس نے سوسائٹی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے "علی گڑھ اخبار" اور "اخبار انجمن پنجاب" وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

فخرالدین کے اہتمام سے چھپا[1]۔ تیسرا شمارہ، جو ۱۸۶۷ء میں نکلا تھا، ۴۵ ہی صفحے کا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں رسالہ نہیں چھپا۔ چوتھا شمارہ ۱۸۶۹ء میں چھپا اور اس کا حجم ۱۵۰ صفحے کا ہے۔ پانچویں شمارے کے سرورق پر یہ صراحت کردی گئی ہے: "نمبر ۵ من ابتدائے ۱۰ مئی ۱۸۶۹ء لغایت ۲ فروری ۱۸۷۰ء"۔ کل صفحے اس کے بھی ڈیڑھ سو ہیں جس میں سے آخری سولہ صفحوں میں ایک ہندی مضمون دیوناگری حرفوں میں ہے۔[2]

اس تفصیل سے کھل گیا کہ "دہلی سوسائٹی کا رسالہ" نہ ماہانہ تھا نہ سالانہ بلکہ خاص طور سے کسی متعین وقت پر شائع کرنا مدنظر ہی نہ تھا۔

(۳)

رسالے کی ترتیب عموماً یہ تھی کہ پہلے سوسائٹی کے اجلاسوں کی رودادیں ہوتیں، پھر وہ مقالے جو ان اجلاسوں میں سنائے گئے تھے۔ کسی مقالے پر جو تبصرہ یا مباحثہ جلسے میں ہوا تھا اس کا ذکر جلسے کی روداد میں آجاتا اور مقالے رودادوں کے بعد ہوتے۔

پہلے اجلاس کی روداد سے، جو پہلے شمارے (ص ۱-۳) میں درج ہے، سوسائٹی کے قائم ہونے کی کیفیت، اس کے مقاصد اور اساسی دستور کی تفصیل معلوم ہوتی ہے اس لیے اس روداد کے بعض حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "کیفیت جلسۂ اول... ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء... صبح کے وقت کرنل ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی کی کوٹھی پر بہت سے معزز اور روسائے شہر اور چند صاحبان انگریز اس شہر میں ایک مجلس علمی کے تقرر کے واسطے مشورہ کرنے کو جمع ہوئے۔ اول کمشنر صاحب بہادر نے حاضرین جلسہ سے باعث اجتماع بیان کیا اور فرمایا کہ یہاں کے لوگ اپنے حسن سعی سے اس قسم کی انجمن کو خوب رونق دے سکتے ہیں۔ پھر لاہور

---

[1] اس چھاپے خانے کے مالک منشی بہاری لال "مشتاق" تھے جو ایک "اکمل الاخبار" بھی نکالتے تھے۔ "مشتاق" بھی غالب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے (دیکھو اردوئے معلّٰی حصہ ۱ کا آخری خط)

[2] مختارالدین آرزو صاحب کو یہ اور شمارے دیکھنے کو ملے ہیں ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۷۶ء، ۱۸۸۲ء جن کا حال انھوں نے اخبار "جمہور" علی گڑھ (۶ مارچ ۱۹۵۰ء) میں شائع کیا تھا جو رسالہ "قومی زبان" کراچی میں بھی نقل ہوا۔

کی انجمن مطالب مفیدہ اور علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی اور اور شہروں کی مجالس علمی کی رونق و ترقی کا حال بیان کیا اور ان مضامین کا بھی ذکر فرمایا جن کی طرف اس کمیٹی کو توجہ کرنی چاہیے[۱]۔ اس کمیٹی میں مضامین علمی مثل تواریخ اور پرانے سکّے اور قدیم عمارتوں اور زبانوں کی طرف بھی توجّہ ہوگی اور ترقی[۲] تجارت وصنائع وفنون مدنظر رہے گی۔

۲۔ اور کمیٹی سے یہ کام متعلق ہوں گے: اول ہر مہینے میں ایک بار یا دو بار جلسۂ کمیٹی منعقد کرنا، دوم تقرر کتب خانہ و مکان مطالعہ، سوم منتخب تجویزوں کا چھاپنا۔

۳۔ جب یہ تقریر ختم ہو چکی تو تجاویز ذیل قرار پائیں اور یہ بات ٹھہری کہ ان تجویزوں پر نظر ثانی کرنے کو ایک اور جلسہ یکم اگست کو حسن انعقاد پاوے۔

اول اس سوسائٹی کا نام دہلی سوسائٹی باعث ترقی علوم و رفاہ عام رکھا جاوے۔

دوم صاحبان مفصلہ ذیل عہدہ دار سوسائٹی مقرر ہوں۔ جناب کرنل ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی پیٹرن، جناب کپتان میکمہن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی و مرزا الٰہی بخش صاحب[۳] بہادر پریسیڈنٹ اور لالہ صاحب سنگھ صاحب وائس پریسیڈنٹ۔ ڈبلیو کولڈسٹریم صاحب بہادر جج عدالت خفیہ آنریری سکریٹری۔

سوم صاحبان ذیل کمیٹی کارکن کے ممبر منتخب ہوئے: ڈاکٹر پنی صاحب بہادر، پادری سمتھ صاحب بہادر، مسٹر فٹز پیٹرک صاحب[۴] بہادر اسسٹنٹ کمشنر دہلی، لیفٹننٹ ہارکورٹ صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر دہلی، نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب، پادری وٹلی صاحب بہادر،

---

[۱] اس سے غالباً سوسائٹی کی انتظامی کمیٹی مراد ہے، جو اس جلسے میں قیام پائی۔ اس کا پورا نام "کمیٹی کارکن" تھا۔

[۲] اصل: "تری" جو چھاپے کی غلطی ہے۔

[۳] یہ مرزا الٰہی بخش دلّی کے شاہی خاندان سے تھے۔ مشہور ہے کہ انھیں نے بہادر شاہ کو گرفتار کروایا۔ انگریز انھیں خوب جانتے تھے مگر ان کی آڑ بھگت کو "امور مصلحت" میں شمار کرتے ہوں گے۔ دیکھو "غالب" از غلام رسول مہر، تیسری اشاعت لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۰۔

[۴] دیکھو "حیات جاوید" حصہ ۱، ص ۱۳۳، حصہ ۲ ص ۳۰۰۔

صاحب پرنسپل بہادر دہلی کالج، رائے بنسی لال صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر دہلی، نواب
شہاب الدین احمد خاں صاحب اونریری مجسٹریٹ دہلی، ڈپٹی ولایت حسین خاں صاحب
میونسپل کمشنر دہلی، لالہ مہیش داس صاحب اونریری مجسٹریٹ دہلی، لالہ رام کشن صاحب
خلف لالہ چھنا مل صاحب اونریری مجسٹریٹ دہلی، شیخ محبوب بخش صاحب اونریری
مجسٹریٹ دہلی، پنڈت بشیشر ناتھ صاحب، منشی جیون لال صاحب اونریری مجسٹریٹ دہلی
مولوی ضیاء الدین صاحب اسسٹنٹ پروفیسر کالج دہلی، مولوی جعفر علی صاحب، حکیم
محمود خاں صاحب، پنڈت گوپال سہائے صاحب بابو بینک دہلی، لالہ وزیر سنگھ صاحب
نواب نجف خاں صاحب تحصیلدار ضلع دہلی، چہارم چندہ جو ممبران کمیٹی سے لیا جائے گا
آٹھ آنہ ماہوار سے زائد نہ ہو۔ پنجم گورنمنٹ سے اس امر کی درخواست کی جاوے کہ وہ
سوسائٹی کو عمارت عجائب خانہ سے دو کمرے، ایک واسطے کمیٹی کے اور ایک واسطے
کتب خانہ اور ریڈنگ روم کے عنایت کرے۔

بعد ازاں جلسہ برخاست ہوا۔"

(۴)

اس پہلے جلسے کی کارروائی سے پایا جاتا ہے کہ دلی کے اس وقت کے کمشنر کرنل ہملٹن کی تحریک
اور ترغیب سے سوسائٹی کی بنا پڑی۔ اس دور کے اکثر اعلیٰ انگریز حکام کی طرح ہملٹن کو بھی ہندوستان
کی زبان اور ادب سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک ذخیرہ ہملٹن کے قلمی نسخوں کا بھی محفوظ
ہے۔ دلی کی عدالت خفیفہ کے جج، کولڈاسٹریم صاحب[1] سوسائٹی کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے،
جو غالباً لاہور کی "انجمن مطالب مفیدہ" کے بھی رکن تھے اور انگریزی بھی پیش پیش ہیں۔ پریسیڈنٹ
دو ہیں، ایک مرزا الٰہی بخش، دوسرے دلی کے ڈپٹی کمشنر کپتان میک ماہن۔ ماسٹر پیارے لال اس جلسے
میں نہیں، پھر بھی غالباً وہ شروع ہی سے سوسائٹی کے کارکنوں میں تھے اور سکریٹری کی خدمت

---

[1] دتاسی نے ان کا نام C (ک) کی جگہ G (گ) سے لکھا ہے اور انھیں کو سوسائٹی کا بانی خیال
کیا ہے۔ (خطبات: ص ۳۳۹ اردو ترجمہ: ص ۵۶۴، یہاں ترمیم چاہتا ہے)

کئی برس انجام دیتے رہے۔ بہت ممکن ہے ان کے تقرر کا ذکر رسالے کے دوسرے شمارے میں آیا ہو جو موجود نہیں۔ دلی کے بہت سے ممتاز لوگ کارکن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے شریک ہیں مگر مفتی صدرالدین خاں "آزردہ" اور مرزا اسداللہ خاں غالب کا نام ابھی نہیں آیا۔ مفتی صاحب ایک تو بہت بوڑھے تھے اور بیمار، دوسرے حکومت کے سخت معتوب[1]، مرزا صاحب ہاتھ پانو مار کے معتوبوں کے دائرے سے نکل آئے تھے، دربار بھی کھل گیا تھا[2]، پر بڑھاپا ان کا بھی تھا۔ اس جلسے میں جو مشورے کے لیے اور انتظامی کمیٹی بنانے کی غرض سے کیا گیا تھا، مرزا صاحب کو شریک ہونے کی تکلیف نہ دی گئی ہو گی۔ اگلے جلسے میں تشریف لاتے ہیں۔

(۵)

غدر سے پہلے بھی کچھ ادبی یا علمی انجمنیں جابجا قائم تھیں، مگر وہ زیادہ دن یا تو چلیں ہی نہیں یا اس شورش کے زمانے میں درہم برہم ہو گئیں۔ ان میں سب سے ممتاز دہلی کالج کی "ایجوکیشن کمیٹی" تھی جو ۱۸۲۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ اور بعد کو "دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" اور مختصراً "ورنیکلر سوسائٹی" یا "ٹرانسلیشن سوسائٹی"[3] کہلانے لگی۔ اسی کو "اردو سوسائٹی" بھی کہتے تھے[3] ظاہراً اس لیے کہ اس نے مختلف زبانوں سے نہایت اہم کتابوں کی ایک بڑی تعداد اردو میں منتقل کر لی تھی اور ۱۸۵۷ء تک ان میں سے سوا سو سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکی تھیں۔ غدر کے بعد یہ کمیٹی یا سوسائٹی نہ پنپ سکی۔ گو کہ دہلی کالج بری بھلی طرح ۱۸۷۷ء تک چلتا رہا۔ جب امن ہو گیا تو نئی نئی انجمنیں کھلنے لگیں اور بڑے ہی شہروں میں نہیں، چھوٹے چھوٹے شہروں یا قصبوں میں بہت سے علمی، ادبی، معاشرتی ادارے کھل گئے۔ جن میں مقامی حکام بھی بظاہر شوق سے شریک تھے۔ چنانچہ "دہلی سوسائٹی" کے پہلے جلسے میں کرنل ہملٹن نے اپنی افتتاحی تقریر میں زیادہ سر برآوردہ اور اچھا کام کرنے والے اداروں کا نام لے کر دلی والوں کو شوق دلایا ہے۔ ان میں سے دو کا خاص طور پر

---

[1] "غالب" از غلام رسول مہر، تیسری اشاعت، ص ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۵۔

[2] ایضاً، ص ۳۱۸

[3] مرحوم دہلی کالج۔ از عبدالحق در رسالہ اردو ۱۹۳۳ء، ص ۱۶۴)

ذکر کیا۔ لاہور کی ڈاکٹر لائٹنر کی قائم کی ہوئی "انجمن مطالب مفیدہ" کا اور علی گڑھ کی "سائینٹیفک سوسائٹی"[1] کا۔ لاہور کی انجمن کا افتتاحی جلسہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ لیکن قرینہ کہتا ہے کہ اس انجمن کا کام اس سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا جیسے علی گڑھ کی سوسائٹی کے افتتاح کی رسم ۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو ادا ہوئی۔ گو کہ سرسید احمد خاں نے اس کا کام کم سے کم تین برس پہلے شروع کر دیا تھا[2] اور جب سوسائٹی کچھ کام دکھا کر مشہور ہو چکی اور مناسب موقع ہاتھ آیا تو افتتاح کی رسم ادا کی گئی۔ جس زمانے میں دہلی سوسائٹی کی بنا پڑی اسی کے قریب قریب سیال کوٹ اور حصار میں بھی ادبی انجمنیں قائم ہوئیں[3]۔

لکھنؤ میں "مجلس تہذیب" یا "انجمن تہذیب" (جسے عام طور پر "جلسۂ تہذیب" کہتے تھے) ۱۸۶۸ء میں قائم ہوئی تھی جس کے پہلے سکریٹری منشی شیو نرائن تھے۔ وہ بھی ایک رسالے کی شکل میں اپنے جلسوں کی کارروائی کو شائع کرتی رہتی تھی[4]۔ رسالے کے سرورق پر ایک دوبیت کا "قطعہ تاریخ بنائے انجمن تہذیب" چھپا کرتا تھا جس کا یہ مصرع مادۂ تاریخ تھا۔

"انجمن افروز عقل جلسۂ تہذیب ہے"[5]

"جلسۂ تہذیب" کم سے کم بیس برس بڑی سرگرمی سے اور بڑی کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا اس کے بعد وہ رونق نہ رہی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر یا بیسویں صدی کے شروع میں جب یہ انجمن مردہ ہو چکی تھی۔ کچھ صاحبوں نے اسے جلانے کی فکر کی اور اس کا نتیجہ بس یہ ہوا کہ ۱۹۰۲ء میں اس کی حیثیت ایک خاموش سے کلب کی تھی، اور اس کے کمروں میں جو گولہ گنج نواب کی بارہ دری (محلہ امین آباد) میں تھے۔

---

[1] دتاسی "خطبات" ص ۲۹۳ (اردو ترجمہ ص ۴۹۶)

[2] "حیات جاوید" حصہ ۱ ص ۱۰۹، حصہ ۲ ص ۴۷، ۴۹

[3] دتاسی "خطبات" ۳۲۹ (اردو ترجمہ ص ۵۶۴)

[4] دتاسی "خطبات" ص ۴۰۰، ۴۰۴ (اردو ترجمہ ص ۶۷۰، ۶۹۰) اور تبصرہ جلد ۱ صفحہ ۱۵ اور ۱۴ وغیرہ جن کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔

[5] اس مصرعے سے ۱۸۶۸ء نکلتے ہیں۔ دتاسی نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے (خطبات ص ۴۴۷) کے حاشیہ ۲ میں اس مصرع کے لفظوں کو لاطینی حرفوں میں لکھا ہے۔ نہیں معلوم مترجم صاحب اس اہم حاشیے کو چھوڑ کیوں گئے (اردو ترجمہ ص ۷۹۱)

چند تعلیم یافتہ اصحاب شام کو جمع ہو جایا کرتے تھے بعد میں "جلسۂ تہذیب" اور اس کا کتاب خانہ انجمن "رفاہ عام" کی عمارت میں اٹھ گیا۔ اور اب تک وہیں ہے۔ منشی وصی احمد آخگر ایڈوکیٹ لکھنؤ نے جو ادھر کئی برس "جلسہ تہذیب" کے سکریٹری رہ چکے ہیں مجھے بتایا کہ جلسے کے کتاب خانے میں کتابیں تو پانچ ہزار جلد سے کچھ اوپر ہیں مگر خود انجمن کے مطبوعات میں سے کسی چیز کا وہاں ایک نسخہ بھی نہیں۔

(۶)

"دہلی سوسائٹی" کا دوسرا جلسہ دو ہفتے بعد ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ باوجود بڑھاپے کے ضعف اور بیماریوں کی تکلیف کے مرزا غالب بھی شریک ہوئے۔ ممبروں کی فہرست میں اپنا نام لکھا، ایک مضمون بھی پڑھا۔ مضمون میں بڑے لطیف پیرائے میں بڑھاپے کا عذر کر کے گویا آئندہ جلسوں میں حاضر آنے سے معافی بھی چاہ لی۔ مگر تحریری مراسلات کا جواب دینے کا وعدہ ان لفظوں میں کیا:

"اگر کسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے۔"

اس وعدے کو پورا بھی کیا، جیسا کہ رسالے کے ایک اگلے شمارہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک اور وعدہ یہ بھی تھا:

"اگر تحریر نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم آوے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔"

حکم کوئی ایسا، جہاں تک معلوم ہوتا ہے بھیجا نہیں گیا۔ یہ قصور انجمن کا تھا۔

اس جلسے میں سب سے پہلے سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ، لالہ صاحب سنگھ نے اپنے مضمون "طریقۂ مہاجنی ہندوستان" کا ایک حصہ پڑھا اور یہ پہلا مقالہ تھا جو انجمن کے سامنے پڑھا گیا پاؤ گھنٹے تک نوٹ کے فوائد کے باب میں مباحثہ ہوتا رہا اور اثنائے گفتگو میں پادری اسمتھ صاحب اور جناب کرنل ہملٹن صاحب نے نوٹ کے بہت سے فوائد بیان کیے۔ دوسرا مضمون منشی جیون لال صاحب نے "فواید مطالعۂ علم تاریخ" پر پڑھا۔

"پھر صاحب کمشنر بہادر نے نواب اسد اللہ خاں غالب سے فرمایا کہ میرزا صاحب آپ نے بھی کوئی مضمون ہماری سوسائٹی کے لیے لکھا ہے۔ نواب صاحب نے بیان کیا کہ میں نے کچھ لکھا ہے مگر مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ کھڑا رہ کر سناؤں اگر اجازت ہو بیٹھے بیٹھے پڑھوں۔ صاحب موصوف نے فرمایا بہت

اچھا. نواب صاحب نے اسی وقت اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا اس میں کچھ حال تباہی شہر دہلی اور کمی بارش کا تھا سب حاضرین جلسہ سن کر بہت خوش ہوئے اور نواب صاحب کی بہت تعریف کی اس کے بعد سکریٹری نے مضمون اشتہار سوسائٹی کا پڑھا وہ سب نے پسند کیا اور کہا کہ یہ اشتہار چھاپہ ہو کر مشتہر کیا جائے، پھر فہرست چندہ بحیثیت پیش ہوئی اور جو جو صاحب اس وقت جلسے میں موجود تھے ممبر سوسائٹی مقرر ہوئے اور سب نے ایک کاغذ پر اپنے نام لکھ دیئے" (ص ۵)

اس کے بعد صفحہ ۱۶ تک اور جلسوں کی رودادیں ہیں، جن میں کوئی خاص دلچسپی کی بات نہیں. سوا اس کے کہ ۱۷ نومبر کو جلسے میں جو پانچ نئے ممبر ہوئے ان میں مولوی عبداللطیف خاں صاحب بہادر" اور" سرسید احمد خاں صاحب بہادر" بھی ہیں. صفحہ ۱۶ سے ۱۸ تک ایک فہرست سوسائٹی کے ممبروں کے ناموں کی ہے جس میں" صاحبان انگریز" کے تحت ۸۰ نام ہیں اور" صاحبان ہندوستانی" کے تحت ۶۰ نام اور ان میں "۳۰ نواب اسداللہ خاں غالب" اور "۶۰ منشی ذکاءاللہ صاحب" ہیں پھر "۴۴. سید احمد خاں صاحب بہادر"

(۷)

غالب نے جو مضمون ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کے جلسے میں پڑھا تھا اور جو پہلے شمارے کے صفحہ ۲۲ پر شروع ہو کر صفحہ ۲۴ پر ختم ہوتا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے.

"مضمون نواب اسداللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب"

"حکام معدلت فرجام اور صاحبان والا مقام کی جناب میں اور حاضران انجمن اور دانند گان ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے اس سے میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دہلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور ایسے زمانہ میں

ے مالک رام صاحب نے ستمبر ۱۹۳۹ء کے" ادبی دنیا" لاہور میں اس مضمون کو شائع کیا تو تعارف کے طور پر لکھا: "مرزا کی یہ تحریر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں"..... "ادبی دنیا" کے دفتر والوں نے "تحریر" کے لفظ کو "خط" کا ہم معنی جان کر مضمون کا عنوان "غالب کا ایک غیر معروف خط" قرار دیا. کچھ کتابت کی غلطیاں متن میں بھی در آئیں.

داوگر سے لڑائی کا قصد کیا، میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انھیں کی گولی بارود سے ان پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے چار دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی، قلعہ اور شہر اور باہر خونریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی اس شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا۔ قوم انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی، انھوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو عفو جرائم منظور رہا، مگر قہر حاکم حقیقی بدستور رہا، نہ مکین کا پتہ، نہ مکان کے آثار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اگلے سے بہتر ہے، مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی، وہ کدھر ہے۔ شعر

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آں کہ شاہجہاں ساخت در زمانِ قدیم

رفعِ فتنہ و فساد، ظہورِ امن و داد مسلم، لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی۔ خلافِ تقدیر بن نہیں آتی۔ تین برس برابر کال رہا، ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سلگنا، گھروں میں جابجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز، خاک شعلہ انگیز، دریا اور کوئے کا پانی زہرِ آب، مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب۔ اساڑھ اور ساون، برسات کے مہینے، تمام ہوئے۔ ساون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مینہ ہوئے، جس میں پانی اتنی قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھو لیے۔ پایان کار کا حال خدا جانے، خلق اوس[1] کے اسرار کو کیا جانے۔ گرانی اور ارزانی ایک امر عام ہے۔ مجھے خاص اپنے مدعا سے کام ہے۔ بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں، سچ اگر پوچھیے، تو نیم جان ہوں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں، اور بزم نشینی کہاں۔ نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں، سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں۔ مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں۔ اگر کسی امر میں بذریعۂ خط مجھ سے پوچھا جائے تو وہ کچھ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے یا اگر تحریر نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم آئے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آیندہ حکام کے پسند نہ ہو، یا مقبول ہو جاوے۔ ۱۸۰۶ء عیسوی سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے، سرکار انگریزی کا نمک خوار ہوں۔ ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہ بحر و بر حضرت فلک رفعت ملکہ معظمہ کا مدحت نگار ہوں۔ دو قصیدے میرے ولایت پہنچ گئے۔ ان میں سے

---

[1] اصل میں یوں ہی ملا کر لکھا گیا ہے۔ مقصود ہے "اوس سے"۔

ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آگئی۔ تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود اور مطلع اوس کا یہ ہے۔

نامہ ز وکٹوریا چونا مور آمد

از افق نامہ آفتاب برآمد

یہ قصیدہ اوس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے۔ اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جائے۔

اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموع صاحبان عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔

راقم اسداللہ خاں شاعر غالب تخلص

برادر زادہ نصراللہ بیگ خاں رئیس سونگ[1] سونسا

"مرقومہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء"

(۸)

دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر یہاں اور مضمونوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض اور صاحبوں نے پڑھے۔

پہلے شمارے ہیں (۱) رائے منبی لال "خواید ہر ایک قسم کی حروف شناسی کے بیان میں" (۲) نواب شہاب الدین احمد خاں "علم اخلاق" پر جو یوں شروع ہوتا ہے: "خدا کو سجود اور انبیا کو درود، حکام کو اکرام اور احباب کو سلام بعد اس کے ہیچمداں شہاب الدین احمد خاں ابن نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر گزارش کرتا ہے کہ علم اخلاق ایسا بڑا علم جس کو ہم کہہ سکتے ہیں انتہائے علوم ہے۔ علم طب کی بزرگی میں کچھ کلام نہیں مگر وہ معالجۂ جسمانی اور یہ حکمت روحانی جتنا شرف روح کو جسم پر اسی قدر فضیلت علم اخلاق کو علم طب پر۔ پھر علم اخلاق کو دو قسم پر منقسم جاننا چاہیے۔ ایک موہبتی وہ خاص انبیا کے واسطے ہے" (۳) لالہ چندو لال مدرس مشن اسکول "ان مختلف زبانوں اور حرفوں کی بابت جو ہندوستان میں اب جاری ہیں اور من جملہ ان کے کون سے حروف اس قابل ہیں کہ بہ ترجیح اوروں کے تمام ملک میں جاری ہوں اور ان سے کیا فائدے حاصل ہوں گے" (دیوناگری حرفوں کی حمایت میں)

---

[1] اصل میں یوں ہی ہے۔

(۴) شیخ محبوب بخش، "واسطے ترقیِ تجارت اور دفعِ مضراتِ تجارت کے کون سی تدبیریں قریب القیاس اور ممکن الوقوع ہیں ان کو بیان کرو" (کذا) (۵) منشی جیون لال، "احوال نوشیروانِ عادل بادشاہ ایران کا جس کا لقب کسریٰ بھی تھا اور ابوالخیر"

تیسرے شمارے میں۔ پندرہ روزہ جلسوں کی روداووں کے بعد دو سپاس نامے ہیں ایک سرڈانلڈ میکلوڈ، لیفٹننٹ گورنر پنجاب کی، دوسرا ہملٹن کمشنر دہلی کی خدمت میں، اور ہملٹن کا جواب ہے۔ پھر صفحہ ۲۸-۲۹ پر ان مضمونوں کی فہرست ہے جو سوسائٹی میں پڑھے گئے تھے، بخلاف اور شماروں کے اس میں جتنے مضمون شامل ہیں، ان میں ہر ایک کے صفحوں میں گنتی کے ہندسوں کا سلسلہ الگ ہے، غالب کے مضمون کا ذکر فہرست میں ان لفظوں میں ہے۔

"نواب اسداللہ خاں غالب درباب تباہی شہر دہلی ص ۲۹)

ایک مضمون "درباب راہ ورسم صاحبانِ انگریز و ہندوستانی مصنفہ سکریٹری" ماسٹر پیارے لال کا ہے اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس ملک کے آدمی احسان فراموش نہیں ہیں جو شخص ان سے ذرہ سی محبت کرتا ہے یہ اس سے سہ چند بلکہ چوچند محبت کرنے کو تیار ہیں بقول جناب اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب ؎

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دور دور"

۱۔ دیکھو حیاتِ جاوید، حصہ ۲، ص ۱۰۰، ۳۰۰۔

چوتھے شمارہ میں ۔ ستمبر ۱۸۶۷ء سے اپریل ۱۸۶۹ء تک کے جلسوں کی کارروائی درج ہے۔ پانچویں شمارے کا ذکر اوپر (فقرہ ۲ میں) آچکا ہے کافی ہے۔

(۹)

یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کے بڑھاپے کا آخری وقت ہے۔ ضعف کی شدت ہے امراض کا ہجوم ہے۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کے جلسے کی روداد میں ہے۔

"دو جلد گلزار منہدی، بابو کنھیا لال نے لاہور سے اور دو جلد قصہ بہمن، منشی حکم چند نے اور چھ جلد سبد چین نواب اسد اللہ خاں صاحب غالب نے سوسائٹی کو عنایت کی۔ ممبران سوسائٹی نے ان کا شکریہ ادا کیا، بعدہٗ جلسہ برخاست اور چیرمین کا شکریہ ادا کیا گیا" (ص ۴)

اس جلسے سے پہلے ستمبر ۱۸۶۷ء کو جلسہ ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے "سبد چین" کے نسخے ۱۰ ستمبر اور

۱۔ یہ ایگزیکیٹو انجینیر اور مختلف مباحث پر متعدد کتابوں کے مؤلف یا مترجم تھے جو ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۹ء تک شائع ہوئیں۔ ان کی "گلزار منہدی" اخلاقی مطالب کی کئی مثنویوں پر مشتمل ہے اور ۱۸۶۷ء میں لاہور میں چھپی (رتاسی، تاریخ ادب ج ۲، ص ۱۵۹۔ ۱۶۱)

۲۔ انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور کلکتہ یونی ورسٹی سے بی اے اور ایم اے میں امتیاز حاصل کیا۔ دہلی کالج میں درس بھی دیتے تھے۔ "قاطع القاطع" کے مصنف پر غالب نے نالش کی تو یہ بھی مرزا صاحب کے گواہوں میں سے تھے اور ۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو ان کی گواہی ہوئی۔ جرح میں سوال ہوا: تمہاری تصنیف پر مرزا صاحب نے تصدیق لکھی؟ جواب ان کا تھا: ہاں لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے (رسالہ اردو ۱۹۳۳ء، ص ۶۹، ۱۹۳۴ء، ص ۱۵۱ اور ص ۱۶۰، ۱۶۱)۔ عجب نہیں وہ تصنیف یہی "قصہ بہمن" ہو۔ حکم چند، ۱۸۶۲ء سے پہلے امرت سر میں تحصیل دار اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ قانونی کتابوں کی تالیف ۱۸۵۹ء میں یا کچھ پہلے شروع کردی تھی (رتاسی، تاریخ ادب جلد ۱، ص ۶۱۴) تقریباً دس بارہ برس بعد حیدرآباد جارہے اور وہاں معزز خدمتوں پر کام کرتے رہے۔ آخر میں مجلس وضع قانون کے نائب معتمد تھے کہ ۱۹۰۱ء میں دکوئی ۶۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران میں بڑے پائے کی قانونی تصنیفیں شائع کرتے رہے جو خاص کر ان کی شہرت کا باعث ہوئیں۔

۲۲ اکتوبر کے درمیان کسی تاریخ نیہ بھیجے ہوں گے۔ "سبد چین" منتصف ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (یعنی اگست ۱۸۶۷ء) میں دلّی کے "مطبع محمدی" میں چھپی تھی۔ نسخے اس کے آخر یا شروع ستمبر میں چھاپے خانے سے تیار ہوکر نکلے ہوں گے۔ غالب نے سوسائٹی کو بلاتاخیر یاد کیا۔

کوئی برس بھر بعد ۲۱ جولائی ۱۸۶۸ء کے جلسے میں:

"سکریٹری نے روبکار محکمہ ڈائرکٹری مورخہ ۱۰ اپریل درباب رائے کتاب مفزعۃ العملہ[1] اور کیفیت[2] جناب مرزا نوشہ صاحب[3] و نواب علاؤالدین احمد خاں صاحب پڑھ کر سنائی جناب مرزا صاحب کی رائے کو سب نے پسند کیا اور جملہ ممبروں کی رائے سے طے ہوا کہ ممبران سوسائٹی میں سے جو صاحب اور اپنی رائے اس باب میں لکھیں وہ اور نیز یہ جواب پڑھی گئی ہیں، ڈائرکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں بعد ترمیم مرسل ہوں" ص ۲۳)

۲۱ جولائی سے پہلے ایک جلسہ ۱۴ جولائی کو ہوا تھا، مگر اس میں کچھ کارروائی (شاید نصاب کے نہ ہونے کے سبب) نہیں ہوئی اور اس سے پہلے ۲۷ اپریل کو جلسہ ہوا تھا، مفزعۃ العملہ کے

---

[1] مفزع، یا، مفزعۃ یعنی پناہ کی جگہ۔ یہ کتاب یا رسالہ اسی بحث سے متعلق ہوگا۔ جو ایک ماہانہ رسالے "معلم العلمہ" کا تھا۔ دتاسی ۱۸۶۲ء کے خطبے میں کہتا ہے "ایک موقت مجموعہ، کا نام "معلم العلمہ" ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری عملے یا اہل کاروں کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے" (خطبات ص ۱۸۸، اردو ترجمہ ۳۳۲) پھر اپنی تاریخ ادب (مطبوعہ ۱۸۷۰ء) ج ۲، ص ۱۲ میں، بتاتا ہے کہ اس رسالے کو سدا سکھ ترتیب دیتے ہیں اور ڈائرکٹر تعلیمات شمال مغربی کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے "معلم العلمہ" کا ایک شمارہ (ج ۱، نمبر ۱) بابت اکتوبر ۱۸۵۵ء، مختار الدین احمد صاحب آرزو نے حاصل کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہتمام منشی سدا سکھ لال کے مطبع انوار الابصار میں چھپا تھا مضمون کچھ عام دلچسپی کے ہیں اور زیادہ تر قوانین و ضوابط کے متعلق اطلاعیں ہیں۔

[2] یعنی کیفیت لکھی ہوئی ان اور ان صاحب کی "رپورٹ" کے لیے "کیفیت" بولتے تھے۔

[3] پہلے کو رسالہ دہلی سوسائٹی" کا یہ شمارہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے بعد شائع ہوا ہنیں تو جناب صاحب کمشنر بہادر کی دہلی سوسائٹی کے رسالے میں اپنا ضعف دیکھ کے غالب پر جانے کیا گزرتی۔

متعلق جو روبکار ڈائرکٹر کے دفتر سے جاری ہوا تھا وہ ۱۱ اپریل کا تھا مگر کتاب کے گشت میں کچھ دیر ضرور لگی ہوگی اور ۲۰ اپریل کے جلسے میں رائیں پیش نہیں ہوئیں۔ بہر تقدیر کتاب غالب کے پاس اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں پہنچی ہوگی، اور انھوں نے، یوں سمجھنا چاہیے مئی کے وسط اور جولائی کے اوائل کے درمیان کسی تاریخ رائے لکھی ہوگی۔ کیا خوب ہوتا کہ جو رائیں آئیں تھیں وہ روداد میں پوری پوری درج کر دی گئی ہوتیں۔

سوسائٹی کے سکریٹری منشی پیارے لال آشوب[1] جو زیادہ تر "ماسٹر" کر کے مشہور تھے، غالب کو بہت عزیز تھے۔ جب وہ لاہور میں کیوریٹر مقرر ہوئے اور دلی سے لاہور جانے والے تھے تو سوسائٹی کے سکریٹری کی خدمت سے بھی استعفا دے دیا۔ ۹ دسمبر ۱۸۶۸ء کے جلسے میں ان کا استعفا پیش ہو کر منظور ہوا اور "ماسٹر جنید و لال سکریٹری کیے گئے"۔ اسی جلسے میں جملہ ممبران کی طرف سے سکریٹری پیارے لال کو ایک سپاسنامہ دیا گیا۔ (ص ۳۰)

یہ سپاسنامہ رسالے کے شمارہ (۴) کے صفحہ ۳۹ پر شروع ہو کر صفحہ ۴۲ پر ختم ہوتا ہے۔ اخیر دو صفحوں پر ممبروں کے (یعنی سپاس نامہ دینے والوں کے) نام ہیں۔ غالب کے نام کے آگے کچھ عبارت بھی ہے جو انھوں نے سپاس نامے پر دستخط کرنے کے وقت لکھ دی ہوگی۔ رسالے میں یہ نام مع القاب کے لکھے گئے ہیں اور غالب کا نام اور وہ عبارت اس صورت سے چھپی ہے کہ سپاس نامے پر دستخط کرنے والوں کے ناموں کی فہرست ترتیب دینے والے نے "مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب" لکھ کر ایک کان کھینچ دی اور اس کے بعد غالب کی لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے، اس طرح:

"مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب (فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا جو غم و اندوہ ہوا ہے، میرا جی جانتا ہے، بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ہے" (ص ۴۱

(۱۰)

مرزا غالب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ دو شنبے کا دن ہے۔ دوسری ذی قعدہ بارہ سو پچاسی ہجری اور

---

[1] یہ اس مقدمے میں غالب کے گواہوں میں تھے۔ (اردو، ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۴) نیز دیکھو ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری (۱۸۴)

«پندرہویں فروری اٹھارہ سو انہتر عیسوی»[1] دہلی سوسائٹی کی طرف سے کسی ماتمی جلسے کا ہونا یا اس کے کسی جلسے میں کوئی تعزیت کی تحریک یا تجویز ہونا اس کی رودادوں سے پایا نہیں جاتا۔ تعجب ہے۔ ہاں، ہو سکتا ہے کہ ارکانِ انجمن نے یوں سوچا ہو:

"ہمارے ہی گھر تو موت ہوئی ہے۔ ہم پرسا دینے کہاں جائیں؟" اور خاموش ماتم کو بین و بکا سے بہتر جانا ہو۔ باہر سے ایک تعزیت نامہ آتا ہے اور جلسے میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کی روداد یہ ہے:

۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء جمعے کے دن، ایک معمولی عام جلسہ سوسائٹی کا منعقد ہوتا ہے۔ حاضرین کی فہرست میں حکیم غلام رضا خاں کا نام آتا ہے اور اسی کے بعد مرزا حسین علی خاں صاحب فرزند متبنٰی مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب مرحوم کا نام۔ صدر نشین "کرنل کمپنل صاحب بہادر سٹار آف انڈیا" ہیں۔ روداد کا فقرہ ۳ ہے۔

> "سکریٹری نے خط آمدہ انجمن تہذیب لکھنؤ جو درباب تعزیت
> مرزا نوشہ صاحب مرحوم آیا تھا۔ مرزا حسین علی خاں صاحب
> کے روبرو جلسہ عام میں پڑھا۔"[2]

۱۴ فروری ۱۹۶۹ء

---

[1] تقویم کی رو سے دو شنبہ، ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے مطابق ہے تیسری ذیقعد ۱۲۸۵ھ کے۔ مگر جب وہ لوگ جو اس وقت دلی میں موجود تھے، یک زبان ہیں کہ اس دو شنبہ کو ذیقعد کی دوسری تھی تو معلوم ہوا کہ دلی میں ذیقعد کا چاند ۱۳ فروری کو دیکھا گیا تھا۔ اس صورت میں تقویم کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ایک چیز آنکھ سے دیکھ لی تو تخمین کا کیا دخل۔

[2] نہایت افسوس ہے کہ خط جو جلسے میں پڑھا گیا تھا سوسائٹی کی مطبوعہ روداد میں نقل نہیں ہوا۔

خواجہ احمد فاروقی

معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاؤ الدین خلجی کا زمانہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور خلجیوں کی قدردانی و علم پروری کی وجہ سے ہندوستان علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد ہستیاں یہاں آکر جمع ہو گئی تھیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے علاؤ الدین خلجی کے دربار کے فقرا، علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے۔ شبلی نے ان میں سے صرف ۴۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے۔

"لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔"[۱]

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ خسرو کی جامعیت اور اس کی شاعری اور زباں دانی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے:

۱۔ شعر العجم ج ۲ ص ۹۶

"در حق او مرتبۂ سخن گزاری ختم تمام است"[1]۔

خسرو کو تمام اکابر نے "طوطیِ ہند" مانا ہے۔

عرفی ـــ بہ روحِ خسرو از یں پارسی شکر دارم

کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

تاہم بعض شعرا قومی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ عبید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے:

غلط افتاد خسرو راز خامی

کہ سکبا پخت در دیگِ نظامی

اس تعصب کی وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے ہیں جو اہل زبان کے یہاں نہیں ملتے ۔۔۔ بعد میں یہ مسئلہ "استعمال ہند" بہت بڑا نزاعی سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ متاخرین میں خان آرزو نے بھی اس استعمال ہند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفی کے اختلافات اور نوک جھونک کی ایک وجہ یہی ایرانی ہندی نزاع تھی۔ خافی خان نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔ سگ بچوں کے سونے کے پٹے پڑے ہوئے تھے۔ عرفی نے فیضی سے پوچھا: "مخدوم زاد ہا بہ چہ اسم موسوم اند؟"

فیضی نے کہا: "بہ اسم عرفی"

عرفی نے برجستہ کہا "مبارک باشد"[2]

ابوالفضل بھی عرفی سے جلتا تھا۔ اکبرنامے میں لکھتا ہے:

دریں از سخن سرائی برو کشودہ بودند، درخور نہ گریست و بر پاستانیاں زبانِ طعن کشود۔ غنچہ استعداد نشگفتہ پژمرد"

اکبر کے زمانے سے شاید ہی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا ہدف نہ بنا ہو۔

1۔ تذکرۃ الشعرا، لاہور، ص ۱۵۵

2۔ لیکن فیضی نے اپنے مکاتیب میں عرفی کی بڑی تعریف کی ہے۔

عرفی، ظہوری، قدسی، زلالی سب ہی اس تیغِ ہندی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و دہش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے:

در کشورِ ہند شادی و غم معلوم! — آں جا دلِ شاد و جانِ خرم معلوم!
جائے کہ بیک روپیہ آدم بخرند — آدم معلوم و قدرِ آدم معلوم!

والہ ہروی لکھتا ہے:

در ہند کہ زاد گانش تارک ادب اند
لبریزِ جہالت اند و فاضل لقب اند

حزیں کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لیے "زمین شور" کا حکم رکھتا ہے۔ اسے تمام دار الخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رتبۂ فضیلت رکھتا ہو۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسالیب و افکار بھی معرضِ بحث میں آگئے تھے۔ عہد حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اس ہندی اسکول کی تعریف مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"افکار و احساساتِ اہالیِ ایں سرزمین بہ تاثیرِ عوامل سیاسی و طبیعی بر بیرو رعوالم توہم و تخیل و مجسم انگاشتن معانیِ باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم بدور می باشد متمایل است و در ادائے ایں تخیلات و توہمات وسائل مزبورہ کہ بہ منزلہ اصل و آنچہ جزو است از فروعِ آں می باشد تشبیہ معقولات است بہ محسوسات و بالعکس ولے رعایت تناسب تام بین مشبہ و مشبہ بہ و بیان ایں قبیل تشبیہات است بہ طریقِ استعارہ کہ نوعے از مبالغہ در تشبیہ می باشد نتیجۂ ایں سبکِ بیان پیدائش معانی و مضامینے است بسیار غریب و دور از ذہن کسانے کہ بہ افکار ہندی آشنا نیستند بہترین نامے کہ بدیں طرز بیاں می تواں داد "خیال ہندی" است کہ منتخب و مستعمل خود ہندی ہا است نمونۂ "خیال ہندی" ایں است کہ از مژہ دل داریک مشت سوزن بہ سازند و آں را در خیاط خانۂ

---

۷ سبک یعنی روشِ خاص

دل بہ ریزند و خیاطِ گریہ را بہ گویند تا از تکّہ و پارہائے دل برائے چشم پیراہن بہ دوزند و آں گاہ
ایں معنی را در قالبِ الفاظِ فارسی بہ ریزند و بہ گویند۔

عرفی ؎
مشتِ سوزن بہ دلم زاں مژۂ تار بختہ اند
گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہنِ چشم

و بہ آں کہ بر سرِ مژگان بے نم خود خاک بہ ریزند و آں گاہ دست دل خود را بگیرند و بہ اتفاق
او بہ گدائی روند تا قدرے غم بہ دست آورند و در ادائے ایں معنی گویند۔

خاک دیگر بر سرِ مژگان بے نم می کنم
دست دل می گیرم و در یوزۂ غم می کنم ([1] "نظیری")

علی اکبر شہابی خراسانی نے "روابط ادبی ایرانی و ہند" میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز نے
بعض ایرانیوں کو متاثر کیا ہے لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحب ذوق لوگوں نے اس تقلید
کو کبھی پسند نہیں کیا[2]

شہابی نے "سبک ہندی" کی خصوصیات میں :

خیال بافی، مضامین باریک، افکار پیچ در پیچ۔ خیالات دور از طبیعت و استعارات و تشبیہات
غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق و طبع ہندیاں" اور

"مبالغہ و اغراق و بے ہودہ کاری و تکلفاتِ غیر مستحسن[3]" پر زیادہ زور دیا ہے۔

ہمایوں، اکبر اور جہاں گیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے[4] مغلوں کے
آخری زمانے میں تو سیاسی عنانِ اختیار بالکل ایرانیوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی بسر جادو ناتھ سرکار

---

[1] بہ حوالہ "روابط ادبی ایران و ہند"

[2] روابط ادبی ایران و ہند طہران ص ۹۱

[3] مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ تکلفات غیر مستحسن سبک ہندی کے وجود میں آنے
سے بہت پہلے فارسی شاعری میں موجود تھے۔

[4] "مغلوں کے تعلقات ایران سے" از ا ے رحیم اسلامک کلچر حیدر آباد دکن ۱۹۳۴ء

نے زوال سلطنت مغلیہ میں لکھا ہے کہ ۱۷۴۴ء میں ایرانی اثر تمام دربار پر چھا گیا اور تورانی پارٹی کو شکست فاش ہوگئی۔ میر آتش کا عہدہ ایک تورانی سے لے کر صفدر جنگ ایرانی کو دے دیا گیا (۱۱ مارچ ۱۷۴۵ء، ۱۱۵۸ھ میں بادشاہ کے ایما سے صفدر جنگ کے لڑکے (نواب) شجاع الدولہ کی شادی نواب اسحاق خاں دوم نجم الدولہ کی بہن سے کردی گئی۔ یہی خاتون وارن ہیسٹنگز کے مظالم کا ہدف بنیں اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس رشتے نے ایرانی اثرات کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۳۶ء سے مغلوں کی تاریخ، ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش کی داستان ہے۔ سیاست کے علاوہ ادب کے میدان میں بھی یہ آویزش نظر آتی ہے۔

محمد علی حزیں ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان آیا ہے اور اس نے ۳۴ برس عمر عزیز کے اس سرزمین پر بسر کیے لیکن وہ کبھی یہ نہ بھول سکا کہ "میں ایرانی ہوں" اور یہ لوگ "ہندوستانی" وہ ابوالفضل اور فیضی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

"در زاغانِ ہند از ایں دو برادر بہتر تیرے نہ خاستہ"

سودا کے متعلق حزیں کا یہ جملہ عام طور پر مشہور ہے۔

"در ہیچ گویانِ ہند خوب می گوئی"[۲]

اس زمانے میں ناصر علی اور بیدل کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن حزیں دونوں کو مہمل سمجھتا تھا۔

"نظمِ ناصر علی و نثر بیدل بہ فہم نمی آید۔ اگر مراجعتِ ایران دست دہد برائے ریشخند بزمِ احباب رہ آوردے بہتر ازیں نیست"[۳]

حزیں کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں (۱) تنبیہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

۱۔ سرکار: زوال سلطنت مغلیہ ص ۲۵، ۲۶ نیز خاندان نیشوا جی (سرکار) باب اول ص ۲۰۱

۲۔ سودا ص ۹۹

۳۔ نگارستانِ فارس ص ۲۱۲

تنبیہ الغافلین[1] میں خان آرزو نے حزیں کے دیوان چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مطلع السعدین میں سیال کوٹی مل وارستہ نے بھی بیان کی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیت سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزیں نے تنبیہ الغافلین کا جواب لکھا اور اس کا نام 'رجم الشیاطین' رکھا۔ نگارستان (۲۱۴) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب منوہر سہائے انور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۲۶۷ھ میں مولوی امام بخش صہبائی نے 'قول فیصل' کے نام سے بہ ظاہر ایک غیر جانبدارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزیں کی طرف داری پر تلے ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزیں کی حمایت میں ایرانی شعرا سے استناد کیا ہے[2]۔ لیکن بعض جگہ وہ بھی سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

"نظارگیان ایں نسخہ دریافتہ باشند کہ صہبائی ہیچ مداں کمر ہمت راچست بستہ در ہر مقام قصد آں دارد کہ توجیہے برائے کلام شیخ بہم رساند تا چہ کند در امثال ایں مقامات سپر می افگند[3]"

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہل علم نے حصہ لیا ہے "مردم دیدہ" کے مؤلف نے اعتراضات غلط قرار دیے ہیں، مرزا علی لطف نے آرزو کے بیشتر اعتراضات غلط قرار دیے ہیں۔ مرزا علی لطف نے بھی ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ چنانچہ "گلشن ہند" میں لکھتے ہیں:

"۱۱۴۷ھ میں کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ دگداسب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت ان سے محجوب کی، آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت

---

[1] ۱۱۵۶ھ میں لکھی گئی۔

[2] ملاحظہ ہو، غوامض سخن (صہبائی) ص ۲۸۴، ۳۱۔

[3] قول فیصل، لکھنؤ، ایڈیشن ص ۱۳۵

سے شعر سقیم ٹھہرے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے اور نام اس کا تنبیہ الغافلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے[1]

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے 'مخزن' میں لکھا تھا۔ اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزو کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی دفع نہیں ہو سکتے۔ خان آرزو نے بھی حد کر دی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے۔ اور یہ محض اس لیے کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

غالباً خان آرزو نے 'تنبیہ الغافلین' کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں احقاق الحق کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاء الحق کے نام سے دیا ہے۔ لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

اعلاء الحق کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خان آرزو کے متعلق لکھا ہے:

"معرکہ ساز عرصۂ لاف، عناں گستر نفس سوزی ہائے گزاف، تہمت زدۂ امتیاز باطل و حق، صاحب نسخۂ احقاق الحق"[2]

ہم نے ادھر جو مرزا علی لطف کا بیان نقل کیا ہے، اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے، کہ حزیں اور خان آرزو کی چشمک صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حزیں کی کم نگاہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہندی کشمکش کار فرما تھی۔ تذکرہ حسینی میں صاف لکھا ہے کہ خان آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ حزیں فارسی دانانِ ہند کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

آرزو اور حزیں کی ملاقات کا لطیفہ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل ثابت اور آرزو نے حزیں کے اس شعر پر اعتراض کیا۔

---

[1] گلشن ہند، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۱

[2] اعلاء الحق نظامی پریس ص ۷۰۔ صاحب نسخۂ احقاق الحق سے شبہ ہوتا ہے کہ صہبائی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے

ہر گہہ کہ بہ بادِ وہنت غنچہ نشستم

اندیشہ مرا سر بہ گریبانِ عدم داد

حزیں ان "جاہلانِ ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

حزیں کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی آزاد منشی اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست

خویشتن را ہمی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجالاتے تھے۔ لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے۔

یکے از عقل زند لاف کہ بایست گرفت   دامنِ عاطفتِ شاہِ عطا بخش و وزیر

آں یکے می دہم ایں پند کہ در ہند مجوئے   کام بے تربیت قدر شناسانِ امیر

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا بہت زور بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ حزیں کو قلمدانِ وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا[1]

ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزاد نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل بڑے فخر کے ساتھ حزیں کے سامنے پڑھی۔

خجل از روئے حبابم کہ بہ ایں تنگیِ ظرف

انچہ در کاسہ خود داشت بہ دریا بخشید

حزیں نے فوراً اصلاح کی۔

خجل از چشمِ حبابم کہ بہ یک ظرفِ تنک

آں چہ در کاسہ خود داشت بہ دریا بخشید

اور کہا "ایں بابا از کیسہ تا کاسہ واز تنگی تا تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر گوید"

---

[1] سیر المتاخرین کے مصنف کو حزیں سے بڑا غلو تھا اسی لیے مخدومی قاضی عبدالودود صاحب اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔

آزاد ہی نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ آرزو کے ایک عقیدتمند (یعنی شاہ لطف اللہ) حزیں کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے بغیر اس شعر کی اصلاح کی درخواست کی

بتے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی ننگش
حنا گر پائے او بوسد ز شوخی می پرورنگش

حزیں نے کہا "معلوم می شود کہ از کاسہ لیسانِ حرام زادہ اکبر آباد است"

آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ شاہ لطف اللہ کا انتقال حزیں کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا لیکن ان قصوں سے حزیں اور آرزو کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظروں میں ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حزیں کو اپنی قابلیت اور ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا۔ اور ان کی بددماغی کبھی دوسرے کے محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی[1]

اس کے بعد ایرانی ہندی نزاع، معرکہ حامیانِ قتیل و غالب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مرزا غالب اپنا رشتہ ادبی دودہ جم سے جوڑتے تھے۔ اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جابجا ملتے ہیں ؎

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم ۔۔۔ زاں رو بصفائے دمِ تیغ است دمم

گہر از رایتِ شاہانِ عجم بر چیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم ۔۔۔ دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار ۔۔۔ زاں پس رسا بہشت کہ میراثِ آدم است

---

[1] نیز ملاحظہ ہو پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ) کا مقالہ "شیخ علی حزیں پر کچھ نئی روشنی"، جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد میں پڑھا تھا اور جناب سرفراز خاں صاحب کا مقالہ شیخ محمد علی حزیں پر۔

مرزا غالب، سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں:

"ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد"

جو شخص دودۂ جم سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسانِ ہند کو کب خاطر میں لا سکتا تھا۔

غالب نے "قاطع برہان" میں اپنے آپ کو اہل زبان میں شامل نہیں کیا" حاشا کہ خود را از اہل زباں گیرم" لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی کی سلامتی اور راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہل زبان ہی کو سزاوار ہو سکتا ہے یا اس شخص کو جس کے عجز میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالب کا دعویٰ یہ ہے کہ زبان فارسی سے ان کو "پیوند ازلی" ہے اور ایک "جاماسپ عہد" اور "بزرجمہر عصر" کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب بھی تہ کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"ملا عبدالصمد (ہرمزد) استاد غالب، غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا۔ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا دخل ہوگا۔۔۔ عبدالصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز کھل چکا تھا۔ دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں اسے معلوم تھیں۔ سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے"[۱]

ملا عبدالصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز ہے[۲]۔ لیکن خود غالب کا بیان یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت "دل نشیں" اور "خاطر نشان" ہوگئی۔

لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا وارث سمجھتے تھے۔ اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے[۳]۔ ان کے غرور کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔

ہر چند زمانہ مجمعِ جہال است ۔۔۔ وز جہل نہ حالِ شاں بہ یک منوال ست

---

[۱] غالب: از غلام رسول مہر: ۲۰

[۲] دیکھیے "غالب کا ایک فرضی استاد" علی گڑھ میگزین: غالب نمبر: ۶۵

[۳] ملاحظہ ہو، غالب نامہ ص ۳۲

فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست — بودن ہمہ لیک از یکے دگرے

معرکۂ حامیانِ قتیلؔ و غالبؔ اسی ایرانی ہندی نزاع کی ایک کڑی ہے۔ غالبؔ کی قتیل دشمنی کو اگر اس پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کے انکار و امیال اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

اس ادبی ہنگامے کے برپا ہونے کا فوری سبب یہ ہوا کہ مرزا غالبؔ اپنی پنشن کے سلسلے میں ۱۸۲۸ء میں کلکتے پہنچے، وہاں ایک مشاعرے میں غالبؔ نے "گماں برخیزد" "میاں برخیزد" غزل پڑھی اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

جزو از عالم و از ہمہ عالم بیشم — ہم چو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط باجتہادِ قتیلؔ درست نہیں ہے۔ کفایت خاں رئیسِ ہراتؔ بھی مشاعرے میں موجود تھے انھوں نے "ہمہ عالم" کی سند سعدیؔ و حافظؔ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ "ز میاں برخیزد" صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض "صفوت کدہ" کے استعمال پر تھا۔[1]

غالبؔ نے ان اعتراضات پر جل کر کہا کہ "میں فرید آباد کے کھتری بچے کا قول نہیں مانتا۔"

کلکتے میں غالبؔ کے معترضین کی تعداد کافی تھی۔ اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخؔ نے یہ لکھی ہے کہ کلکتے کے قیام میں غالبؔ کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتے کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالبؔ ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس درجے کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں[2] یہ باتیں مخالفین برداشت نہیں کر سکتے تھے

---

[1] ملاحظہ ہو غالب نامہ، ص ۳۲

[2] غالبؔ از مہر، اشاعت سوم: ۱۲۳۔ بہ روایت ابوالسلام آزاد

غالب نے اس واقعہ کی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع دی ہے:

"از نوادر حالات ایں کہ سخن وران و نکتہ رسان ایں بقعہ پس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یک شنبہ نخستین سخن گویاں در مدرسۂ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزل ہائے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسیدہ در آں انجمن می رسد و اشعار مرا شنودہ بہ بانگ ملبند نامی ستاید۔ و بر کلام نادرہ گویان ایں اقلیم رو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید چوں طبائع بالذات مفتون خود نمائی است ہم گناں حسد می برند و کلانان انجمن و فرزانگان فن بہ بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند"[۱]

مرزا غالب نے اعتراضات سے تنگ آکر ایک مثنوی "باد مخالف"[۲] لکھی جس میں سخن پروران کلکتہ سے معذرت کی لیکن اس مصالحت میں بھی کئی تیز نشتر چھپے ہوئے تھے لکھتے ہیں: "نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا نہ اس کی شہرت پر رشک ہے نہ اسے برا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ"

دامن از کف کنم چگونہ رہا	طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح روان معنی را	آں ظہوری جہان معنی را
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را	چہ شناسد قتیل و واقف را!
می شوم خویش را بہ صلح دلیل	می سرائم نوائے مدح قتیل
تا نہ ماند زمن دگر گلۂ	رسد از پیروان وے صلۂ
گرچہ ایرانیش نہ خواہم گفت	سعدی ثانیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است	از من و ہم چو من ہزار بہ است
من کف خاک و او سپہر بلند	خاک را کے رسد بہ چرخ بلند

---

[۱] کلیات نثر غالب: ۱۱۰ نول کشور، ۱۲۸۰ھ خطوط بنام عبدالغفور سرور اور عبدالرزاق شاکر بھی دیکھے جائیں۔ عود ہندی صفحات: ۷۰-۲۱۱ المطبع علی گڑھ ۱۹۲۰ء

[۲] نیز ملاحظہ ہو باد مخالف کی اولیں روایت' از قاضی عبدالودود صاحب۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ قتیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول نہیں کرتے۔ مگر بیدل کی سند خود پیش کرتے ہیں۔ "شعر بیدل بجز تفنن نیست" اولیں روایت میں نہیں بعد کو بڑھایا ہے۔

وصفِ او حدِ چو منے نہ بود | بہرہ ور خورد و روز نے نہ بود
مرحبا ساز خوشش بیانیِ او | حبذا شور نکتہ دانیِ او
نظمش آبِ حیات را ماند | در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بالِ طاؤس است | انتخابِ صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلم رو حرف | کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خام ہندوے پارسی دانش | ہندیاں سر بہ خطِ فرمانش
ایں رقم ہا کہ ریخت کلک خیال | بود سطرے ز نامۂ اعمال
از منِ نارسائے ہیچ مداں | معذرت نامہ ایست اے یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما | رحم بر ما و بے گناہیِ ما
آشتی نامہ رد داد پیام ! | ختم شد والسلام والاکرام !

غالب کی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمے کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک الجھے رہے اور روپیہ ملنے کی امید میں قرض لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ "غم رسوائی جاوید" یعنی قیدِ فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔

غرض غدر کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ ہم نوایانِ قتیل کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھا سکیں۔

غدر کے زمانے میں مرزا غالب نے ایک روزنامچہ "دستنبو" کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں " جہاں داران داد آموز، دانش اندوز، نکوخو، نکونام" انگریزوں کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ غدر کی خانہ نشینی ہی کے زمانے میں انھوں نے "برہان قاطع" دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے غالب نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔[۱]
"قاطع برہان" کی اشاعت نے ۱۸۲۹ء کے کلکتہ والے ہنگامہ کو پھر تازہ کر دیا بہ قول غالب "باہی کرتی

---

[۱] قاطع برہان، کا دوسرا ایڈیشن "درفشِ کاویانی" کے نام سے مع اضافہ مطالب و فوائد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

میں ابال آگیا" اور ان کو آخر وقت تک اس مخالفت سے نجات نہیں ملی۔

"قاطع برہان" ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ساری فضا مکدر ہوگئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) "محرق قاطع" (مولوی سعادت علی خاں)

(۲) "ساطع برہان" (مرزا رحیم بیگ میرٹھی)

(۳) "قاطع القاطع" (امین الدین پٹیالوی)

(۴) "مؤید برہان" (آغا احمد علی)

(۵) "تیغ تیز تر"

(۶) "شمشیر تیز تر" (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالب کے دوستوں اور مؤیدوں کی طرف سے ان کتابوں کے ذریعہ دیا گیا۔

(۱) "دافع ہذیان" (مولوی نجف علی)

(۲) "لطائف غیبی" (سیف الحق سیاح، مہر کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالب کی لکھی ہوئی ہے۔)

(۳) "سوالات عبد الکریم"

(۴) "نامہ غالب" از مرزا غالب

(۵) "تیغ تیز" مولفہ غالب

(۶) "ہنگامہ دل آشوب" وغیرہ

اس ہنگامے میں تلخی کا پیدا نہ ہونا حیرت انگیز ہوتا چنانچہ موافق و مخالف دونوں جماعتیں نا ملائم الفاظ پر اتر آئیں، اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں تھا جو انھوں نے صرف نہ کیا ہو۔ اس تمام لٹریچر کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے تحقیق کا

غالب: ۳۳ اشاعت سوم نیز ملاحظہ ہوں ذکر غالب از مالک رام، علی گڑھ میگزین غالب نمبر: لطائف غیبی اور غالب از عبد المجید سالک: ۱۲۳

ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اور اس کے لیے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطع برہان لکھ کر علمی خدمت انجام دی، اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنۂ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت، صاحب مجمع الفصحا نے، فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں غالب کے بعض[1] اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ لیکن اس بحث بحثی میں ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علمی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قتیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے آپ کو عرفی و ظہوری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ کلکتے کے مشاعرے اور برہان قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں شدت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس سے بھی قتیل کا تعلق سن پاتے تھے اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رامپوری مؤلف غیاث اللغات نے قتیل کی جا بجا سند کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غالب اس تعلق کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"غیاث الدین رامپوری ایک ملائے مکتبی تھے ناقل نا عاقل جس کا ماخذ او مستند علیہ قتیل کا کلام ہو گا اس کا فن لغت میں کیا ذرجام ہو گا۔"[2]

مولوی غلام احمد شہید چوں کہ قتیل کے شاگرد تھے اس لیے ان کے متعلق ذکا حیدرآبادی

---

۱ مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیان برہان قاطع میں مابہ النزاع بنا، ہدایت نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے، نظر کی طرف شاہد کے بغیر، اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کیے بغیر) روا تنقیح فیصلہ دی وہی ہے جو برہان میں ہے۔

۲ خطوط غالب ص ۱۱۰

کو لکھتے ہیں " سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوسِ اناولاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں[۱]"

غالب ہر جگہ قتیل کو ہندی فارسی دانوں کا نمائندہ اور اپنے آپ کو فارسی دانان ایرانی نژاد کا علم بردار سمجھتے ہیں۔

" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے[۲]" ایک گاؤ بچہ بہ زورِ سحر کچھ باتیں کرنے لگا بنی اسرائیل اسے خدا سمجھے۔"

" قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً ناآشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر سادہ کشمیری یا کابلی یا قندھاری و مکرانی۔ احیاناً عامۂ اہل ایران میں سے بھی کوئی ہو، ماناً عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شمس الدین علی ہروی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی نثر میں جو لالہ دیوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے، رقم نہ فرماتے[۳]"

صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

" اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خران، ناشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ ان غولوں پر لعنت کرو[۴]"

قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

---

[۱] اردوئے معلیٰ: ۳۰۸ (لاہور ۱۹۲۲ء)

[۲] خطوطِ غالب: ۱۱ (بنام قاضی عبدالجمیل)

[۳] عودِ ہندی: ۵۱ (طبع علی گڑھ، عبدالغفور سرور کے نام)

[۴] عودِ ہندی: ۲۲

"مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے"[1]

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"لفظ "بے پیر" نورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ مرزا جلال اسیر علیہ الرحمہ مختار ہیں۔ اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیرزادہ ایران ایسا لفظ لکھے"[2]

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی فارسی میری ازلی دست گاہ ہے اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے، اس لیے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی ہے تو اس پر بھی تعجب[3] کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر تفتہ کو لکھتے ہیں:

"فارسی میں مبدا فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"[4]

سنو میاں، میرے ہم وطن جو دری فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر

---

1. اردوئے معلیٰ، ص ۴۰۴

2. خطوط غالب: ۱۹، حالانکہ بے پیر بہت قدیم ترکیب ہے۔ خاقانی، طالب آملی، صائب اور اشرف کے یہاں موجود ہے "غالب بہ حیثیت محقق" علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۰

3. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کورانہ تقلید کے قائل نہیں تھے۔ حزیں کے ایک مطلع کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں:

"حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بے ہودہ ہے۔ متتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی پیروی کون کرے گا حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبریل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو" (خطوط غالب ص ۲۴)۔ وہ مطلع یہ ہے۔

زرشک تازگی آں نازنیں سوار ہنوز　　　زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

اسی خط میں لکھتے ہیں:

"نظر شگفتن" اور "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہر گوپال تفتہ اور ملا نور الدین ظہوری (باقی اگلے صفحہ پر)

ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھاگس الّو عبدالواسع لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ الّو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ" اور "ہمہ عالم" کو غلط کہتا ہے کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زبان" کو غلط کہوں گا فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد والمنۃ الشکر[۱]

یہی وجہ ہے کہ غالب ہندوستان کے سخن وروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

"میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا[۲]"

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔

"کلام سعدی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) نے لکھا ہو۔ ۱۔ خطوط غالب ص ۲۰۲

۲۔ خطوط غالب: ۹۴

۳۔ خطوط غالب ۹۲

۴۔ عود ہندی ص ۱۰ طبع علی گڑھ

تصویر مندرجۂ کلیات غالب

شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مدظلہ

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

(۱۸۶۳ء)

مختارالدین احمد

مرزا غالبؔ کی تصویریں

مرزا غالب کی تصویریں جو اب تک شائع ہوتی رہی ہیں ان میں معاصرانہ تصویریں بھی ہیں اور بعد کی بنائی ہوئی اور مصنوعی بھی۔ یہ بات حیرت ناک معلوم ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ چند تصویروں کے سوا بیشتر شائع شدہ تصویریں معاصرانہ نہیں اور نہ وہ مستند ہیں۔ اب تک راقم کو مرزا کی چار تصویروں کا پتہ چلا ہے جو معاصرانہ ہیں اور جن کی اصلیت مسلّم ہے۔

۱۔ تصویر مندرجۂ کلیّات غالبؔ

مرزا کے فارسی کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں دو بار شائع ہوا ایک سعیٔ انقلاب سن ستاون سے بارہ تیرہ سال پہلے¹ دیوان فارسی کے نام سے نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح کے ساتھ مطبع دار السلام دہلی میں چھپا تھا۔ یہ اشاعت بہت کم یاب ہے۔

اس اشاعت کے بعد مرزا نے اپنا کلیّات مرتّب لیا اور اس میں بعد کا کلام بھی داخل کر لیا۔ یہ مطبع نول کشور میں جون ۱۸۶۳ء سے پہلے چھپ چکا تھا لیکن تصویر تیار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی

---

¹ سال طباعت ۱۸۴۵ء بہ روایت غلام رسول مہر " غالب: ۴۰۹ اشاعت سوم، مالک رام: (باقی اگلے صفحہ پر)

اشاعت روک دی گئی تھی، آخر ۳ جون ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں یہ اعلان شائع ہوا۔

"بہ وجہ عدم تیاری تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بہ خدمت شائقان تقسیم ہونا ملتوی تھا اب تیار ہوگئی۔" اس اشاعت میں مرزا کے زائچہ ولادت کے علاوہ یہ تصویر بھی (جو لیتھو پر چھاپی گئی ہے) موجود ہے۔ اس میں وہ درباری لباس میں پیچ دار پگڑی باندھے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں ایک تحریر ہے اور انداز مجموعی ایسا ہے جیسے وہ دربار میں اپنا قصیدہ سنا رہے ہوں۔ یہ کلیات مرزا کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور وہ اس کی اشاعت کے ہر ہر مرحلے۔ کتابت، طباعت، تصحیح، جزو بندی وغیرہ سے ذاتی طور پر واقف رہے تھے۔ اس لیے اس تصویر کے مصنوعی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے یہ تصویر خود انھوں نے فراہم کی ہو۔ یا منشی نول کشور یا مطبع کے کسی ایسے آدمی کے پاس جس سے مرزا کے تعلقات ہوں، یہ تصویر پہلے سے موجود ہو۔

ان کے موجودہ خطوط میں اس تصویر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اگر مرزا کے وہ سارے خطوط مل جائیں جو انھوں نے منشی نول کشور اور مطبع والوں کے نام لکھے تھے تو اس میں اس تصویر کا ذکر ضرور مل جانا چاہیے۔ بہرکیف اس تصویر کے اصلی ہونے میں کلام نہیں۔ مرزا کی صحت پسندی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ ایک لفظ کے غلط ہو جانے پر وہ واویلا مچانے اور ہنگامہ بپا کرنے لگتے تھے۔ اور کتاب کے فرمے تک بدلوانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ تصویر اگر ان کی نہ ہوتی یا ذرا بھی ان کی شکل و صورت سے مختلف ہوتی تو وہ تصویر مطبوعہ کے سارے اوراق ضائع کرا دینے میں بھی پس و پیش نہ کرتے۔

یہ تصویر مرزا کی وفات سے ۶ سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں کب بنوائی گئی تھی۔ لیکن اس کا زمانہ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ سمجھنا چاہیے۔

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ کلیات غالب (نول کشور ۱۸۶۳ء) میں شائع ہوئی۔ وہیں سے مکاتیب غالب (مرتبہ امتیاز علی عرشی صاحب) کی اشاعت اول (۱۹۳۷ء) "علی گڑھ میگزین" غالب نمبر ۱۹۴۹ء اور رسالہ آج کل۔ بابت فروری ۱۹۵۲ء میں شائع کی گئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ سے) ذکر غالب: ۹۲ اشاعت اول ۱۹۳۷ء بقول جناب امتیاز علی عرشی، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۶۱ الہ راقم کا نسخہ دیوان فارسی ناقص ہے۔ اس لیے اس وقت سال طباعت کی تعیین سے قاصر ہے۔

تصویر قلعۂ معلیٰ

(قبل از ۱۸۶۶ء)

۲۔ تصویر قلعۂ معلی

مرزا نے اپنی ایک تصویر بہادر شاہ کو نذر کی تھی۔ اس کا ذکر ان کے خطوں میں ملتا ہے۔ سیاح نے مرزا سے ان کی تصویر مانگی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں، "صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں ۔۔۔ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے، اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیجدوں گا[۱]" سیاح بہت دنوں تک تصویر کا مطالبہ کرتے رہے اور کم از کم ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء تک سیاح کو تصویر نہیں ملی تھی گو قرائن موید ہیں کہ ۷ اگست ۱۸۶۸ء تک انھیں مرزا کی تصویر مل چکی ہوگی۔ غالب نے میر ابراہیم علی خاں کو اپنی تصویر سیاح ہی کی معرفت بھیجی تھی اس کا امکان بہت کم ہے کہ انھیں تو نہ بھیجی ہو اور ان کی وساطت سے میر ابراہیم علی خاں کو بھیجی ہو۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انھیں کون سی تصویر بھیجی تھی قلعہ والی تصویر تو نہیں رہی۔

بہادر شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد قلعے میں انگریزوں نے اپنی بساطِ سیاست بچھائی اور ان کے عہد میں قلعے کے ایک حصے کو عجائب خانہ بنایا گیا جس میں بہادر شاہ کے ملبوسات، اسلحہ وغیرہ، کتب اور دوسرے نوادر کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کی تصویر بھی محفوظ کر دی گئی۔ یہ آج بھی عجائب خانہ کی زینت ہے، اور بقول شیخ محمد اکرام، "مرزا کی کسی تصویر سے ان کی رئیسانہ تمکنت، عقابی تیز نگہی اور بشرے کی ذہانت اس طرح نمایاں نہیں ہوتی جس طرح اس تصویر سے[۲]۔"

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب نے اشتیاق علی صاحب سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ کی اجازت سے رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع کی۔ پھر شیخ محمد اکرام نے غالب نامہ کی اشاعت ۱۹۳۶ء میں چھاپی۔ اب بھی آثار غالب میں شریکِ اشاعت ہے اور انھیں کی توجہ سے وقار عظیم صاحب نے فروری ۱۹۴۹ء کے ماہ نو میں اس کا مکبر شائع کیا تھا۔ یہ تصویر ۱۸۶۶ء سے پہلے کی ہے۔ تصویر کے نیچے درج ہے "شبیہ حضرت غالب دہلوی"۔

۱۔ اردوئے معلی، مطبع شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۰ء: ۱۰

۲۔ آثار غالب: ۸

۳۔ تصویر کتب خانہ حبیب گنج

یہ تصویر مرزا کے آخری زمانے کی ہے جو کسی فن کار نے ۱۲۸۳ھ میں مختلف رنگوں سے بنائی ہے۔ یہ تصویر نمبر ۲ سے بہت مشابہ ہے، خود مرزا کی نشست، حقے کی نے، اور دوسری چیزوں کا انداز بہت ملتا جلتا ہے۔ تصویر کی پشت پر دو اندراجات ہیں۔ ایک قدیم دوسرا جدید۔ قدیم عبارت یہ ہے: "شبیہ دل پذیر مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی عرف مرزا نوشہ۔" جدید اندراج نواب صدر یار جنگ کا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر دہلی میں پچیس روپے میں خریدی گئی تھی۔

اسے پہلی مرتبہ مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" اور "سبد چین" (۱۹۴۹ء) میں اور رسا ہمدانی مرحوم نے "نادر خطوط غالب" لکھنؤ ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ یہی تصویر مولوی عبیدالرحمن خاں صاحب شیروانی کی عنایت سے راقم نے علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" (۱۹۴۹ء) اور "آج کل" (۱۹۵۲ء) میں شائع کی ہے۔ "نادر خطوط غالب" میں پوری تصویر کا عکس ہے جس میں پیشانی پر ان کا شعر "غالب نام آورم الخ" بھی مندرج ہے۔ علی گڑھ میگزین میں حاشیے کے بیل بوٹے اور مندرجہ بالا شعر محذوف ہے۔ "ذکر غالب" اور "سبد چین" میں اور زیادہ اختصار اور کفایت شعاری کو راہ دی گئی ہے۔ صرف مرزا کی تصویر ہے، تصویر کے عقبی زمین اور آس پاس کا ماحول حذف کر دیا گیا ہے۔

ان تینوں تصویروں کے مستند اور معاصرانہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ تینوں کے خد و خال ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ خصوصاً آخری دو تصویروں میں تو بے حد مماثلت ہے۔ اصل تصویر میں بھی بہت حد تک اور اردگرد کی فضا اور ماحول میں بھی۔

۴۔ تصویر نسخہ حمیدیہ

دیوان غالب نسخہ حمیدیہ طبع اول میں بھی مرزا غالب کی ایک قلمی تصویر ہے۔ فنی طور پر تو اس تصویر کا کوئی درجہ نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مصور نے اس پر بہت کم محنت کی ہے، لیکن تصویر کے اصلی اور معاصرانہ ہونے میں شبہ نہیں، لباس اور چہرے کے خد و خال میں ان تین تصویروں سے بڑی مشابہت ہے جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ کس زمانے میں یہ تصویر بنائی گئی معلوم نہیں۔ اور نہ یہ پتا

تصویر مندرجۂ نسخۂ حمیدیہ

تصویر کتب خانۂ حبیب گنج

(۱۲۸۳ھ)

چلا کہ یہ تصویر کہاں سے حاصل ہوئی

۵۔ غالب کی ایک قلمی تصویر مخزونی مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بھی ہے جو ان تصویروں سے بہت مشابہ ہے۔

مرزا کی ایک تصویر کتب خانہ شرقیہ بانکی پور میں بھی ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کلیات غالب (طبع اول) کی مطبوعہ تصویر (تصویر نمبر ا) پر کسی نے چابک دستی سے ایسی خوب صورت رنگ آمیزی کی ہے کہ قلمی تصویر کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ تصویر جناب عندلیب شادانی صاحب کے مملوکہ قلمی دیوان غالب میں تھی جن سے پروفیسر محمد محفوظ الحق مرحوم نے مانگ لیا تھا، اور اب انھیں کے ذخیرہ کتب کے ساتھ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں موجود ہے۔

۶۔ فوٹو

عکسی تصویر کا ذکر غالب کے یہاں ملتا ہے۔ سیاح کو ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں: "گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں؟" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انھوں نے نہیں تو ان کے احباب نے ایک عکس اتارنے والے کو ڈھونڈ نکالا۔

اکمل الاخبار، جس کے اڈیٹر مرزا کے شاگرد بہاری لال مشتاق دہلوی اور مالک و سرپرست حکیم محمود خاں تھے، کی اشاعت ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء میں مرزا کی ایک تصویر کا اشتہار ہے جس سے مرزا کی اس عکسی تصویر پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ اشتہار یہ ہے[1]:

"تبیہہ مبارک جناب معلی الالقاب نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب مدظلہ العالی

ناظرین والاتمکین اور نیز شاگردان ارادت آئین حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ دریں ولا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروا دی ہیں۔ پس جس صاحب کو تبیہہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیہ کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ، پتہ لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیج دیں۔ بصیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔"

یہ غالباً مرزا کی پہلی تصویر ہے جو مصور کے موقلم کی مرہون منت نہیں بلکہ کیمرے کے ذریعے سے

---

[1] اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار از پنڈت کیفی رسالۂ اردو

لی گئی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ اس اشتہار کی تاریخ ۲۸ مئی ۱۸۶۸ء ہے۔ گویا مرزا کے انتقال سے ۸ ۹ ماہ پہلے۔ یہ زمانہ مرزا کی علالت اور انتہائی ضعف کا تھا۔ اس کے بعد مرزا اس قابل رہے ہوں کہ اطمینان سے فوٹو کھچوا سکیں، قرینِ قیاس نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مرزا کی آخری تصویر ہو۔ جس مصوّر نے مرزا کی تصویر کھینچی تھی اس کا نام رحمت علی فوٹو گرافر تھا۔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے ایک بزرگ مرزا عبدالصمد بیگ کی توجہ سے یہ تصویر بنی تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں: "ہمارے خاندان میں دو بڑے شاعر گزرے ہیں، ایک غالبؔ دوسرے مومنؔ، خدا کی قدرت ہے کہ ہمارے ہی ذریعہ سے دونوں کی تصویریں پبلک میں آئیں۔ میرے عم بزرگوار مرزا عبدالصمد بیگ مرحوم نے غالبؔ کی تصویر ان کے انتقال سے چند ہی روز پہلے رحمت علی فوٹو گرافر سے کھچوائی تھی، یہی وہ تصویر ہے جس کو لوگ اب آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ میرے پاس اس کی اصل پلیٹ تھی لیکن رفتہ رفتہ مسالا (HYPOO)، اس کو کھا گیا اور زرد ہوتے ہوتے بیکار ہو گئی۔[۱]"

مرزا کی یہ تصویر عام طور پر مروّج ہے اور ان کی عام تصویروں میں یہی ایک تصویر ہے جسے استناد کا درجہ حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام کا بیان ہے کہ "میری نظر سے جو تین تصویریں غالب کی گزری ہیں ان میں غدر کے بعد کی ایک عکسی تصویر بھی ہے جس میں وہ کرسی پر بیٹھے ہیں، یہ فوٹو جو مرضِ موت میں لیا گیا تھا، ایک آدمی نے سہارا دے کر اٹھا دیا ہے اسی حالت میں یہ تصویر لی گئی ہے۔"

مرزا کا یہ اصلی فوٹو کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے اس کی قدامت دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ اکمل الاخبار میں جس فوٹو کا اشتہار ہے یہ وہی ہے، اس تصویر اور مروجہ تصویروں میں یہ پتا نہیں چلتا کہ مرزا کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں۔ یا نشست کا انداز کیا ہے، یہ تصویر جو پہلی مرتبہ پیش کی جا رہی ہے اس میں صاف نمایاں ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دونوں ہاتھ بھی نمایاں ہیں انگرکھے کا دامن بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ گو تصویر کچھ ایسی دھندلی آئی ہے کہ دامن وغیرہ کچھ صاف نہیں ہے اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے لوگوں نے یہ حصہ اڑا دیا اور یوں وہ تصویر رواج پا گئی جو آج کل عام طور پر رسالوں اور کتابوں میں ملتی ہے۔

۱۔ "مومن کی تصویر کے متعلق ایک نوٹ" از مرزا فرحت اللہ بیگ، رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۶ء

غالب کی ایک قدیم عکسی تصویر

عمل: رحمت علی فوٹو گرافر (۱۸۶۸ء)

یہی فوٹو مرزا نے حضرت صاحب عالم مارہروی کو بھیجا ہے۔ یہ عکسی تصویر اور لفافہ کا کاغذ جس میں انھوں نے پیکٹ بنا کر اس تصویر کو لپیٹ کر بھیجا ہے دونوں چیزیں محمد موسیٰ صاحب زیدی باغ بخچتہ، قصبہ مارہرہ کی عنایت سے آثار کی لائبریری میں محفوظ ہیں لفافہ پر پتا خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے:

مارہرہ حضرت صاحب عالم مدظلہ العالی از غالب ٥

یہ لفاف کیا ہے گندے رنگ کے دیسی اور چوکور کاغذ کو غالب نے اپنی تصویر کے اردگرد پیکٹ بنا کر لپیٹ دیا ہے۔ اس پر ایک ایک آنہ کے دو ٹکٹ لگے ہوئے ہیں۔ غالباً رجسٹری سے بھیجا ہوگا گو لفاف پر اس کا کوئی اندراج نہیں نہ غالب کی طرف سے اور نہ ڈاک گھر والوں کی طرف سے۔ دہلی کی مہر زیادہ واضح نہیں صرف تاریخ ۲۷ اور سال ۱۸۶۸ء پڑھا جاتا ہے، مہینے کا پتا نہیں چلتا۔ ورنہ غالب نے یہ تصویر کس تاریخ کو روانہ کی اس کی تعیین ہو جاتی۔ دہلی سے یہ لفاف علی گڑھ پہنچا اور یہاں کی مہر موجود ہے لیکن آج کل کے املا کے خلاف (ILLYGARH) لکھا ہے۔ تاریخ بالکل پڑھی نہیں جاتی۔ ممکن ہے ۲۸ ہو، مارہرہ میں ڈاک خانہ اس وقت نہ ہوگا اس لیے وہاں کی مہر نہیں آخری مہر ایٹہ کی ہے، تاریخ اور ماہ کے نقوش یہاں بھی مدھم ہیں، سال ۱۸۶۹ء صاف پڑھا جاتا ہے، دہلی اور علی گڑھ کی مہریں سیاہ ہیں اور ایٹہ کی سرخ۔ لفاف پر سیاہ قلم سے ایک اندراج ۲۹ مئی کا ہے بہ خوبی ممکن ہے کہ اس تصویر کی مارہرہ پہنچنے کی تاریخ یہی ہو۔ دہلی کی مہر سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے 27 MAY منقوش ہو۔ اس بات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے کہ اس فوٹو گراف کا جو اشتہار اکمل المطابع میں شائع ہوا تھا اس کی تاریخ اشاعت ۸ مئی ۱۸۶۹ء ہے۔ ہمارا یہ قیاس بے جا نہیں کہ غالب نے اپنی تصویر ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو دہلی سے مارہرہ بھیجی ہوگی۔

عکسی تصویر کی ایک کاپی مرزا نے اپنے دوست لالہ پیارے لال کی بھی نذر کی تھی، یہ تصویر لالہ سری رام کی وساطت سے سر عبدالقادر کو ملی اور انھوں نے اس دیوان اردو کے ساتھ شائع کی تھی جو ان کی تصحیح سے لاہور سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا[1]۔ وہ اس تصویر کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اس دیوان کو ایک ایسی چیز دستیاب ہوئی ہے جو پہلے کسی نسخے کو میسر نہیں، یعنی مرزا غالب مرحوم

---

[1] راقم کی نظر سے یہ اڈیشن نہیں گزرا، یہ معلومات راقم کے نام جناب عرشی کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہیں

مغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر زیبِ ورقِ اوّل ہے۔ اس تصویر کے لیے میں اپنے ذی علم دوست لالہ سری رام ایم، اے، دہلوی، مؤلف خم خانۂ جاوید کا ممنون ہوں۔ ان کے عم بزرگوار رائے بہادر پیارے لال صاحب سرگباشی، انسپکٹر مدارس، مرزا غالب مرحوم کے عزیز ترین دوست اور مداحوں میں تھے، یہ عکسی تصویر رائے صاحب ممدوح کو مرزا صاحب مرحوم نے دی تھی۔ اور رائے صاحب سے بطور ایک قابل قدر یادگار کے لالہ سری رام صاحب کے پاس پہنچی تھی۔ اس تصویر سے ہاف ٹون تصویریں اس نسخے کے لیے تیار کی گئی ہیں۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سر عبدالقادر مرحوم نے یہ تصویر شائع کی تھی۔ یہی تصویر بعد کو دیوانِ غالب (نظامی ایڈیشن)، نکاتِ غالب مرتبہ نظامی بدایونی، تاریخ ادب اردو مترجمۂ مرزا عسکری (حصۂ نظم) میں شائع ہوئی ہے۔

مرزا کی یہ عکسی تصویر، محسن علی خاں صاحب عرف ننھے آغا صاحب نے اپنے رسالۂ معیار، لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۱۰ء میں بھی شائع کی تھی۔ راقم نے معیار کا شمارہ جنوری نہیں دیکھا لیکن اسی سال کے متعدد شماروں کے سرورق پر غالب کی تصویریں چھپی دیکھی ہیں۔ ننھے آغا میر و غالب کے بڑے مداحوں میں تھے اور اپنے کو مقلد میر و غالب کہتے تھے۔ اور لکھتے اور چھاپتے تھے۔ اپنے رسالہ کے سرورق پر غالب کی تصویر اسی تعلق اور عقیدت کی بنا پر شائع کرتے ہوں گے جو انھیں مرزا سے تھی۔

ننھے آغا کو یہ تصویر سید بہادر حسین انجم نیشاپوری سے ملی تھی اور انھیں خواجہ قمرالدین خاں راقم نے جے پور سے بھجوائی تھی۔ خواجہ قمرالدین جے پور سے ۲۴ ستمبر ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں: "آپ نے تصویریں طلب کی ہیں، چنانچہ مومن کی تصویر موجود ہے، بھیجتا ہوں، یہ تصویر عہد شباب کی ہے اور میرے والد بدرالدین خاں عرف خواجہ امان نے بنائی تھی۔ دوسری شبیہ غالب ابھی حیدرآباد سے نہیں آئی مگر تقاضا کیا ہے جس وقت آجائے گی وہ بھی حاضر ہوگی۔ غالب مغفور کی عمر وقت انتقال کچھ کم نوّے برس کی تھی، چنانچہ ان کی تصویر سے جو نیازمند نے ان کی آخر عمر میں کھچوائی تھی یہ خوبی ثابت ہو جائے گا۔ تصویر غالب

۱۔ دیوان غالب طبع لاہور ۱۹۱۹ء، دیباچہ: ۳

۲۔ یہ صحیح نہیں، غلط ہے۔

تصویر یادگار غالب

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ٭ هم اسداللهم و هم اسداللهیم

شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسداللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم

انشاء اللہ ضرور بھیجوں گا۔[1]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عبدالصمد بیگ کے علاوہ خواجہ قمرالدین نے بھی مرزا کی آخری عمر میں ایک تصویر کھچوائی تھی۔ خواجہ قمرالدین نے ۱۹۰۴ء تک تو مرزا کی تصویر انجم کو نہیں بھیجی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے بعد کو بھیج دی اور یہی تصویر ۱۹۱۰ء کے 'معیار' میں شائع ہوئی۔

ایک اور فوٹو

مرزا کی ایک اور عکسی تصویر بہت رائج ہے۔ اس تصویر کا زاویہ پہلے سے کچھ مختلف ہے، ٹوپی میں بھی کچھ فرق ہے، عبا بہت قیمتی اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ان کے بعض دوستوں نے، غالب کا اصلی فوٹو اور حالی وغیرہ نے جو ان کا حلیہ اور لباس کا حال لکھا ہے ان سبھوں کو پیش نظر رکھ کر دہلی کے بعض آرٹسٹوں سے یہ تصویر تیار کرائی ہے اور پھر بعد میں جرمنی کے بعض فنکاروں نے بھی اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ یہ تصویر پہلی مرتبہ برلن سے شائع ہوئی۔ یہ فوٹو دراصل پہلے فوٹو کی بگڑی ہوئی (اچھی کی ہوئی؟) شکل ہے جس پر مصوروں نے اس قدر قلم کاری اور رنگ آمیزی کی ہے کہ تصویر اصلیت سے کچھ ہٹ گئی ہے۔ یہ تصویر معمولی ترمیموں کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ دیکھیے دیوان غالب طبع برلن، 'غالب' از جناب غلام رسول مہر، اشاعت اول، روح غالب از سید محی الدین قادری زور ۱۹۳۹ء، شرح کلام غالب از سرخوش، لاہور، اور علی گڑھ میگزین بابت ۱۹۴۸ء مرتبہ راقم، دیوان غالب آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۲ء جس میں قاضی معز الدین احمد نے اس تصویر کا نہایت خوب صورت عکس شائع کیا ہے۔

تصویر یادگار غالب

یادگار غالب کی اشاعت اول میں ایک تصویر مرزا غالب کی شائع کی گئی ہے۔ تصویر میں عقبی

---

[1] مرقع ادب از صفدر مرزاپوری: ۹، مکتوب خواجہ قمرالدین بہ نام انجم نیشاپوری "تذکرہ ضیغم" سے معلوم ہوتا ہے کہ انجم شاعر ہونے کے علاوہ مصور بھی تھے: تصویر عکس کشی میں مہارت کامل حاصل ہے، ص ۳۲

زمین اور آس پاس کی فضا کلیات غالب والی تصویر سے ملتی جلتی ہے لیکن اصل تصویر بہت بدلی ہوئی اور مسخ شدہ حالت میں ہے، یہ تصویر دراصل مرزا کی دو تین تصویریں سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں: "ایک فوٹو دو اور تصویروں کے ساتھ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمت اللہ رعد کے پاس اس غرض سے بھیج دیے تھے کہ ان میں سے جو تصویر بہترین ہو اس کی نقل "یادگار غالب" کے لیے تیار کرلی جائے۔ منشی صاحب نے خود مولانا ابوالکلام آزاد سے بیان کیا کہ" میں نے بنیادی طور پر یہی آخری فوٹو سامنے رکھا لیکن تخیل کا رخ اس طرف رہا کہ اس عالم سے چند برس پہلے ناک نقشا کیا رہا ہوگا۔ اس طرح ایک نیا چوکھا موقلم سے تیار کیا گیا۔"

تصویر کلیات غالب

کلیات نظم۔ مطبوعہ جنوری ۱۸۶۳ء میں بھی مرزا کی ایک تصویر صفحہ ۲۶۹ کے مقابل شائع کی گئی ہے، یہ کلیات طبع ۱۸۶۳ء کا گویا چربہ ہے۔ بہت معمولی اختلافات اور تبدیلیوں کے ساتھ، داڑھی کا خط زیادہ صاف، آنکھ ناک اور بھوؤں کی لکیریں واضح، پھر آنکھیں زیادہ کھلی ہوئی ہیں، کپڑوں کی شکنیں زیادہ ہیں، غالب کے شعر "غالب نام آورم" کا خط بھی بدلا ہوا ہے اور دونوں مصرعوں کے درمیان دو لکیریں ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس تصویر پر مصوّر کا نام بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر "قائم علی" کی بنائی ہوئی ہے۔

جعلی تصویریں

ابھی جن تصویروں کا ذکر ہوا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ تصویریں بنیادی طور پر تو اصلی ہیں لیکن بعد کے مصوّروں کے موقلم نے انھیں اصلیت سے ہٹا دیا ہے۔ اب ایسی دو تصویروں کا ذکر آئے گا جو سراسر فرضی ہیں۔

(۱) شرح کلام غالب مصنفہ عبدالباری آسی مرحوم اور نگار غالب نمبر میں مرزا کی جوانی کی جو تصویر

غالب از جناب غلام رسول مہر صفحہ: ب (اشاعت اول)

غالب

عمل: حکیم احمد لکھنوی

تصویر مندرجۂ شرح کلام غالب از آسی مرحوم

شائع کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں اور قطعاً فرضی ہے۔

(۷) اسی طرح وہ تصویر جس میں گاؤ تکیہ کے سہارے گھریلو لباس میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں کسی حال کے فن کار کے بحرِ تخیئل کی ایک موج ہے اور بس۔ اس کا پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ تصویر مرزا عسکری مرحوم نے حکیم احمد لکھنوی سے بنوائی تھی۔ موصوف نے مرحوم کو اس سے روکنا چاہا کہ ایسی فرضی تصویریں بنوانی اور شائع کرنی کچھ موزوں نہیں ہے۔

یہ تصویر تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری (حصہ نثر[۱]) 'آجکل' بابت ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء[۲] میں شائع ہوئی ہے اور اس کی ایک نہایت بھونڈی نقل جس سے تصویر بالکل مسخ ہوگئی ہے۔ 'ماہ نو' فروری ۵۰ء میں شائع کی گئی ہے۔

(۲)

خود مرزا نے کن کن لوگوں کو اپنی تصویریں بھیجی تھیں۔ ذیل کی سطروں میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نواب کلب علی خاں

۷ مئی ۶۸ء کے عریضے میں لکھتے ہیں "شوقِ قدمبوسی نے تنگ کیا۔ جب دیکھا کسی طرح جا نہیں سکتا۔ ناچار اپنا نقشہ اتروایا۔ اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہ میں جیتا ہوں تب تک اس صورت میں حاضر رہوں گا۔"[۳]

لیکن ۱۵ جون تک انھیں اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ تصویر نواب صاحب کو ملی یا نہیں۔ اسی تاریخ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "پیر و مرشد! سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے اس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ

---

۱. عمل: حکیم

۲. عمل: شیوہ رسالہ 'آجکل' کے آرٹسٹ

۳. مکاتیب غالب: ۸۰ اشاعت ششم ۱۹۴۹ء

ڈاک میں تلف نہ ہوگیا ہو. اگر اس کی رسید سے شرف اطلاع پاؤں تو دل جمعی ہو جائے؛"

مرزا کے پہلے خط کے لفاف پر منشی سیل چند میر منشی کا حسب ذیل نوٹ ہے "تصویر بعد ملاحظہ سپرد سید مجاور علی صاحب شد. ۲ جون ۱۸۶۸ء" خود نواب صاحب نے مرزا کے دوسرے خط کا جواب ۲ جولائی کو دیا اور لکھا "شبیہہ آں مشفق وصول شادمانی آوردہ از فرط محبتہا متصور شد"

ظاہراً یہ تصویر ضائع ہوگئی ورنہ "مکاتیب غالب" کے فاضل مرتب اس کے وجود کا ضرور ذکر کرتے اور پھر یہ کہ اپنی کتاب کی پہلی اشاعت میں کلیات غالب کی تصویر کا چربہ نہ چھاپتے۔

شیونرائن آرام

۱۰ جنوری ۱۸۶۳ء کو انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں: "اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضروری رامپور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا. دلی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں، وہ تمہارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو چاہے کسی کو دے ڈالو. تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کے ہم کو سوغات بھیجی ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا"

شہزادہ بشیرالدین

انھیں مرزا نے ۱۶ جون ۱۸۶۸ء سے پہلے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جو ان تک نہ پہنچ سکی، مرزا بہت پریشان ہوئے. لکھتے ہیں: "خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ اپنے کو کھچوا کر بصورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا، لفافہ انگریزی، اقبال نشان شہاب الدین احمد خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا. اس زمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی. ظاہراً ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے رنگ

---

۱ مکاتیب غالب: ۸۱

۲ مکاتیب غالب حواشی: ۱۸۷

۳ اردوئے معلی: ۲۸۵

کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی[۱]۔"

کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ تصویر ویرہی میں سہی آخر انھیں ملی یا نہیں؟

سیّد عالم علی خاں

سیّد عالم علی خاں اور سید احمد حسن مودودی کو ایک مشترکہ خط میں، ۱۷ جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں: "بارے بہ صورتِ تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجا لانی نہیں ہو سکتی۔ مگر خیر حضرت کے پیشِ نظر حاضر رہوں گا[۲]۔"

سیّد احمد حسن مودودی

انھوں نے مرزا کو اپنی ایک تصویر بھیجی تھی۔ مرزا نے بھی اپنی ایک تصویر سیّاح کی معرفت انھیں بھیج دی۔ ۱۷ اگست ۱۸۶۸ء کو ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "امسال فقیر نے جو اپنی خاکساری کا خاکہ یعنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے۔ یقین ہے وہ پہنچی ہوگی[۳]۔"

سید عالم علی خاں کے خط میں جس تصویر کا ذکر ہے وہ ظاہراً اس تصویر سے مختلف ہے جس کے متعلق غالب احمد حسن مودودی کو لکھ رہے ہیں دونوں کو جداگانہ تصویریں بھیجی ہوں گی۔ مقدم الذکر کو تصویر ۱۷ جولائی سے پہلے مل چکی تھی۔ جب کہ اس کے ایک ماہ بعد ۱۷ اگست تک غالب کو علم نہ تھا کہ جو تصویر انھوں نے مودودی کو بھیجی ہے وہ انھیں ملی یا نہیں۔

سیّد شاہ صاحب عالم مارہروی

مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور، حضرت صاحب عالم۔ شاہ عالم اور مقبول عالم سے غالب

۱۔ خطوطِ غالب: ۴۰۵

۲۔ اردوئے معلّٰی، ۱۸۴

۳۔ اردوئے معلّٰی: ۱۷۷

کے کیا تعلقات تھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، چودھری صاحب اور حضرت صاحب عالم کے نام جو خطوط مرزا نے لکھے ہیں وہ تعداد میں اس قدر ہیں کہ اس پر عودِ ہندی کی ایک پوری فصل تیار ہوگئی ہے۔ صاحب عالم اور مرزا دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے ملاقات کی تمنا کرتے رہے لیکن کم از کم حضرت صاحب عالم نے مرزا کو نہیں، تو ان کی تصویر دیکھ کر اپنی حسرت ضرور پوری کر لی تھی۔

اٹاوہ کی ایک لائبریری میں ابھی حال میں کچھ کتابیں اور نوادر مارہرہ سے آئے ہیں اس میں مرزا غالب کی ایک عکسی تحریر اور اس کا لفاف بھی ہے جو انھوں نے حضرت صاحب عالم کو بھیجا تھا۔ اس کا عکس ہدیۂ ناظرین ہے جس کے لیے ہم امتیاز الدین احمد زبیری کے ممنون ہیں۔

رائے بہادر پیارے لال

مرزا نے اپنی عکسی تصویر اپنے دوست لالہ پیارے لال انسپکٹر مدارس کو بھی دی تھی، اس تصویر کے نیچے خود غالب کے قلم سے ان کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

یہ تصویر پیارے لال کے عزیز لالہ سری رام کے پاس تھی اور انھوں نے اشاعت کے لیے سر عبدالقادر کو دی تھی جنھوں نے دیوان اردو کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں اسے شائع کیا۔

میاں داد خاں سیّاح

سیّاح غالب کے بڑے معتقدوں میں تھے اور ان کے نام متعدد خطوط غالب نے سپرد قلم کیے ہیں میر غلام بابا، میر ابراہیم علی خاں، سید احمد حسن مودودی، سید عالم علی خاں سے غالب کے تعلقات کی استواری میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل کئی سال تک غالب سے ان کی تصویر مانگتے رہے۔ مرزا بھی تصویر بھیجنے پر مستعد نظر آئے۔ لیکن کم از کم ۵ اگست ۱۸۶۰ء تک انھوں نے سیّاح کو تصویر نہیں بھیجی تھی۔ لیکن سیّاح کے اس اصرار کے باوجود انھوں نے تصویر بھیجی ہو، قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی شکل میں کہ

ان کی معرفت ایک تصویر احمد حسن مودودی کو بھیجی ہو۔ مرزا ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "فقیر نے جو اپنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے وہ پہنچی ہو گی[۱]"

ان وجوہ سے جن لوگوں کو غالب نے اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اس فہرست میں میں سیاح کا نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مرزا کے کسی خط میں اگرچہ تصویر بھیجنے کا ذکر نہیں ہے لیکن مرزا کے سارے خطوط موجود کہاں ہیں؟

سیاح کو تصویر بھیجنے کی تاریخ ۱۰ اگست ۶۸ء کے لگ بھگ سمجھنی چاہیے۔

(۳)

ذیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا نے اپنی تصویروں کے سلسلے میں اردو رقعات میں جو کچھ لکھا ہے اسے پیش کیا جائے۔

بنام سیاح

۵ ستمبر ۶۶ء کے ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں چھپا پھرتا ہوں۔ گوشہ نشین آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں، دیکھوا ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے اگر ہاتھ آ جاوے گی تو وہ ورق بھیجدوں گا[۲]"

پھر ۱۴ نومبر کو لکھتے ہیں "ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے اکبر آباد کو گئے ہیں وہ آ جائیں تو نقل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے گی[۳]"

۱۱ جون کو لکھتے ہیں: "تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشا کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینے پر نقشا اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں عید کے دن وہ آئے تھے میں نے

---

۱ اردوے: ۱۴۱

۲ اردوے: ۱۸

۳ اردوے: ۸

ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا، کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ یہ پانچواں مہینہ ہے آج تک نہیں آئے[1]"

۲۴ اگست ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں: "تصویر کھینچنے والا جو ایک ہندوستانی دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے، مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں[2]"

لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہیں ہوسکا۔ انھیں کو ۲۵ جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں "مصور سے سخت عاجز ہوں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں[3]"

یہ مصور صاحب تو نہ آئے اور نہ مرزا میں اب اتنا دم تھا کہ انگریز مصوروں کی دکان میں دو گھنٹہ بیٹھ کر تصویر بنوائیں لیکن مئی ۱۸۶۸ء سے پہلے کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر اتار لی اور قیاس ہے کہ یہی تصویر انھوں نے اگست ۱۸۶۸ء سے پہلے پہلے سیاح کو روانہ کردی۔

بنام مجروح

۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں: "میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویر کھنچا کریں اور تم انتظار[4]" کچھ انتظار دیکھنے کے بعد بھی جب مجروح کو تصویر نہیں ملی تو انھوں نے تقاضا کیا۔ ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو مرزا نے جواب دیا "میاں تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انھوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے، جب وہ تیار ہو جائے گی میں ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا خاطر جمع رکھو[5]" مارچ ۱۸۶۱ء تک تصویر تیار نہ ہو سکی

---

[1] اردوئے: ۲۵

[2] اردوئے: ۱۵

[3] اردوئے: ۱۹

[4] اردوئے: ۱۱۸، خطوط: ۲۶۵

[5] اردوئے: ۱۱۰، خطوط ۲۶۵

[6] مہیش پرشاد مرحوم اس خط کو ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا سمجھتے تھے۔ یہ خط میرے خیال میں تین سال بعد یعنی ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔

تھی۔ مرزا انھیں لکھتے ہیں: "میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں، جلدی نہ کرو، دیر آید درست آید۔"[1]

بنام شیونرائن آرام

معلوم ہوتا ہے شیونرائن نے مرزا سے ان کی تصویر مانگ بھیجی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوگا کہ آپ کو زحمت ہوگی۔ یوسف علی خاں عزیز (جن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اور جو ان دنوں دہلی ہی میں مقیم تھے، اس کام کو کرلیں گے۔ اس کے جواب میں مرزا ۳ جولائی ۱۸۶۰ء کو لکھتے ہیں: "تصویر میری لے کر کیا کرو گے، بے چارہ عزیز کیوں کر کھنچوا سکے گا۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھے لکھو، میں مصوّر سے کھنچوا کر تم کو بھیج دوں۔ نہ نذر در کار نہ نیاز۔"[2]

(۴)

مرزا کو تصویروں سے خاص دلچسپی تھی، اپنی تصویریں بھی دوسروں کو بھیجتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی تصویریں بھی منگواتے تھے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

مرزا نے غلام بابا خاں رئیس سورت سے ان کی تصویر منگوائی ہے۔ تصویر ملنے کے بعد سیّاح کو لکھتے ہیں۔

"حال تصویر کا یہ کہ میں نے اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب (غلام بابا خاں) کو دیکھا۔ لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسّر ہوا گفتار بھی اگر خدا نے چاہا سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب ... حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے آگے پہنچے اور پنجہ کا پتا نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔"[3] احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں: "تصویر مہرمنیر پہنچی ... اور میں نے رسید لکھ بھیجی۔"[4] شیونرائن کو لکھتے ہیں: "تصویر پہنچی۔"[5]

---

۱ اردوے، ۱۱۹، خطوط ۲۳۶

۲ خطوط: ۴۰۵

۳ اردوے: ۱۱

۴ اردوے: ۱۸۸

۵ اردوے: ۲۸۳

اسی طرح حاتم علی مہر کی تصویر ملنے کے بعد جو خط انھوں نے لکھا ہے[1] اس کا شمار ان کے بہترین خطوں میں ہو سکتا ہے۔

ان کے خطوں سے اس زمانے کے مصوّروں کے متعلق بھی کچھ معلومات مل جاتے ہیں۔

شیونرائن نے بہادر شاہ کی تصویر منگوا بھیجی ہے انھیں لکھتے ہیں: "بادشاہ کی تصویر کی صورت یہ ہے کہ اجڑا ہوا شہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ہاں ایک دو مصوّروں کی آبادی کا حکم ہو گیا ہے۔ وہ رہتے ہیں سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی ان کے گھروں میں سے لٹ گئیں جو کچھ رہیں وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصوّر کے پاس ایک تصویر ہے۔ وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں۔ تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے اور پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اتنا صرف بے جا کیا ضرورت ہے؟ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے۔ اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیجوں گا۔ مصوّروں سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور[2] نہ ازا نقصان منظور[3]۔

یہ اکتوبر ۱۸۵۸ء کی بات ہے۔ سن انقلاب کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ مصوّروں کا دہلی میں فقدان تھا۔ لیکن ۱۸۶۲ء تک اچھے خاصے مصوّر آباد ہو چکے تھے اور بعضوں سے مرزا کی دوستی بھی تھی ان کے رقعات میں کئی مصوّر دوستوں کا ذکر ملتا ہے[4]۔ ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز مصوّروں کی دو کانیں دہلی میں ۱۸۶۲ء میں موجود تھیں[5]۔ وہاں فوٹوگرافر بھی موجود تھے اور مصوّر بھی۔ مصوّر کاغذ پر بھی تصویریں بناتے تھے اور ہاتھی دانت پر بھی[6]۔ اور آئینہ پر بھی نقشا اتروانے کا رواج تھا۔

---

[1] اردوے: ۱۰۹، خطوط: ۳۱۲

[2] اردوے ۲۶۵ خطوط: ۳۹۲

[3] اردوے: ۱۰،۱۵۰۹

[4] اردوے ۱۵

[5] اردوے: ۲۶۵

[6] اردوے: ۲۵

ہمیں کم ازکم ایک مصوّر کا علم ہے جس سے غالب اپنا کام کرایا کرتے تھے۔ محمد افضل ان سے تصویریں بنواتے تھے اور اپنی کتابوں کے سرِورق کی تزئین اور قصیدوں کے بیل بوٹے بنانے کا کام بھی لیا کرتے تھے۔ محمد افضل کا ذکر ان کے خطوط میں متعدد بار آیا ہے۔ "میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویریں کھینچیں اور تم انتظار نہ"۔ "وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انھوں نے واپس کردی"۔ "میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں، جلدی نہ کرو"۔ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں: "دو مہینے رات دن خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ ۶۴ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دے دیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا"۔[1]

مرزا کی تاریخی تصنیف "مہر نیم روز" جو فتح الملک ولی عہد بہادر کے حسب الحکم فخر المطابع میں شائع ہوئی تھی اس کا سرورق، بیل بوٹے، اور نقش و نگار "محمد خدا بخش" مصوّر نے بنائے تھے۔

محمد افضل مصوّر، دہلی کے مشہور مصوّروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود اپنے زمانے کے ممتاز مصوّر تھے۔ غالب کے عزیزوں میں خواجہ امان اور خواجہ قمر الدین خاں انھیں کے تربیت یافتگان میں سے تھے۔

تاریخ تحریر: ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء

نظر ثانی: ۱۵ر مئی ۱۹۵۲ء

---

[1] خطوط: ۱۶۴

قاضی عبدالودود

ہرمزد ثم عبدالصمد

تمہید: غالب نے عبدالصمد کو اپنے وقت کا 'جاماسپ'[1]، اور 'بزرجمہر'[2] کہا ہے اور اسے 'نشتین ساسان'[3] کا لقب دینے سے باز رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ تنہا 'رازداں' تھا اتنا 'رازگو' نہ تھا۔ غالب نے اسے منطق و فلسفہ میں[4] مولوی فضل حق کا نظیر، عربی کا فاضل[5] متبحر، اور فارسی کا 'مالک[6] زبان' بتایا ہے، اور جابجا اس سے اپنی فیض یابی کا ذکر بڑے فخر و ناز سے کیا ہے:

(۱) وایں... زبان آموزگار ست... ومن آئینِ معنی آفرینی و کیشِ یگانہ بینی ازوے فراگرفتہ ام... بر روانِ وے آباد...

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم[9] — سیرابیِ نطقم اثرِ فیضِ حکمت د ۱۳۱ و ۱۴۱

قاطع: قاطع برہان۔ برہان: برہان قاطع، نسخۂ مطبوعہ ۱۲۶۴ھ کے صفحات کے حوالے دیے گئے ہیں، د: درفش کاویانی: قاطع کی اشاعت ثانی۔ دا: د کی جگہ دا اگر کوئی عبارت صرف د میں ہے، قاطع کی اشاعت ثانی میں نہیں۔ محرق: محرق قاطع برہان طبع ۱۲۸۰ھ۔ لِ: لطائف غیبی طبع ۱۲۸۱ھ، رد محرق مصنفۂ غالب مگر منسوب بہ سیاح۔ (حوالہ صفحوں کا نہیں لطیفوں کا دیا گیا ہے)۔ موید: موید برہان طبع ۱۲۸۲ھ۔ تیغ: تیغ تیز از غالب رد موید۔ قطع: قاطع القاطع۔ رد قاطع طبع ۱۲۸۳ھ اس کتاب کا جواب غالب نے نہیں دیا۔ ا م: اردوئے معلیٰ طبع لاہور ۱۹۲۲ء، ۴۴

(٢) "لطائف فارسی بحث غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ حقیقت اس زبان کی... خاطر نشان ہوگئی" ض

(٣) "جانتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے" مکاتیب غالب اشاعت ثانی ص٦

(١) غالب نے عبدالصمد کے جو حالات لکھے ہیں، وہ کچھ زیادہ نہیں: اصلی نام ہرمزد تھا اور سلسلۂ نسب[١١] ساسان پنجم تک پہنچتا تھا۔ اس کا وطن[١٢] یزد تھا اور وہاں کے "جلیل القدر"[١٣] امیر زادوں میں شمار ہوتا تھا۔ "علمائے عرب[١٤] و بغداد" سے "پچاس برس" علوم عربیہ تحصیل کرنے کے بعد زردشتی مذہب ترک[١٥] کر کے مسلمان ہوگیا تھا۔ اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد[١٦] رکھا تھا۔ یہ "مومن موحد وصوفی صافی" بہ طریق سیاحت ١٢٢٦ھ[١٨] میں آگرہ پہنچا اور دو سال وہاں غالب کے گھر[١٩] میں مہمان رہا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ آگرہ کہاں سے آیا تھا اور وہاں سے اس کا کہاں جانا ہوا۔ غالب کے قیام دہلی کے بعد تک اس سے مراسلت رہی، اور وہ کبھی کبھی اپنے خط میں اپنا نام عبدالصمد کی جگہ "اردند[١٧] بندہ" بھی لکھا کرتا تھا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ ١٢٢٦ھ میں اس کی کیا عمر تھی۔ لیکن جس شخص نے ٥٠ برس علمائے عرب و بغداد سے تحصیل علم کی ہو، وہ اس وقت ٧٥ برس سے کم کا ہو، یہ قرین قیاس نہیں۔ زمانۂ وفات کی تعیین غالب نے نہیں کی۔ لیکن قاطع وغیرہ میں جو الفاظ اس کے لیے استعمال کیے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ قاطع کی تصنیف سے پہلے ہی وہ راہیِ عدم ہوچکا تھا۔ عبدالصمد سے استفادہ کے بہ بانگ دہل اعلان کے باوجود، غالب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔"

---

٥٣ (حاشیہ صفحہ گزشتہ سے) ض = غالب کا ایک طویل خط بنام ضیاء الدین جس کا عکس نغ میں شائع ہوا ہے۔ عود = عود ہندی انوار المطابع الہ آباد۔ نغ = علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر ١٩٤٩ء۔ ر = غالب کی راست گفتاری از راقم علی گڑھ میگزین ١٩٤٨ء۔ مح = غالب بہ حیثیت محقق از راقم۔ جہاں = فرہنگ جہاں گیری مطبوعہ۔ ی = یادگار غالب طبع لکھنؤ۔

او٢ ض۔ بزرجمہر چاہیے۔ جیم فارسی سے بالکل غلط ہے۔ غالب نے اسی سے لکھا ہے۔ ٣ دا عبارت مفصل ہو میں ملے گی ٤ ض ٥ و ٦ تیغ صفحہ ١٢، ١٣؛ ٧ معنی آفرینی = شاعری۔ عود کی عبارت جس میں استاد سے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔" ی ص ۱۴

(۲) عبدالصمد سے متعلق غالب کے بیانات میں تضاد ہے، لیکن فی الحال اسے نظرانداز کر کے، یہ دیکھنا ہے کہ "فارسی نژاد"، کے وہ "لطائف" اور "فارسی آمیختہ بہ عربی" کے وہ "غوامض" جو اس کے حوالے سے غالب نے پیش کیے ہیں کس پائے کے ہیں:

(۱) فارسی میں دو حرف "متحد المخرج" بلکہ "قریب المخرج" موجود نہیں، س ہے ث وص نہیں، ت ہے ط نہیں، الف ہے ع نہیں، غ ہے ق نہیں، ز ہے ض اور ظ نہیں۔ اس صورت میں یہ کیوں کر روا رکھا جاسکتا ہے کہ "دو حرف متحد المخرج" ذ اور ز فارسی میں موجود ہوں؟ ذ جو فارسی میں ملتی ہے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے:

"دبیرانِ پارس را قاعدہ چناں بود کہ برسرِ دال ابجد نقطہ نہادندے۔ پسینیاں ازیں رسم الخط بہ وجود ذال منقوطہ درگماں افتادند۔ چوں دریں اندیشہ وجود دال بے نقطہ از میاں می رفت و ہمہ ذال منقوطہ می ماند، اکا برعرب قاعدۂ قرار دادند، و تفرقہ دال و ذال بر آں قاعدہ نہادند" د ص ۱۳

غالب کو اس توجیہہ پر بڑا ناز تھا، مگر یہی بات کسی قدر اختلاف کے ساتھ جہاں میں موجود ہے

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) اشتق کا ذکر ہے فصل ۳ میں ہے ۸۔ یگانہ بینی: توحید وجودی "دو دیگر از مہین انبوہ پارسیاں یگانہ بنیا نند کہ وایشاں را مہتابی خوانند۔ نزد ایشاں جہاں را در خارج وجودے نیست ہرچہ ہست ایزد است ورائے او چیزے نہ" دبستان مذاہب ص ۵۰۔ ۹۔ کلیات نظم فارسی ص ۲۷۶ غزل کا شعر ہے۔

۱۰۔ د ص ۱۳، ل ص ۱۵۔ ۱۱۔ ل ص ۱۵۔ د میں ہے "پارسی نژاد فرزانہ بود از تخمۂ ساسانیاں" ص ۱۳۔ ۱۲۔ ل ص ۱۵، ۱۳ و ۱۴ ل ص ۱۵۔ ۱۵۔ د ص ۱۳ ل ص ۱۵۔ ۱۶۔ "و خود را عبدالصمد نامیدہ" د ص ۱۳، مگر حالی کہتے ہیں کہ عبدالصمد نام رکھا گیا۔ ی ص ۱۴۔ ۱۷۔ ض ۱۹ و ۱۸ د ص ۱۳۔ "و با کبر آباد۔ دو سال بکلبہ احزان من آسودہ است۔" مگر حالی لکھتے ہیں: "دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرہ میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔"

ی ص ۱۴۔ حالی نے یہ نہیں بتایا کہ عبدالصمد کے قیام دہلی کا حال انھیں کس طرح معلوم ہوا؟ د ص ۲۔ ۱۸۔ کل باتیں جو غالب نے عبدالصمد کے حوالے سے لکھی ہیں نقل کر دی گئی ہیں لیکن بعض امور سے متعلق اظہار رائے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے ۱۹۔ ہندوستانی ز اور ض میں فرق نہ کرتے ہوں۔ لیکن سعدی کے ایک شعر سے جس میں فصل کا (باقی اگلے صفحہ پر)

غالب نے کمال یہ کیا کہ صاحب مؤیّد نے جہاں کی عبارت نقل کی، تو باوجود اس کے کہ کتاب کا حوالہ صراحتہً موجود تھا۔ انھوں نے صاحب مؤیّد پر [۲۱] یہ الزام لگایا کہ انھوں نے مجھ سے سرقہ کیا ہے۔

"حضرات کو میں اس امر خاص میں بہت تکلیف دوں گا۔ اور دادطلبی میں اصرار و ابرام کروں گا۔ فرہنگہائے پیشیں میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہ گار ورنہ مولوی اٹھائی گیرا۔ یہ راز مجھ سے شت ہر مزدتم مولانا واولانا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمتہ نے کہا ہے، دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا تھا ایسی نئی بات کو چرانا اور اپنا قول بنانا چوری اور سرزوری خیرہ رائی اور بے حیائی ہے یا نہیں؟... اے اہل عقل کوئی تو بولو خدا لگی۔" تیغ ص ۱۲

فارسی میں "دو قریب المخرج" حروف کے وجود کا انکار بدیہیات کا انکار ہے۔ ب پ و ف قریب المخرج ہیں، اسی طرح را و رل، دا و رت وغیرہ طرہ یہ کہ غالب نے خود قاطع میں دوسری جگہ اس کا اقرار کیا ہے کہ فارسی میں قریب المخرج حروف ہیں۔ غالب رسنا دا ایک فارسی لفظ، کی بحث میں لکھتے ہیں: "چوں در دو حرف قریب المخرج بہ افکندن احد المتجانسین رسم ست" رت ۲ ذ کا صحیح تلفظ جن لوگوں کو معلوم ہے وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذ اور ز متحد المخرج ہیں۔ فارسی میں وجود ذ کی جو وجہ غالب نے لکھی ہے وہ جہان میں موجود ہے۔ لیکن یہ کتاب ہندوستان میں عہد جہاں گیری میں تمام ہوئی ہے اور زمانۂ قدیم کے بارے میں اس کے وہ بیانات جن کی سند اس میں نہیں لازماً قابل قبول نہیں۔ پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے فارسی مخطوطات موجود ہیں۔ مگر ان سے غالب اور صاحب جہاں کے اس دعوے کی کہ کاتب دال بھی ذال کی طرح لکھا کرتے تھے، تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ بات کہ د و ذ میں فرق کرنے کے لیے اکابر عرب نے کوئی قاعدہ بنایا تھا جہاں میں نہیں اور کسی طرح قرین قیاس بھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ عربی میں ایک [۲۲] مختصر سی نظم اس کے متعلق البتہ ہے،

رباتی حاشیہ صفحہ گزشتہ سے، قافیہ عدل آیا ہے، ایران کے متعلق جو نتیجہ نکلتا ہے واضح ہے۔

۲۱ تفاصیل رت ۲۸ و ۱۴۳ غالب کو ان مخطوطات کا ذکر کرنا تھا جن میں د و ذ میں فرق نہیں۔

۲۲ تاریخ گزیدہ میں یہ نظم بہ نام ظہیر فاریابی اور فرہنگ شعوری، فارسی ترکی جلد ا طبع قسطنطنیہ، میں بھی یہی ہے، مگر حاشیۂ القاموس المحیط (طبع قاہرہ) میں بہ نام ابونصر فارابی۔ حلل مطرز در فن معما و لغز مصنفہ شرف الدین علی یزدی مورخ مشہور (نسخۂ سید محفوظ الحق مرحوم) میں یہ نظم موجود ہے مگر مصنف کا نام نہیں دیا۔ کلیات ظہیر کی تینوں مطبوعہ اشاعتیں اور متعدد قلمی نسخے جو میری نظر سے گذرے ہیں، اس سے خالی ہیں۔

مگر یہ کسی عرب کی طرف منسوب نہیں۔ قدیم ترین فارسی کتاب جس میں یہ قاعدہ ملتا ہے۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے[۲۳]

"بدانک در صحیح لغت دری ماقبل دال مہملہ الآراء ساکن چنانک درد و مرد یا زا ساکن چنانک دزد و مزد یا نون ساکن چنانک کمند و گزند نباشد و ہر دال کہ ماقبل آں یکے از حروف مد و لین است، چنانک باذ و شاذ و سوذ و شوذ و دیذ و کلیذ یا یکے از حروف صحیح متحرکست چنانک نمذ و سبذ و ذو ہمہ ذال معجمہ اند۔ و در زبان اہل غزنین و بلخ و ما وراء النہر ذال معجمہ نیست و جملہ دالات مہملہ در لفظ آرند" ص۱۹۲

نصیر الدین طوسی، ابن یمین[۲۴] وغیرہ کی طرف بھی ایسی نظمیں منسوب ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن فارسی لفظوں میں ذال لکھنا چاہیے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود غالب کے اس بیان سے کہ د و ذ میں تمیز کے لیے قاعدہ بنایا گیا تھا، یہ ثابت ہے کہ فارسی میں ذ تھی۔ نہ ہوتی تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوتا کہ یہ حرف فارسی میں نہیں۔ حقیقتِ حال "فاضل بزرگ" محمد بن عبد الوہاب قزوینی مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے۔

---

۲۳ المعجم اوائل ماۂ ہفتم میں لکھی گئی ہے۔ حسین بن ابراہیم نطنزی (متوفی ۴۹۹ھ) نسخۂ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ، ورق ۱۵۵پ میں یہ عبارت ہے: "والحروف لاتدخل الفارسیۃ ثمانیۃ یجمعہا: صح حط "ظ قثع" اس سے صاف ظاہر ہے کہ نطنزی کے نزدیک ذال فارسی حروف میں ہے۔ خ میں جو ذال کی بحث ہے وہ بھی دیکھی جائے۔

۲۴ ابن یمین کا ایک قطعہ جو اس کے کلیات سے ماخوذ ہے۔ "فرہنگ غالب" نوشتہ راقم خ، ص۲۵۹ میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ جن الفاظ کو غالب ذ کی جگہ د سے لکھنا چاہتے ہیں، ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب ایران میں ذ سے لکھے جاتے ہیں۔ اور انھیں کسی زمانے میں ز سے لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے جو آرزو پر ایک بسیط محققانہ مقالے کے مصنف ہیں، مجھے لکھا تھا کہ آرزو نے بھی آخری عمر میں وہی رائے ظاہر کی تھی جو غالب کی ہے۔ اس صورت میں غالب کے ہم نوا اور بھی ہیں لیکن سوال ایران کا ہے ہندستان کا نہیں۔ اس بات سے کہ تسلط اسلام سے پہلے ایران میں کوئی حرف ایسا تھا یا نہیں جس کی آواز ذال کی ہو کبھی اور بحث کی جائے گی

تصویر یادگار غالب

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس * هم اسد اللهم و هم اسد اللهیم

شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص غالب مرحوم

انشاء اللہ ضرور بھیجوں گا۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عبدالصمد بیگ کے علاوہ خواجہ قمرالدین نے بھی مرزا کی آخری عمر میں ایک تصویر کھچوائی تھی خواجہ قمرالدین نے ۱۹۰۴ء تک تو مرزا کی تصویر انجم کو نہیں بھیجی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے بعد کو بھیج دی اور یہی تصویر ۱۹۱۰ء کے "معیار" میں شائع ہوئی۔

ایک اور فوٹو

مرزا کی ایک اور عکسی تصویر بہت رائج ہے۔ اس تصویر کا زاویہ پہلے سے کچھ مختلف ہے، ٹوپی میں بھی کچھ فرق ہے، عبا بہت قیمتی اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ان کے بعض دوستوں نے غالب کا اصلی فوٹو اور حالی وغیرہ نے جو ان کا حلیہ اور لباس کا حال لکھا ہے ان سبھوں کو پیش نظر رکھ کر دہلی کے بعض آرٹسٹوں سے یہ تصویر تیار کرائی ہے اور پھر بعد میں جرمنی کے بعض فنکاروں نے بھی اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ یہ تصویر پہلی مرتبہ برلن سے شائع ہوئی۔ یہ فوٹو دراصل پہلے فوٹو کی بگڑی ہوئی یا اچھی کی ہوئی شکل ہے جس پر مصوروں نے اس قدر قلم کاری اور رنگ آمیزی کی ہے کہ تصویر اصلیت سے کچھ ہٹ گئی ہے۔ یہ تصویر معمولی ترمیموں کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ دیکھیے دیوان غالب طبع برلن، 'غالب' از جناب غلام رسول مہر، اشاعت اول، روح غالب از سید محی الدین قادری زور ۱۹۳۹ء، شرح کلام غالب از سرخوش، لاہور، اور علی گڑھ میگزین بابت ۱۹۴۸ء مرتبہ راقم، دیوان غالب آزاد کتاب گھر دہلی ۵۲ء جس میں قاضی معز الدین احمد نے اس تصویر کا نہایت خوب صورت عکس شائع کیا ہے۔

تصویر یادگار غالب

یادگار غالب کی اشاعت اوّل میں ایک تصویر مرزا غالب کی شائع کی گئی ہے۔ تصویر میں عقبی

ل مرقع ادب از صفدر مرزاپوری: ۹، مکتوب خواجہ قمرالدین بہ نام انجم نیشاپوری "تذکرۂ ضیغم" سے معلوم ہوتا ہے کہ انجم شاعر ہونے کے علاوہ مصور بھی تھے: تصویر عکس کشی میں مہارت کامل حاصل ہے: ص ۳۲

زمین اور آس پاس کی فضا کلیات غالب والی تصویر سے ملتی جلتی ہے لیکن اصل تصویر بہت بدلی ہوئی اور مسخ شدہ حالت میں ہے، یہ تصویر دراصل مرزا کی دو تین تصویریں سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں: "ایک فوٹو دو اور تصویروں کے ساتھ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمت اللہ رعد کے پاس اس غرض سے بھیج دیے تھے کہ ان میں سے جو تصویر بہترین ہو اس کی نقل "یادگارِ غالب" کے لیے تیار کرلی جائے۔ منشی صاحب نے خود مولانا ابوالکلام آزاد سے بیان کیا کہ" میں نے بنیادی طور پر یہی آخری فوٹو سامنے رکھا لیکن تخیل کا رخ اس طرف رہا کہ اس عالم سے چند برس پہلے ناک نقشا کیا رہا ہوگا۔ اس طرح ایک نیا چوکھا موقلم سے تیار کیا گیا۔"

تصویر کلیاتِ غالب

کلیاتِ نظم، مطبوعہ جنوری ۱۸۶۲ء میں بھی مرزا کی ایک تصویر صفحہ ۲۶۹ کے مقابل شائع کی گئی ہے، یہ کلیاتِ طبع ۱۸۶۳ء کا گویا چربہ ہے۔ بہت معمولی اختلافات اور تبدیلیوں کے ساتھ، داڑھی کا خط زیادہ صاف، آنکھ ناک اور بھوؤں کی لکیریں واضح، پھر آنکھیں زیادہ کھلی ہوئی ہیں، کپڑوں کی شکنیں زیادہ ہیں، غالب کے شعر "غالب نام آورم" کا خط بھی بدلا ہوا ہے اور دونوں مصرعوں کے درمیان دو لکیریں ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس تصویر پر مصوّر کا نام بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویر، "قائم علی" کی بنائی ہوئی ہے۔

•

جعلی تصویریں

ابھی جن تصویروں کا ذکر ہوا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ تصویریں بنیادی طور پر تو اصلی ہیں لیکن بعد کے مصوروں کے موقلم نے انھیں اصلیت سے ہٹا دیا ہے۔ اب ایسی دو تصویروں کا ذکر آئے گا جو سراسر فرضی ہیں۔

(۱) شرح کلامِ غالب مصنفہ عبدالباری آسی مرحوم اور نگارِ غالب نمبر میں مرزا کی جوانی کی جو تصویر

ے غالب از جناب غلام رسول مہر صفحہ: ب (اشاعت اول)

غالب

عمل: حکیم احمد لکھنوی

تصویر مندرجۂ شرح کلام غالب از آسی مرحوم

شائع کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں اور قطعاً فرضی ہے۔

(۷) اسی طرح وہ تصویر جس میں گاؤ تکیہ کے سہارے گھریلو لباس میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں کسی حال کے فن کار کے بحرِ تخیّل کی ایک موج ہے اور بس۔ اس کا پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ تصویر مرزا عسکری مرحوم نے حکیم[1] احمد لکھنوی سے بنوائی تھی، موصوف نے مرحوم کو اس سے روکنا چاہا کہ ایسی فرضی تصویریں بنوانی اور شائع کرنی کچھ موزوں نہیں ہے۔

یہ تصویر تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری (حصہ نثر)، آجکل[2]، بابت ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ہے اور اس کی ایک نہایت بھونڈی نقل جس سے تصویر بالکل مسخ ہو گئی ہے۔ "ماہ نو" فروری ۱۹۵۰ء میں شائع کی گئی ہے۔

(۲)

خود مرزا نے کن کن لوگوں کو اپنی تصویریں بھیجی تھیں، ذیل کی سطروں میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نواب کلب علی خاں

۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کے عریضے میں لکھتے ہیں "شوقِ قدمبوسی نے تنگ کیا۔ جب دیکھا کسی طرح جا نہیں سکتا۔ ناچار اپنا نقشہ اتروایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہ میں جیتا ہوں تب تک اس صورت میں حاضر رہوں گا۔"[3]

لیکن ۱۵ جون تک انھیں اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ تصویر نواب صاحب کو ملی یا نہیں۔ اسی تاریخ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "پیر و مرشد! سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے اس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ

---

۱ عمل: حکیم

۲ عمل: شیوہ رسالہ آجکل کے آرٹسٹ

۳ مکاتیب غالب: ۱۰۰، اشاعت ششم ۱۹۴۹ء

ڈاک میں تلف نہ ہوگیا ہو۔ اگر اس کی رسید سے شرف اطلاع پاؤں تو دل جمعی ہو جائے[۱]۔

مرزا کے پہلے خط کے لفاف پر منشی سیل چند میر منشی کا حسب ذیل نوٹ ہے "تصویر بعد ملاحظہ سپرد سید مجاور علی صاحب شد۔ ۲ر جون ۱۸۶۸ء" خود نواب صاحب نے مرزا کے دوسرے خط کا جواب، جولائی کو دیا اور لکھا "شبیہہ آں مشفق وصول شادمانی آوردہ از فرط محبتہا متصور شد[۲]"

ظاہر ایہ تصویر ضائع ہوگئی ورنہ "مکاتیب غالب" کے فاضل مرتب اس کے وجود کا ضرور ذکر کرتے اور پھر یہ کہ اپنی کتاب کی پہلی اشاعت میں کلیاتِ غالب کی تصویر کا چربہ نہ چھاپتے۔

شیونرائن آرام

۱۰ر جنوری ۱۸۶۳ء کو انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں: "اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے، رامپور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں، وہ تمہارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو چاہے کسی کو دے ڈالو۔ تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کے ہم کو سوغات بھیجی ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا[۳]"

شہزادہ بشیر الدین

انھیں مرزا نے ۱۲ر جون ۶۸ء سے پہلے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جو ان تک نہ پہنچ سکی، مرزا بہت پریشان ہوئے۔ لکھتے ہیں: "خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ اپنے کو کھوا کر بصورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا، لفافہ انگریزی، اقبال نشاں شہاب الدین احمد خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس زمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی۔ ظاہراً ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح

۱۔ مکاتیب غالب: ۸۱

۲۔ مکاتیب غالب حواشی: ۱۸۷

۳۔ اردوئے معلیٰ: ۲۸۵

کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی[1]۔"

کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ تصویر دیر ہی میں سہی آخر انھیں ملی یا نہیں؟

سیّد عالم علی خاں

سید عالم علی خاں اور سید احمد حسن مودودی کو ایک مشترکہ خط میں ۱۰ جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں "بارے بہ صورت تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچنا معلوم ہوا۔ اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجالانی نہیں ہو سکتی۔ مگر خیر حضرت کے پیش نظر حاضر رہوں گا[2]۔"

سیّد احمد حسن مودودی

انھوں نے مرزا کو اپنی ایک تصویر بھیجی تھی۔ مرزا نے بھی اپنی ایک تصویر سیّاح کی معرفت انھیں بھیج دی۔ ۱۰ اگست ۱۸۶۸ء کو ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "امسال فقیر نے جو اپنی خاکساری کا خاکہ یعنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے۔ یقین ہے وہ پہنچی ہوگی[3]۔"

سید عالم علی خاں کے خط میں جس تصویر کا ذکر ہے وہ ظاہراً اس تصویر سے مختلف ہے جس کے متعلق غالب احمد حسن مودودی کو لکھ رہے ہیں۔ دونوں کو جداگانہ تصویریں بھیجی ہوں گی۔ مقدم الذکر کو تصویر ۱۰ جولائی سے پہلے مل چکی تھی۔ جب کہ اس کے ایک ماہ بعد، ۱۰ اگست تک غالب کو علم نہ تھا کہ جو تصویر انھوں نے مودودی کو بھیجی ہے وہ انھیں ملی یا نہیں۔

سیّد شاہ صاحب عالم مارہروی

مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور، حضرت صاحب عالم۔ شاہ عالم اور مقبول عالم تے غالب

---

[1] خطوط غالب: ۴۰۵

[2] اردوئے معلّٰی: ۱۸۴

[3] اردوئے معلّٰی: ۱۷۷

کے کیا تعلقات تھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، چودھری صاحب اور حضرت صاحب عالم کے نام جو خطوط مرزا نے لکھے ہیں وہ تعداد میں اس قدر ہیں کہ اس پر عودِ ہندی کی ایک پوری فصل تیار ہو گئی ہے۔ صاحب عالم اور مرزا دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے ملاقات کی تمنا کرتے رہے لیکن کم از کم حضرت صاحب عالم نے مرزا کو نہیں، تو ان کی تصویر دیکھ کر اپنی حسرت ضرور پوری کر لی تھی۔

اٹاوہ کی ایک لائبریری میں ابھی حال میں کچھ کتابیں اور نوادر مارہرہ سے آئے ہیں اس میں مرزا غالب کی ایک عکسی تحریر اور اس کا لفافہ بھی ہے جو انھوں نے حضرت صاحب عالم کو بھیجا تھا۔ اس کا عکس ہدیۂ ناظرین ہے جس کے لیے ہم امتیاز الدین احمد زبیری کے ممنون ہیں۔

رائے بہادر پیارے لال

مرزا نے اپنی عکسی تصویر اپنے دوست لالہ پیارے لال انسپکٹر مدارس کو بھی دی تھی، اس تصویر کے نیچے خود غالب کے قلم سے ان کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسداللّٰہم و ہم اسداللّٰہیم

یہ تصویر پیارے لال کے عزیز لالہ سری رام کے پاس تھی اور انھوں نے اشاعت کے لیے سر عبدالقادر کو دی تھی جنھوں نے دیوان اردو کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں اسے شائع کیا۔

میاں داد خاں سیّاح

سیّاح غالب کے بڑے معتقدوں میں تھے اور ان کے نام متعدد خطوط غالب نے سپرد قلم کیے ہیں میر غلام بابا، میر ابراہیم علی خاں، سید محمد حسن مودودی، سید عالم علی خاں سے غالب کے تعلقات کی استواری میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل کئی سال تک غالب سے ان کی تصویر مانگتے رہے۔ مرزا بھی تصویر بھیجنے پر مستعد نظر آتے۔ لیکن کم از کم ۲۰ اگست ۱۸۶۰ء تک انھوں نے سیّاح کو تصویر نہیں بھیجی تھی۔ لیکن سیّاح کے اس اصرار کے باوجود انھوں نے تصویر بھیجی ہو، قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی شکل میں کہ

ان کی معرفت ایک تصویر احمد حسن مودودی کو بھیجی ہو۔ مرزا ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں، "فقرنے جو اپنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے، یقین ہے وہ پہنچی ہوگی [۱]"

ان وجوہ سے جن لوگوں کو غالب نے اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اس فہرست میں میں سیاح کا نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مرزا کے کسی خط میں اگرچہ تصویر بھیجنے کا ذکر نہیں ہے لیکن مرزا کے سارے خطوط موجود کہاں ہیں؛

سیاح کو تصویر بھیجنے کی تاریخ ۱۰ اگست ۶۸ء کے لگ بھگ سمجھنی چاہیے۔

(۳)

ذیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا نے اپنی تصویروں کے سلسلے میں اردو رقعات میں جو کچھ لکھا ہے اسے پیش کیا جائے۔

بنام سیاح

۵ ستمبر ۶۶ء کے ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھپا کھپا پھروں۔ گوشہ نشین آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں، دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے اگر ہاتھ آ جاوے گی تو وہ ورق بھیجدوں گا [۲]"

پھر ۱۴ نومبر کو لکھتے ہیں "ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے اکبر آباد کو گئے ہیں وہ آ جائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔"

۱۱ جون کو لکھتے ہیں: "تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشا کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینے پر نقشا اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں عید کے دن وہ آئے تھے میں نے

---

[۱] اردوے: ۱۷۷

[۲] اردوے: ۱۷

[۳] اردوے: ۸

ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا، کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا یہ پانچواں مہینہ ہے آج تک نہیں آئے[1]

۲۴ اگست ۱۸۶۲ء کو لکھتے ہیں "تصویر کھینچنے والا جو ایک ہندوستانی دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے، مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں"[2]

لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہیں ہوسکا۔ انھیں کو ۲۵ جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں "مصور سے سخت عاجز ہوں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں"[3]

یہ مصور صاحب تو نہ آئے اور نہ مرزا میں اب اتنا دم تھا کہ انگریز مصوروں کی دکان میں دو گھنٹہ بیٹھ کر تصویر بنوائیں لیکن مئی ۱۸۶۸ء سے پہلے کسی فوٹوگرافر نے ان کی تصویر اتار لی اور قیاس ہے کہ یہی تصویر انھوں نے اگست ۱۸۶۸ء سے پہلے پہلے سیاح کو روانہ کردی۔

بنام مجروح

۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں: "میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار"[4] کچھ انتظار دیکھنے کے بعد بھی جب مجروح کو تصویر نہیں ملی تو انھوں نے تقاضا کیا۔ ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو مرزا نے جواب دیا: "میاں تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انھوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے، جب وہ تیار ہو جائے گی میں ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا خاطر جمع رکھو"[5] مارچ ۱۸۶۱ء[6] تک تصویر تیار نہ ہوسکی

---

[1] اردوئے: ۲۵

[2] اردوئے: ۱۵

[3] اردوئے: ۱۹

[4] اردوئے: ۱۱۸، خطوط: ۲۶۵

[5] اردوئے: ۱۱۰، خطوط ۲۶۵

[6] مہیش پرشاد مرحوم اس خط کو ۱۸۶۴ء کا لکھا ہوا سمجھتے تھے۔ یہ خط میرے خیال میں تین سال بعد یعنی ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے

تھی۔ مرزا انھیں لکھتے ہیں: "میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں، جلدی نہ کرو، دیر آید درست آید"

بنام شیو نرائن آرام

معلوم ہوتا ہے شیو نرائن نے مرزا سے ان کی تصویر مانگ بھیجی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوگا کہ آپ کو زحمت ہوگی۔ یوسف علی خاں عزیز داحن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اور جو ان دنوں دہلی ہی میں مقیم تھے، اس کام کو کرلیں گے۔ اس کے جواب میں مرزا ۳ جولائی ۱۸۶۰ء کو لکھتے ہیں: "تصویر میری لے کر کیا کروگے، بے چارہ عزیز کیوں کر کھنچوا سکے گا، اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھے لکھو، میں مصوّر سے کھنچوا کر تم کو بھیجدوں۔ نہ نذر در کار نہ نیاز۔"

(۴)

مرزا کو تصویروں سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنی تصویریں بھی دوسروں کو بھیجتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی تصویریں بھی منگواتے تھے۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

مرزا نے غلام بابا خاں رئیس سورت سے ان کی تصویر منگوائی ہے۔ تصویر ملنے کے بعد سیاح کو لکھتے ہیں۔

"حال تصویر کا یہ کہ میں نے اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب (غلام بابا خاں) کو دیکھا۔ لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر دیدار تو میسر ہوا گفتار بھی اگر خدا نے چاہا سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب۔۔ حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے آگے پہنچے اور پنجہ کا پتا نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی" احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں: "تصویر مہر منیر پہنچی۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نے رسید لکھ بھیجی" شیو نرائن کو لکھتے ہیں: "تصویر پہنچی"

---

۱ اردوے، ۱۱۹، خطوط ۲۳۶

۲ خطوط: ۴۰۵

۳ اردوے: ۱۱

۴ اردوے: ۱۰۰

۵ اردوے: ۲۸۳

اسی طرح حاتم علی مہر کی تصویر ملنے کے بعد جو خط انھوں نے لکھا ہے[۱] اس کا شمار ان کے بہترین خطوں میں ہو سکتا ہے۔"

ان کے خطوں سے اس زمانے کے مصوّروں کے متعلق بھی کچھ معلومات مل جاتے ہیں۔

شیونرائن نے بہادر شاہ کی تصویر منگوا بھیجی ہے انھیں لکھتے ہیں: "بادشاہ کی تصویر کی صورت یہ ہے کہ اجڑا ہوا شہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ہاں ایک دو مصوّروں کی آبادی کا حکم ہو گیا ہے۔ وہ رہتے ہیں سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں تصویریں بھی ان کے گھروں میں سے لٹ گئیں جو کچھ رہیں وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کرلیں۔ ایک مصوّر کے پاس ایک تصویر ہے۔ وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے اور پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو، اتنا صرف بے جا کیا ضرورت ہے؛ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے۔ اگر کہیں سے ہاتھ آجائے گی تو لے کر تم کو بھیجدوں گا۔ مصوّروں سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور نہ تمھارا نقصان منظور[۲]۔"

یہ اکتوبر ۱۸۵۸ء کی بات ہے سئی انقلاب کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ مصوّروں کا دہلی میں فقدان تھا۔ لیکن ۱۸۶۲ء تک اچھے خاصے مصوّر آباد ہو چکے تھے اور بعضوں سے مرزا کی دوستی بھی تھی ان کے رقعات میں کئی مصوّر دوستوں کا ذکر ملتا ہے[۳]۔ ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز مصوّروں کی دوکانیں دہلی میں ۱۸۶۰ء میں موجود تھیں[۴]۔ وہاں فوٹو گرافر بھی موجود تھے اور مصوّر بھی۔ مصوّر کاغذ پر بھی تصویریں بناتے تھے اور ہاتھی دانت پر بھی[۵]۔ اور آئینہ پر بھی نقشا اتروانے کا رواج تھا[۶]۔

۱۔ اردوئے: ۱۸۹، خطوط ۱: ۳۱۲

۲۔ اردوئے ۲۶۵ خطوط: ۳۱۲

۳۔ اردوئے: ۱۵۰۹، ۱۸۰

۴۔ اردوئے ۱۵

۵۔ اردوئے: ۲۶۵

۶۔ اردوئے: ۲۵

ہمیں کم ازکم ایک مصوّر کا علم ہے جس سے غالب اپنا کام کرایا کرتے تھے۔ محمد افضل۔ ان سے تصویریں بنواتے تھے اور اپنی کتابوں کے سرورق کی تزئین اور قصیدوں کے بیل بوٹے بنانے کا کام بھی لیا کرتے تھے. محمد افضل کا ذکر ان کے خطوط میں متعدد بار آیا ہے: "میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویریں کھینچیں اور تم انتظار نہ۔" "وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انہوں نے واپس کر دی۔" "میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں جلدی نہ کرو۔" یوسف مرزا کو لکھتے ہیں: "دو مہینے رات دن خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ ۶۴ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دے دیا، وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔"[1]

مرزا کی تاریخی تصنیف "مہر نیم روز" جو فتح الملک ولی عہد بہادر کے حسب الحکم فخر المطابع میں شائع ہوئی تھی اس کا سرورق، بیل بوٹے، اور نقش و نگار "محمد خدا بخش" مصوّر نے بنائے تھے.

محمد افضل مصوّر، دہلی کے مشہور مصوّروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود اپنے زمانے کے ممتاز مصوّر تھے. غالب کے عزیزوں میں خواجہ امان اور خواجہ قمر الدین خاں انہیں کے تربیت یافتگان میں سے تھے۔

تاریخ تحریر: ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء

نظر ثانی: ۱۵ر مئی ۱۹۵۲ء

---

[1] خطوط: ۱۶۴

قاضی عبدالودود

ہرمزدثم عبدالصّمد

تمہید: غالب نے عبدالصّمد کو اپنے وقت کا "جاماسپ"[1]، اور "بزرجمہر"[2] کہا ہے اور اسے "پشتین ساساں"[3] کا لقب دینے سے باز رہے ہیں تو صرف[4] اس لیے کہ وہ تنہا "رازداں" تھا اتنا "رازگو" نہ تھا۔ غالب نے اسے منطق و فلسفہ میں[5] مولوی فضل حق کا نظیر، عربی کا فاضل[6] متبحر، اور فارسی کا "مالک[7] زبان" بتایا ہے، اور جابجا اس سے اپنی فیض یابی کا ذکر بڑے فخر و ناز سے کیا ہے:

(۱) وایں... فرماں آموزگارست... و من آیینِ[8] معنی آفرینی و کیشِ یگانہ بینی از وے فراگرفتہ ام... بر روان وے آباد...

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم[9] — سیرابیٔ نطقم اثرِ فیضِ حکیمست (د ۱۳۱ و ۱۴۱)

قاطع: قاطع برہان۔ برہاں: برہان قاطع، نسخۂ مطبوعہ ۱۲۶۴ھ کے صفحات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اد: درفش کاویانی: قاطع کی اشاعت ثانی۔ (د: دکی جگہ (د) اگر کوئی عبارت صرف د میں ہے قاطع کی اشاعت ثانی میں نہیں۔ محرق: محرق قاطع برہان طبع ۱۲۸۰ھ۔ ل: لطائف غیبی طبع ۱۲۸۱ھ، رد محرق مصنفۂ غالب مگر منسوب بہ سیاح (حوالہ صفحوں کا نہیں لطیفوں کا دیا گیا ہے)۔ موید: موید برہان طبع ۱۲۸۲ھ۔ تیغ: تیغ تیز از غالب رد موید۔ قطع: قاطع القاطع۔ رد قاطع طبع ۱۲۸۳ھ اس کتاب کا جواب غالب نے نہیں دیا۔ ا،م: اردوئے معلیٰ طبع لاہور ۱۹۲۲ء ۲۴

(۲) "لطائف فارسی بحث غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے، سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ حقیقت اس زبان کی... خاطر نشان ہو گئی" ض

(۳) "وہ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے۔" مکاتیب غالب اشاعت ثانی ص۴

(۱) غالب نے عبدالصمد کے جو حالات لکھے ہیں، وہ کچھ زیادہ نہیں: اصلی نام ہرمزد تھا اور سلسلۂ نسب[۱۱] ساسان پنجم تک پہنچتا تھا۔ اس کا وطن[۱۲] یزد تھا اور وہاں کے "جلیل القدر[۱۳]" امیر زادوں میں شمار ہوتا تھا۔ "علمائے عرب[۱۴] و بغداد" سے "پچاس برس" علوم عربیہ تحصیل کرنے کے بعد زردشتی مذہب ترک[۱۵] کر کے مسلمان ہو گیا تھا۔ اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد[۱۶] رکھا تھا۔ یہ "مومن موحد صوفی صافی[۱۷]" بہ طریق سیاحت ۱۲۲۶ھ[۱۸] میں آگرہ پہنچا اور دو سال وہاں غالب کے گھر[۱۹] میں مہمان رہا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ آگرہ کہاں سے آیا تھا اور وہاں سے اس کا کہاں جانا ہوا۔ غالب کے قیام دہلی کے بعد تک اس سے مراسلت رہی، اور وہ کبھی کبھی اپنے خط میں اپنا نام عبدالصمد کی جگہ "ارزند بندہ[۱۶]" بھی لکھا کرتا تھا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۲۲۶ھ میں اس کی کیا عمر تھی۔ لیکن جس شخص نے ۵۰ برس علمائے عرب و بغداد سے تحصیل علم کی ہو، وہ اس وقت ۶۵ برس سے کم کا ہو، یہ قرین قیاس نہیں۔ زمانۂ وفات کی تعیین غالب نے نہیں کی۔ لیکن قاطع وغیرہ میں جو الفاظ اس کے لیے استعمال کیے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ قاطع کی تصنیف سے پہلے ہی وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔ عبدالصمد سے استفادہ کے بہ بانگ دہل اعلان کے باوجود، غالب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "مجھ کو مبدء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔"

---

۴۹ (حاشیہ صفحہ گزشتہ سے) ض: غالب کا ایک طویل خط بنام ضیاء الدین جس کا عکس ع میں شائع ہوا ہے۔ عود: عود ہندی انوار المطابع الٰہ آباد۔ غ: علی گڑھ میگزین کا غالب نمبر ۱۹۴۹ء۔ ر: غالب کی راست گفتاری از راقم علی گڑھ میگزین ۱۹۴۸ء۔ ح: غالب بہ حیثیت محقق از راقم۔ جہاں: فرہنگ جہاں گیری مطبوعہ۔ ی: یادگار غالب طبع لکھنو۔

اور ۲ ض۔ بزرجمہر چاہیے۔ جیم فارسی سے بالکل غلط ا: غالب نے اسی سے لکھا ہے۔ ۳ دا عبارت مفصل ۴ میں ملے گی ۴ ض ۵ و ۶ تیغ صفحہ ۱۲، ۱۴۱ ۷ معنی آفرینی۔ شاعری۔ عود کی عبارت جس میں استاد سے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے " ی ص۱۴

(۲) عبدالصمد سے متعلق غالب کے بیانات میں تضاد ہے، لیکن فی الحال اسے نظر انداز کر کے، یہ دیکھنا ہے کہ "فارسی ناشمت" کے وہ "لطائف" اور "فارسی آمیختہ بہ عربی" کے وہ "غوامض" جو اس کے حوالے سے غالب نے پیش کیے ہیں کس پائے کے ہیں:

(۱) فارسی میں دو حرف "متحد المخرج" بلکہ "قریب المخرج" موجود نہیں، س ہے ث و ص نہیں، ت ہے ط نہیں، الف ہے ع نہیں، غ ہے ق نہیں، ز ہے ض اور ظ نہیں، اس صورت میں یہ کیوں کر روا رکھا جا سکتا ہے کہ "دو حرف متحد المخرج" ذ اور ز فارسی میں موجود ہوں؟ ذ جو فارسی میں ملتی ہے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے:

"دبیران پارس را قاعدہ چناں بود کہ بر سر دال ابجد نقطہ نہادندے پیشینیان ازیں رسم الخط بہ وجود ذال منقوط در گماں افتادند۔ چوں دریں اندیشہ وجود دال بے نقطہ از میاں می رفت وہمہ ذال منقوط می ماند، اکابر عرب قاعدہ قرار دادند، و تفرقہ دال و ذال برآں قاعدہ نہادند" دص۱۳

غالب کو اس توجیہ پر بڑا ناز تھا، مگر یہی بات کسی قدر اختلاف کے ساتھ جہاں میں موجود ہے

(بقیہ گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) اشتق کا ذکر ہے فصل ۳ میں ہے ۵ یگانہ بینی: توحید وجودی" و دیگر از ہیں انبوہ پارسیان یگانہ بینانند کہ ذات ایشاں را ہمتائی خوانند۔ نزد ایشاں جہاں را در خارج وجودے نیست، ہرچہ ہست ایزد ذات و رائے او چیزے نہ" دبستان مذاہب ص۵۔ ۹ کلیات نظم فارسی ص۳۷۶ غزل کا شعر ہے۔

۱۰ دص۱۳ ال ۱۵۔ ۱۱ ال ۱۵۔ د میں ہے "پارسی نژاد فرزانہ بود از تخمہ ساسانیان" ص۱۳۔ ۱۲ ال ۱۵ ۱۳ و ۱۴ ال ۱۵ دص۱۳ ال ۱۵۔ ۱۶ " و خود را عبدالصمد نامیدہ" دص۱۳، مگر حالی کہتے ہیں کہ عبدالصمد نام رکھا گیا۔ ی ص۱۴۔ ۱۷ اض ۱۹ و ۱۹ دص۱۳ " و باکبرآباد۔ دو سال بکلبہ احزان من آسودہ است" مگر حالی لکھتے ہیں "دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرہ میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔

ی ص۱۴ حالی نے یہ نہیں بتایا کہ عبدالصمد کے قیام دہلی کا حال انھیں کس طرح معلوم ہوا؟ دص۲ کل باتیں جو غالب نے عبدالصمد کے حوالے سے لکھی ہیں نقل کر دی گئی ہیں لیکن بعض امور سے متعلق اظہار رائے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے ۲۲ ہندوستانی ز اور ض میں فرق نہ کرتے ہوں۔ لیکن سعدی کے ایک شعر سے جس میں فصل کا باقی اگلے صفحہ پر

غالب نے کمال یہ کیا کہ صاحب مؤید نے جہاں کی عبارت نقل کی، تو باوجود اس کے کہ کتاب کا حوالہ صراحتہً موجود تھا انھوں نے صاحب مؤید پر[۲۱] یہ الزام لگایا کہ انھوں نے مجھ سے سرقہ کیا ہے۔

"حضرات کو میں اس امر خاص میں بہت تکلیف دوں گا۔ اور داد طلبی میں اصرار وابرام کروں گا۔ فرہنگہائے پیشین میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھا دے تو میں گنہ گار ورنہ مولوی اٹھائی گیرا۔ یہ راز مجھ سے شت ہرمزد ثم مولانا واولانا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمتہ نے کہا ہے، دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا تھا ایسی نئی بات کو چرانا اور اپنا قول بنانا چوری اور سرزوری خیرہ رائی اور بے حیائی ہے یا نہیں؟۔۔ اے اہل عقل کوئی تو بولو خدا لگی"۔ تیغ ص۲۱

فارسی میں "دو قریب المخرج" حروف کے وجود کا انکار بدیہیات کا انکار ہے۔ ب پ وف قریب المخرج ہیں، اسی طرح را ور ل، دا ور ت وغیرہ طرہ یہ کہ غالب نے خود قاطع میں دوسری جگہ اس کا اقرار کیا ہے کہ فارسی میں قریب المخرج حروف ہیں۔ غالب رستاد (ایک فارسی لفظ) کی بحث میں لکھتے ہیں: "چوں در دو حرف قریب المخرج بہ افگندن احد المتجانسین رسم ست" دھ" ذ کا صحیح تلفظ جن لوگوں کو معلوم ہے وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذ اور ز متحد المخرج ہیں۔ فارسی میں وجود ذ کی جو وجہ غالب نے لکھی ہے وہ جہان میں موجود ہے لیکن یہ کتاب ہندوستان میں عہد جہانگیری میں تمام ہوئی ہے اور زمانۂ قدیم کے بارے میں اس کے وہ بیانات جن کی سند اس میں نہیں لازماً قابل قبول نہیں، پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے فارسی مخطوطات موجود ہیں، مگر ان سے غالب اور صاحب جہاں کے اس دعوے کی کہ کاتب دال بھی ذال کی طرح لکھا کرتے تھے، تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ بات کہ د و ذ میں فرق کرنے کے لیے اکابر عرب نے کوئی قاعدہ بنایا تھا جہاں میں نہیں اور کسی طرح قرین قیاس بھی نہیں سمجھی جاسکتی۔ عربی میں ایک[۲۲] مختصر سی نظم اس کے متعلق البتہ ہے،

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ سے) تا قافیہ عدل آیا ہے، ایران کے متعلق جو نتیجہ نکلتا ہے واضح ہے

۲۱ تفاصیل رص ۴۰ و ۴۱ غالب کو ان مخطوطات کا ذکر کرنا تھا جن میں د و ذ میں فرق نہیں۔

۲۲ تاریخ گزیدہ میں یہ نظم بہ نام ظہیر فاریابی اور فرہنگ شعوری (فارسی ترکی جلد اطبع قسطنطنیہ) میں بھی یہی ہے، مگر حاشیۂ القاموس المحیط (طبع قاہرہ) میں بہ نام ابونصر فارابی۔ حلل مطرز در فن معما ولغز مصنفہ شرف الدین علی یزدی مورخ مشہور (نسخۂ سید محفوظ الحق مرحوم) میں یہ نظم موجود ہے مگر مصنف کا نام نہیں دیا۔ کلیات ظہیر کی تینوں مطبوعہ اشاعتیں اور متعدد قلمی نسخے جو میری نظر سے گذرے ہیں، اس سے خالی ہیں۔

مگر یہ کسی عرب کی طرف منسوب نہیں۔ قدیم ترین فارسی کتاب جس میں یہ قاعدہ ملتا ہے۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے[23]

"بدانک در صحیح لغت دری ماقبل دال مہملہ الآراء ساکن چنانک درد و مرد یا زا ساکن چنانک دزد و مزد یا نون ساکن چنانک کمند دگر ند نباشد و ہر دال کہ ماقبل آں یکے از حروف مد ولین است، چنانک باذ و شاذ و سوذ و شوذ و دیذ و کلیذ یا یکے از حروف صحیح متحرکست چنانک تمذ و بغذ و ذ و ہمہ ذال معجمہ اند۔ و در زبان اہل غزنین و بلخ و ماوراء النہر ذال معجمہ نیست و جملہ دالات مہملہ د ز لفظ آرند" صـ ۱۹۲

نصیر الدین طوسی، ابن یمین[24] وغیرہ کی طرف بھی ایسی نظمیں منسوب ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن فارسی لفظوں میں ذال لکھنا چاہیے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود غالب کے اس بیان سے کہ دو ذ میں تمیز کے لیے قاعدہ بنایا گیا تھا، یہ ثابت ہے کہ فارسی میں ذ تھی۔ نہ ہوتی تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوتا کہ یہ حرف فارسی میں نہیں۔ حقیقت حال فاضل بزرگ، محمد بن عبدالوہاب قزوینی مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے۔

---

۲۳ المعجم اوائل ماہ ہفتم میں لکھی گئی ہے۔ حسین بن ابراہیم نطنزی (متوفی ۴۹۹ھ) نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ، ورق ۵۵۱ میں یہ عبارت ہے۔" والحروف لاتدخل الفارسیۃ ثمانیۃ یجمعہا: صح حط "ظ قض" اس سے صاف ظاہر ہے کہ نطنزی کے نزدیک ذال فارسی حروف میں ہے۔ غ میں جو ذال کی بحث ہے وہ بھی دیکھی جائے۔

۲۴ ابن یمین کا ایک قطعہ جو اس کے کلیات سے ماخوذ ہے" فرہنگ غالب" نوشتہ راقم غ، صـ ۲۵۵ میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ جن الفاظ کو غالب ذ کی جگہ ز سے لکھنا چاہتے ہیں، ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب ایران میں ذ سے لکھے جاتے ہیں، اور انھیں کسی زمانے میں ز سے لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے جو آرزو پر ایک بسیط محققانہ مقالہ کے مصنف ہیں، مجھے لکھا تھا کہ آرزو نے بھی آخری عمر میں وہی رائے ظاہر کی تھی جو غالب کی ہے۔ اس صورت میں غالب کے ہم نوا اور بھی ہیں، لیکن سوال ایران کا ہے ہندوستان کا نہیں۔ اس بات سے کہ تسلط اسلام سے پہلے ایران میں کوئی حرف ایسا تھا یا نہیں جس کی آواز ذال کی ہو کبھی اور بحث کی جائے گی

"در بلاد زبان فارسی باستثنائے بعضے نواحی تا قرن ششم و ہفتم بل ہشتم ہجری مابین دال و ذال فارسی تمیز می دادہ و فرق می گذاشتہ اند، ہم در تلفظ ظاہراً و ہم در کتابت قطعاً۔ در اغلب نسخ فارسی کہ اکنوں بدست است، و قبل از قرن ہشتم استنساخ شدہ است، ذالہائے فارسی عموماً بانقطہ مسطور است۔

ولے از حدود قرن ہشتم ببعد بجہات نامعلوم بتدریج ایں تمیز از میانہ برداشتہ شد، و ذالہائے معجمہ متدرجاً بہ دالہائے مہملہ مبدل شد۔ و اکنوں در ایران جمیع ذالہائے فارسی را دال مہملہ خوانند و نویسند، باستثنائے قلیلے از کلمات چوں گذشتن و گذاشتن و پذیرفتن و آذر و آذربایجان وغیرہا"
(مقدمہ تاریخ جہانگشائے حاشیہ صفحہ فح)

(۲) "عبد الصمد گاہ گاہ در مکاتبات خود را اروند بندہ نوشتے۔ چوں پژوہش رفت فرمود کہ اروند بندہ مضاف و مضاف الیہ مقلوب است۔ یعنی بندہ اروند، بندہ ترجمہ عبد و اروند ترجمہ صمد و نیز می فرمود کہ چوں طبائع لطیف استعارہ را دوست دارد۔ اروند را کہ اسم کوہ است، بمعنی تمکین و وقار و شان و شوکت نیز آرند" (ص۱۵) صمد کے کیا معنی غالب کے نزدیک ہیں۔ اس کے لیے فصل آخر دیکھی جائے دنیا میں عبد الصمد کے سوا کسی نے اروند و صمد کو ہم معنی نہیں کہا (برائے تفاصیل ح فصل ۲) یہ قول بھی محتاج ثبوت ہے کہ اروند پہلے کسی پہاڑ کا نام تھا۔ بعد کو مجازاً تمکین و وقار وغیرہ کے معنی میں مستعمل ہوا۔

(۳) "اورمزد و ارمزد و ہرمزد ہر چہار لفظ بزائے ہوز اسم مشترک است۔ و اسفندارمزد و اسفندارمز ہم نام ماہ ہست و ہم نام روز و ہم نام سروش و ایں افادہ نیز از فیض نفزیہ مولانا عبد الصمد است علیہ الرحمۃ" (ص۱۰۱)

اورمزد وغیرہ کے جو معنی غالب نے دیے ہیں، برہان میں بھی ہیں، اس لیے عبد الصمد کی ان سے واقفیت اس کے لیے مایۂ نازش نہیں ہو سکتی۔ ظاہراً غالب کا یہ خیال ہے کہ 'مز' اور 'مزد' ان تمام الفاظ میں ایک ہے، مگر حقیقت اس کے خلاف ہے اورمزد و ہرمزد وغیرہ ز سے ہیں۔ لیکن اسفندارمز اور اسفندارمزد صحیح املا نہیں، ز کی جگہ ذ چاہیے۔ قدیم ایرانی زبانوں میں ان کی جو شکلیں ہیں وہ ہرگز ز کی موید نہیں، متداول فرہنگوں میں بھی خواہ وہ ایران میں لکھی گئی ہوں، خواہ ہندوستان میں یہ الفاظ ذ ہی سے ہیں، گو اس کا امکان ہے کہ غلطی سے کسی ایرانی نے ان میں سے کسی کو ز سے لکھ دیا ہو۔

(۴) "از استاد شنیده ام که گُند چنانکه معنی قوت جسمانی دہد، افادۂ معنی قوتِ عقلی و علمی نیز کند. ازینجاست کہ مردِ دانشمند را گُند اگویند" (ص ۱۳۵)

(۵) پوشتن و پشتن .. مصدریست پارسی الاصل (کذا) و مضارع نیز دو صورت دارد۔ پوزد و پژد. ہر آئینہ مصدر و مضارع نیز دو گونہ می تواں ساخت پوزیدن و پزیدن۔ اما معنی ایں ہر چہار دعا خواندن و بر آب و شربت دمیدنست، و ایں چنیں را در فارسی دُرود بہ دال مضموم و واو معروف و چیزیکہ درود بر آں دمیدہ باشد پوشتہ و پشتہ و پوزدہ و پزدہ گویند و پوزش و پزش حاصل بالمصدر پوزیدن و پزدن است کہ مجازاً بمعنی عذر و استغفار آید۔ اکنوں در دبستان مذاہب می نگریم کہ پشتن و پشتہ بہ تحتانی نوشتہ اند۔ حاشا کہ رقم سنج دبستان مذاہب کہ گرانمایہ ایست بغوامض دین زردشتیاں و دقائق نطق پارسیاں دریں منطق خطا کندو۔ بیلے خطی ز بید۔ اتفاق کارداں کارداں کا تبالنت بر غلط نوشتن۔ نگرندگان مشاہدہ را شاہد گرفتند، و ہم بریں جادہ رفتند، و اگر فرزانۂ فرزبود آئیں عبد الصمد راہ نمودے نامہ نگار نیز یکے از نگرندگاں بودے، نہ خود راہ راست پیمودے و نہ دیگراں را آگہی افزودے" (ص ۱۴۲)

پوشتن و پشتن فارسی مصادر نہیں۔ پشتن پہلوی میں "بمعنی ستودن و عبادت کردن و فدیہ آوردن" ہے (مقدمۂ یشتہا جلد اص ۱۱ از آقائے پور داؤد) کسی زردشتی کا اسے یشتن کہنا ویسا ہی ہے جیسے ایران کے کسی مسلمان کا نماز کو پماز اور روزہ کو پوزہ کہنا۔ پوزیدن فارسی مصدر ہے، مگر اس کے معنی یشتن سے مختلف ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ سروکار نہیں رکھتے (مزید تفاصیل کے لیے مع فصل)، کمال یہ ہے کہ غالب یہ بھی نہیں کہتے کہ دبستان مذاہب کے کس نسخے میں پشتن اور پشتہ مجھے ہے سے ملا ہے، وہ خود معترف ہیں کہ کاتبوں کا اتفاق ی سے لکھنے پر ہے۔ جس طرح دن اور تن علامت مصدر ہیں یدن بھی ہے۔ ایک ریشے سے دو مصدر ایک دن یا تن کے ساتھ اور دوسرا یدن کے ساتھ آتے ہیں۔ یا نہیں اس کا انحصار سماعت پر ہے۔ اگر پوزیدن ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ پوشتن لازما ہونا چاہیے (یہ بات غالب نے ل میں کہی ہے)، ٹھیک اسی طرح جیسے رسندن کے وجود سے سندن کی ہستی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں بہ یک وقت آوردن اور آوریدن تپیدن اور تپیدن، مردن، گستہ دن اور گستیدن وغیرہ کا ہونا اس کا مجاز نہیں کرتا کہ ہر مصدر کے امر پر یدن کا اضافہ کیا جائے۔

وردوں کے متعلق غالب کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ اس اختلاف کے ساتھ جو پشتن کو بائے فارسی سے پڑھنے سے پیدا ہو جاتا ہے'...... برہان میں بھی ہے (ص۳۲۴) لیکن وردوں بہ ضمۂ دہ نہیں، بہ فتحۂ دہ ہے (دہلوی پازند انگریزی فرہنگ (ص۱۴۲) وردوں کے معنے دیباچۂ یسنا میں یہ دیے ہیں۔ " ورپہلوی دروں ۔۔ عبارتست از نان کوچک گرد بدوں خمیر مایہ کہ بسروش نذر می شود۔ ایں نان مقدس فقط علامتے است واشارہ است بہ نذر وخیرات" (ص۲۹)

(۲) "چوں تازیاں بر پارسیاں چیرہ دست آمدند۔ بسیارے بصدق دل مسلمان شدند، برخے آشکارا اسلام گزیدند و نہانی ہم بر آں جادہ پے سپر ماندند آں گرہان اہرمن دوست ہر گونہ دقائق وحقائق کہ از اسلامیاں شنودند بہ کنج نشستند و بہ اتفاق منافقان دگر از بہر ہر مسمّٰی اسمے تراشیدند وچنیں وانمودند کہ زردشت بطریق پیش گوئی چنیں فرمودہ است آنچہ از معجزات در زمرۂ مسلمین شہرت یافت ہمہ بر زردشت بستند و برائے وے عروجے مانا بہ معراج مخبر صادق نشاں دادند وگذشتن از افلاک رسیدن بہ فرگاہ دادار پاک وشنیدن سخن از غیب ودیدن بہشت ودوزخ ہمہ را در دامنش ریختند وکراسے دینے بہ معنی مصحف مجید دسنیاد ۔ بمعنی سورہ وچینود بہ اعراب مجہولہ بمعنی پل صراط نتیجۂ لفظ آفرینی ایں گروہ است۔ عبد الصمد ایں راز با من می گفت و بر فریب[25] و نیرنگ پارسیاں می خندید و نگارندۂ دبستان مذاہب را یکے از ایشاں میدانست۔ از سورہ سورہ بودن ژندو سنیاد بودن نام سورہ در اصل ووجود داشتن پل صراط در کیش زردشت اباء کرد و ایں اخبار وایں اسمارا بہم بافتہ شوریدہ مغزان پارس وانمود

---

۲۵ " فریب و نیرنگ پارسیاں" پر غالب یا عبد الصمد کو ہنسنے کا حق حاصل نہیں۔ غالب عمر بھر دساتیر کی اصلیت کے قائل رہے اور اس کے مصنوعی الفاظ کو جن کا ایران کی کسی زبان سے کچھ تعلق نہیں فخریہ استعمال کرتے رہے۔ ساسان پنجم بھی جس سے غالب عبد الصمد کا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں، ایک خیالی ہستی ہے۔ ساسان پنجم کا جو نسب نامہ دبستان مذاہب میں ہے، دساتیر کے مطابق ہے لیکن کسی طرح باور کرنے کے قابل نہیں۔ ساسان پنجم خسرو پرویز نبیرۂ نوشیرواں کا ہم عصر ہے، دارا کو جو سکندر سے مغلوب ہوا اس کا جدّ سومی لکھا ہے۔ حالانکہ پرویز اور دارا کے درمیان ۸۰۰ برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے

وی فرمود کہ بزبان دری در نثر بجائے باب لفظ۔ در در مجلّی فصل سنک آرند و فصل را برباب مقدم دارند و ہر سنک یعنی ہر فصل بر بابے چند یعنی درے چند مشتمل باشد چنانکہ مجموعہ ثر تد بیست ویک نسک دارد و صد در۔ ہمانا نسک را نخش می تواں گفت. وابواب و فصول مروجہ حال را در تقدیم و تاخیر بداں فصول و ابواب مطابق نتواں اندیشید چوں از نظم پرسش بمیاں آمد گفت کہ در نظم قافیہ راپوند گویند و ردیف را لسپاوند وغزل راچامہ وغزل دراز راچکامہ اما اوزان و بحور درمیان پارسیاں نبود۔ زمزمۂ ایں گروہ بہ اشعار ہندیاں می مانست کہ فقرہ فقرہ الفاظ متحد الآخر[۲۶] فراہم آرند و در وزن برابر نباشد۔ اوزان و بحور از متخرجات طبع عالیہ اہل عرب است. گفتم ابتدائے بروزنہ کلمۂ موزوں از زبان بہرام گوراست. گفت چنیں خواہد بود بہرام در عراق و عرب نشوونما یافتہ است، در شکار گاہ وقت زدن صید یا بردن گوئے از راہ نشاط زمزمۂ سرودہ باشد۔ علمائے آں سرزمین بنظر ہائے دقیق و فکر ہائے ژرف قانو نہا وضع کردند و قاعدہ ہا نہادند و ایں اساس را چناں کہ اکنوں در عرب و عجم شائعت استواری دادند۔ نہ بینی کہ مطالب و در بالیستہائے ایں فن فرخ را در پارسی زبان نامے نیست " د ص۱۳۲ و ۱۳۳ دانش آموز درخشاں تر از روز فرزانہ ہرمزد نام عبدالصمد میفرمود کہ ہر صحیفہ کہ بر وخشوران پارس از آسماں فرود آمدہ است در آسمانی زبانست کہ آنرا فرابتین نواد گویند۔ آرش آں واژہ ہائے وتیرہ وآں سخنہائے پاکیزہ پیمبراں را بہ میانجی سروش از فرگاہ داد ارپاک بردل فرومیریزد وایں روشن گہراں آنرا دلنشیں پیرو وخشوراں میکنند تا آں رازہائے سترگ را در زبان قوم بہ بند نگارش درآورند، چنانکہ پاکخواں ژند کہ بہ پاژند مشہور است، ہم چنیں بہمیر از دساتیر کہ ساسان پنجم بزبان دری نگاشتہ است۔ از جانب من پژدہش رفت کہ دردل چناں فرود می آید کہ ژند و دساتیر را زباں یکے خواہد بود۔ گفت آرے۔ گفتم از ژند و پاژند درگیتی نشان ماندہ باشد. گفت نماندہ است مگر تکے چند از پاژند. گفتم مگر ہنجار نگارش پاژند و عبارت ساسان پنجم یکیست. گفت البتہ۔ اکنوں غالب ہیچداں میپرسد کہ ایں فرہنگ نگاراں لغتے چند و مصدرے چند می آرند و مآخذ آں لغات و مصادر چناں وا می نمایند کہ ژنداست. ژند کجاست کہ لغات و مصادر ازاں بدر تواں کشید واگر ہست ناشناساز بانیست کہ بہ دری

---

۲۶ تعجب ہے کہ غالب نے دوہرے اور چوپائیاں بھی نہیں دیکھیں جن کے آخر میں توافی ہوتے ہیں۔

وپہلوی وپارسی نماند" د ص۱۳۸

(الف) منافقین ایران کی جس منظّم کوشش کا غالبؔ نے ذکر کیا ہے وہ محتاج ثبوت ہے۔

" بہ اتفاق منافقان دگر" کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ ایرانیوں کے علاوہ اور قوموں کے منافق بھی اس کوشش میں شریک تھے، اس دعوے کی بھی کوئی سند موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ غالب کا بیان دبستانِ مذاہب کی عبارتِ ذیل پر مبنی ہے جو سمرادیوں سے متعلق ہے۔

" واثیاں اکنوں با مسلماناں درآمیختہ اند در لباس مومناں گردند و بر مذہب اثیاں کامگار نامی، زپارسیہ (کذا) ایں گروہ کہ در عہد محمود رسالۂ منظومہ نوشتہ۔ وایں کیش را بر دیگر آئینہا ترجیح دادہ بایں وجہ کہ سراسر ارباب ادیان از عقائد خود آنچہ ذکر کردہ اند از وجود خدائے۔ وبہشت ودوزخ صراط وحشر ونشر وسوال وجواب.. ہمہ در کیش درست بود" ص"

کامگار کی کتاب کا حال مجھے معلوم نہیں، اور یقین نہیں کہ لکھی بھی گئی ہو۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ تسلط اسلام کے بعد زردشتیوں نے ایسی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں اسلام پر اپنے عقائد کی فوقیت دکھائی ہے اور اسلام و زردشتیت میں خواہ مخواہ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زردشت کی کوئی پیش گوئی اسلام سے متعلق موجود نہیں۔ زردشت کا نبی ہونا ایک ایسا عقیدہ نہیں۔ جو ایران میں اسلام کے استیلا کا نتیجہ ہو۔ کسی خاص معجزے کا کسی نبی سے سرزد ہونا یا نہ ہونا اس کے صادق یا کاذب ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ نبی کے لیے غیب کی آواز سننا کوئی بڑی بات نہیں، معراج زردشت کا عقیدہ بھی قدیم سے چلا آرہا ہے اور کم از کم غالب کو جو دساتیر کی اصلیت کے قائل ہیں یہ کہنے کا حق نہیں کہ مسلمانوں سے لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ معراج زردشت کا ذکر دساتیر میں ہے (تفاصیل ع)

(ب) کراسہ عربی لفظ ہے۔ قاموس جلد ۲ ص۲۴۶ میں ہے: " الکراستہ جزء من الصحیفۃ" پتے بہ معنی قرآن متحدث سہی لیکن لفظ پرانا اور ثبتن سے منسوخ ہے۔ اکابر شعرائے ایران نے اسے استعمال کیا

" نرم دار آواز بہ رایشاں چو انساں زانکہ حق ۔۔۔ انکر الاصوات خواند اندرپئے صوت الحمیر (سنائی)[۲۷]

۲۷ یہ دونوں شعر جہاں میں ہیں اور پہلا کلیات سنائی مطبوعۂ بمبئی میں موجود ہے، دوسرا بظاہر مثنوی رومی کا ہے، لیکن میں نے ابھی مثنوی میں اسے تلاش نہیں کیا۔ یہ لفظ ب اور د سے بھی لکھا جاتا ہے۔

"ضعیفاں را تو بے خصمی مددان — از پئے اذا جار نصر اللہ بخواں" (رومی)

(ج) ظاہراً غالب یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ لفظ سورہ قرآن کے لیے مخصوص ہے، یہ صحیح نہیں، ادیب صابر کا شعر ہے:

"بہ سورہ سورۂ توریت و سطر سطر زبور — بہ آیہ آیۂ انجیل و حرف حرف نوی"

اس سے قطع نظر، بیمناد بہ معنی سورہ دساتیر میں آیا ہے جس کی قدامت کے غالب قائل ہیں۔

(د) چینود[۲۸] گاتھا میں آیا ہے اور اس کی قدامت تمام محققین مشرق و مغرب کے نزدیک مسلم ہے۔ پل صراط کا خیال زردشتیوں نے مسلمانوں سے نہیں لیا مسلمانوں نے زردشتیوں سے لیا ہے چینود ان الفاظ میں نہیں، جن کی حرکات و سکنات نامعلوم ہوں۔ اس لیے کہ یہ اوستائی لفظ ہے اور اوستائی رسم خط ایسا ہے کہ کسی لفظ کی حرکات و سکنات کے متعلق شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ غالب نے ل (۱۱) میں اس سے صریحاً انکار کیا ہے کہ عبدالصمد نے انھیں چینود کے بارے میں کوئی بات بتائی تھی: "بھلا اتنا تو سمجھے ہوتے کہ استاد شاگرد کو لفظ بتائے اور اعراب چھپا رکھے:" حالاں کہ قاطع[ص۱۲۲] میں اس کی نسبت جو کچھ ہے عبدالصمد ہی کے حوالے سے ہے۔

(ہ) نسک اور درکے متعلق جو کچھ غالب نے لکھا ہے، کس حد تک صحیح ہے اس کا اندازہ مع فصل ا سے ہو سکتا ہے۔

(و) ایران شناسوں کے مسلمات سے ہے کہ گاتھا منظوم ہے اور یہی حال یشت کے کچھ اجزا کا ہے۔ کچھ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ پہلوی میں کلام منظوم موجود ہے۔ گاتھا اور یشت کی نظم اس طور کی نہیں جو غالب کے قول کے مطابق ہندی نظموں کی ہے۔

(ح) بہرام گور کا شعر کہنا بہت سی کتابوں میں درج ہے لیکن ان میں ایک بھی اتنی قدیم نہیں کہ تشفی بخش ثبوت سمجھی جا سکے۔

(ط) بہرام نے واقعی عراق عرب میں نشو و نما پائی تھی۔ لیکن عربی عروض کی بنا وہاں پڑنے کی یہ وجہ

---

۲۸ چینود ایران کے بعض مستند اساتذہ کے کلام میں بھی آیا ہے۔ دسے ک تک جو مباحث ہیں ان کے لیے مع فصل ۱ و ۲ دیکھی جائے۔

نہیں. اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ خلیل واضع عروضِ عربی نے بہرام کے اصلی یا فرضی اشعار دیکھے تھے، یا عراق عرب کے شعرا نے عربی اشعار بہرام کے تتبع میں کہے۔

(ی) پرانے زمانے میں مختصر یا طویل غزل تھی کہاں جوان کے لیے جا مر وچگامر کی اصطلاحیں مستعمل تھیں؟ ردیف بھی خود غالب کے قول کے مطابق قدیم نہیں، اس لیے اس کے لیے بھی کوئی قدیم لفظ نہیں مل سکتا. رہا ان کا مستحدث ہونا، تو یہ غالب نے کہیں لکھا نہیں. اور اس بنا پر کہ انھوں نے صاحب برہان پر بڑی سختی سے اعتراض کیا ہے کہ وہ الفاظ کے مستحدث ہونے کا ذکر نہیں کرتا یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ الفاظ ان کے نزدیک معانی زیر بحث میں قدیم ہیں. پیوند و پساوند کے معانی کی نسبت قاطع برہان کی دونوں اشاعتوں میں کچھ اختلاف نہیں لیکن دستنبو کی کل اشاعتوں میں پیوند بہ معنی ردیف اور پساوند بہ معنی قافیہ ہے.

(ک) ساسان پنجم فرضی مترجم و مفسر دساتیر پیرہ دخشور (خلیفہ) نہیں، دخشور (پیمبر) ہے. عبدالصمد اوستا سے جو اصلی کتاب ہے، کسی قسم کی واقفیت کا اظہار نہیں کرتا. اوستا اور زند کے معتد بہ اجزا موجود ہیں. دساتیر اور زند کی زبان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے. پازند زند سے مختلف نہیں. فرق یہ ہے کہ زند پہلوی خط میں لکھی جاتی ہے اور ہزوارش اس میں موجود ہے، پازند اوستائی خط میں لکھی جاتی ہے اور ہزوارش سے خالی ہے. ترجمہ و تفسیر دساتیر کی زبان موجودہ فارسی ہے جس میں کچھ مصنوعی الفاظ شامل ہیں.

۳) اس فصل میں یہ دکھایا جائے گا کہ غالب کی زندگی میں ان کے مخالفین نے عبدالصمد کے متعلق کیا کہا اور غالب نے اسے دیکھ کر کیا کہا:

(۱) اکنوں راست راست دو اشگاف مینگارم کہ مرزا غالب دو سال در عمر سیزدہ سالگی و چہاردہ سالگی درمیوہ خوری و کلاہ زردوزی کج نہادن روبروے ہرمزد، گذرانیدہ باشد وسواے چند الفاظ پارسی غیر مشہورہ کہ وے ہمیں را داشتہ باشد نیاموختہ و اگر باور کنم کہ وی عالم و زباندان پازند بود تاہم بچہ سیزدہ سالہ و چہاردہ سالہ بجز خور و نوش بہ دیگر امور علم افزاے خرد ہوش کے می پردازد" محرق ص ۶۹

"اگر ہرمزد پیکر ہستی رانگذاشتے مثل آغا عبدالرشید خوشنویس کہ وے اشعار در حق خواجہ محمود نگاشتہ بود بوادی مرزا غالب ہمچنیں فرمودندے:

خواجہ محمود آنکہ یک چندے[۲۹] بود شاگردِ ایں فقیرِ حقیر
در حقِ او نرفتہ تقصیرے لیک او ہم نمی کند تقصیر
می نویسد ہر آنچہ از بد و نیک جملہ را می کند بنامِ فقیر"[۶۹]

مصنفِ محرق کے اقوال کا اس کے سوا کچھ اور مطلب نہیں کہ جس عمر میں غالب عبدالصمد سے اپنا ملنا بتاتے ہیں، وہ ایسی نہیں کہ اس سے زیادہ استفادہ کر سکے ہوں، غالب نے قاطع میں خود اپنی رائیں عبدالصمد کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ غالب نے محرق کے اقتباسِ اول کا یہ مطلب لیا ہے کہ مصنفِ محرق نے انھیں عبدالصمد کا معشوق کہا ہے اور سوقیانہ الفاظ میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ المرء یقیس علی نفسہ دوسرے اقتباسات کے بارے میں وہ ل میں لکھتے ہیں۔

"صفحہ ۶۹ میں منشی جی ایسا کچھ لکھتے ہیں کہ ہرمزد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا کہ ناصبی کے ساتھ مترادف بالمعنی ہو۔ ساسان پنجم کی اولاد میں سے رہنے والا ایزد کا ہندوستان تشریف لایا اور حضرت غالب سے ملا اور دو برس ان کا مہمان رہا۔ اس کو منشی جی کس دلیل سے جھوٹ کہتے ہیں نجم الدولہ جھوٹ نہ بولیں گے۔"

(۲) ساطع برہان کے مصنف نے عبدالصمد سے متعلق کوئی قابلِ ذکر بات نہیں کی۔ غالب نے نامۂ غالب ساطع کے جواب میں لکھا ہے، اس میں یہ عبارت ملتی ہے:

"احسان مند ہوں کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح مجھ کو معشوق میرے استاد کا نہ لکھا۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے" (عود[۱۸۶])

(۳) مؤید برہان کے مصنف نے جابجا ان رایوں سے جو غالب نے عبدالصمد کی طرف منسوب

---

۲۹ تاریخ عالم آرائے عباسی میں جو شاہ عباس دہم کی تصنیف ہے محمود کا نام محمود اسحق لکھا ہے اور ان تینوں اشعار کو، مولانا میر علی کی طرف منسوب کیا ہے[۱۲۵] اس انتساب کی تصدیق شاہد صادق کے قلمی نسخے سے بھی ہوتی ہے جو کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ بھی اسی صدی کی کتاب ہے۔ اس میں یہ بیت زائد ہے۔

بہ تعلیم او دلم خوں شد تا خطش یافت صورتِ تحریر (بیت ۲)

کی ہیں، اختلاف کیا ہے۔ ان کی دو عبارتیں جن میں سے ایک پشتن سے متعلق ہے، نقل کی جاتی ہیں۔

"میرزا عبدالصمد را ہمہ داں استادِ کامل فن برائے خود قرار می دہد، چوں تالیفے از و بدست روزگار نیست و حالش معلوم و مشہور نیست، اگر ہمچناں باشد، گوباش، مدعی را چہ فخر است۔ وکدام بزرگی" ص۲۴۳

"ہیہات غالب بگفتۂ یک کس کہ حال علم و زباندانیش جا بجا بزنگرندگان حالی می شدہ است و ایں جا بوجہ احسن جہل مرکبش واضح می شود۔ از گفتار ہزاراں مردم ثقہ اعراض کرد" ص۲۴۵

غالب نے تیغ میں اس کا کچھ جواب نہیں دیا بل کہ شتین و پشتن کی بحث ہی نہیں چھیڑی۔

(۴) قاطع القاطع کے مصنف کی اصلی غرض غالب کی توہین و تذلیل ہے۔ اس نے کہیں تو یہ لکھا ہے کہ غالب نے اپنے استاد کو بدنام کیا ہے اور کہیں یہ کہ وہ خود کچھ نہ تھا۔ قطع کے دو اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"ایں ملامت کش روزگار استادِ خود را چرا شریکِ حالِ خود ساخت و بہ رسوائی او پرداخت مگر بارِ ملامت سنگین بود، تنہا تاب کشیدنش ندید۔ ناچار بے چارا را بامداد طلبید، افسوس صد افسوس اگر چنیں تلمیذ ناہموار نہ می بود آں مرد دانا را بہ نادانی کہ می ستود" ص۲

"یکے از عوام الناس را کہ عبدالصمد نام او گرفتہ، پیشوائے خود شمردہ است۔ قولِ او را کہ اصلی ندارد، مثبتِ مدعائے خویش می شمارد" ص۲۴۹ و ص۲۵۰

یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان چاروں کتابوں کے مصنف اس سوال سے بحث نہیں کرتے کہ عبدالصمد وجودِ خارجی رکھتا تھا یا نہیں۔ انھیں ان اقوال سے غرض ہے جو اس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور یہ ان کے نزدیک عموماً قابلِ قبول نہیں۔

(۵) حالی کی یادگارِ غالب پہلی مستقل کتاب ہے جو غالب کے حالات اور کلام پر لکھی گئی ہے۔ حالی معترف ہیں کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی یہ سنا گیا ہے کہ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے (عبارت فصل ۲ میں دیکھیے)، لیکن اس کے باوجود وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی" (ص۱۴)۔ حالی نے اس پر بس نہیں کیا، آگے چل کر لکھتے ہیں: "اس کے فیضِ صحبت نے کم از کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابر است و اگر حاصل نشود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر۔ اس نے

تمام فارسی زبان کے مقدس اصول اور گرُ پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحدالاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے بوجہ اولیٰ ذہن نشیں کردی تھیں" (ی ص ۱۵ و ۱۶) حالی اس کے بھی مقر ہیں کہ "زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور ان کی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا" (ی ص ۱۱)

یہ بات کہ عبدالصمد وجود خارجی نہ رکھتا تھا ظاہر احالی نے خود غالب کی زبان سے نہیں سنی۔ لیکن یہ بات ان پر تمام تھی کہ غالب نے یہ بات کہی ضرور ہے، ورنہ وہ سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ غالب کے متضاد اقوال میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدءِ فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے" (ی ص ۱۵)

غالب کا صریح تضاد دور کرنے کی کوشش میں حالی خود تضاد میں مبتلا ہو گئے۔ یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ جس شخص نے غالب کی متخیلہ پر خاص اثر ڈالا فارسی کے تمام مقدس گر، پارسیوں کے مذہبی اسرار، اور پارسی اور سنسکرت کا متحدالاصل ہونا اور اس قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کی بوجہ اولیٰ ذہن نشین کردی تھیں' اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہے؟

حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عبدالصمد "یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا: اے عزیز چہ کسی کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر میگذری" (ی ص ۱۶)

قابل توجہ باتیں یہ ہیں کہ حالی نہ تو یہ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ خاں خود حالی سے ناقل تھے اور نہ یہ کہ انھوں نے عبدالصمد کا خط خود دیکھا تھا۔ مصطفیٰ خاں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کی ملاقات غالب سے ۱۲۵۰ھ سے کچھ قبل ہوئی ہے۔ اگر عبدالصمد اصلی شخص ہوتا تو اس وقت وہ ۹۰ کی لپیٹ میں ہوتا اور ایک غیر ملک سے اس زمانے میں مراسلت خارج از بحث ہوتی۔

(۲) حکیم غلام رضا خاں دہلی کے نامی حکیموں میں تھے، اور اکمل المطابع ان کی ملک تھا۔ عبدالغفور نساخ مرحوم نے سوانح عمری بے نظیر میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ گویا غالب کے متبنیٰ ہیں اور مرزا

کے حالات سے بہت واقف "اردوے معلیٰ" کا حق تصنیف غالب نے "نورچشم اقبال نشاں حکیم (غلام) رضا خاں کو بخش دیا" تھا (اردوے معلیٰ اشاعت اول)، اردوے معلیٰ میں ان کے نام ایک خط بھی ہے جس کی عبارت ذیل سے دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے:

"نور دیدہ وسرور دل وراحت جاں، اقبال نشاں حکیم غلام رضا خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے. تم سے رخصت ہوکر اور تمھیں خدا کو سونپ کر رامپور روانہ ہوا. تمھارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بمثل میرا کوئی صلبی بیٹا ایسا ہوتا جیسے تم ہو تو میں اس کو اپنا فخر وشرف جانتا علم وعقل وخلق وصدق وسداد کے جامع، تورع وزہد وتقویٰ کے حاوی، علم اخلاق میں حکماے روحانی نے سعادت کے جو مدارج لکھے ہیں وہ سب تم میں پائے جاتے ہیں"

حکیم صاحب شہباز کے استفسار کے جواب میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں لکھتے ہیں "صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اردو یہ جو مرزا صاحب عبدالصمد کو اپنا استاد لکھتے ہیں، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا" سوانح عمری بے نظیر ص۲۰۱و۲۰۲ حالی کے متعلق حکیم صاحب کا بیان ہے کہ وہ تو "گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے. ان کی نشست وہاں زیادہ نہ تھی" ص۲۰۲ دوسرے الفاظ میں یہ کہ حالی کو غالب کے اصلی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے وہ مواقع نہ تھے جو حکیم صاحب اور دوسرے حاضر باشوں کو تھے اس سے قطع نظر کہ غالب کا کون سا بیان قابل قبول ہے یہ متیقن ہے کہ غالب کے مخصوصین نے خود غالب کی زبان سے سنا تھا کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا.

(۵) اس فصل میں اس سوال سے بحث کی جائے گی کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں. لیکن یہ واضح رہے کہ اس بحث میں اس کی ذات اس کی صفات سے جدا نہیں کی جا سکتی.

(۱) غالب کا دیوان اردو، کلیات نظم فارسی، پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو یہ سب قاطع سے پہلے اشاعت پذیر ہو چکے تھے، ان کی بنا پر غالب کی شاعری اور انشا پردازی کی نسبت رائے قائم کی جا سکتی تھی، لیکن پنج آہنگ میں زبان فارسی سے متعلق جو بحث ہے وہ کسی طرح اس قابل نہ تھی کہ غالب کے محقق فارسی ہونے کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی، اور غالب دنیا کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ "میں نے فارسی کی تحقیق کو اس پایہ پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں (ص۲۰۸)

یہی نہیں، ان کی بلند حوصلگی اس کی بھی روادار نہ تھی کہ تحقیق فارسی کے معاملے میں کوئی دوسرا ہندوستانی اس کا شریک سمجھا جائے، یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ غالب زبان وادب فارسی کے وسیع و غائر مطالعے کے بعد دوسرے فارسی دانوں کی تحقیقات کی خامیاں دکھاتے اور اپنی طرف سے ایسے "لطائف" و "غوامض" پیش کرتے کہ لوگ مرعوب ہو کر ان کے دعوی انا ولاغیری کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے، لیکن خشک و بے مزہ کتابوں کے مطالعے میں دن رات ایک کرنا غالب کے بس کا روگ نہ تھا اور غالب کے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا تنہا فارسی داں سمجھے جانے کی خواہش کو دل سے نکال دیں، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ غالب نے ایک ایسا فرضی استاد گڑھ لیا جو علوم عربیہ و فارسیہ پر یکساں تبحر رکھتا تھا۔ اور اس تلمذ کو دوسرے فارسی دانان ہند پر اپنی تفوق کی وجہ بتایا۔ غالب کی عبارات ذیل ملاحظہ ہوں:

"کسانیکہ بہ فرہنگ نویسی ہمت گماشتہ اند آموزگار وراہ نمانداشتہ اند آئینہ ہرچہ گفتہ اند نہ گہر سفتہ اند، ایں ہوسناکاں کجا و شناختن زبان پاکاں کجا!" (ا ۶) "ہستی بخش راسپاس کہ نیرو فزائے دانش من دانشمندیست کہ اگر چنانکہ رازداں بود، رازگوی نیز بودے، ششتیں ساساں بشمار آمدے" (ا ص)

"فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ علم صرف و نحو عربی میں بہ قدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں جس نے چاہا ہے اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھی ہیں؛ مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعہ کتب سے نہیں نکالے ہیں۔ پہلے تعلیم ہے، پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے... فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے" (نامۂ غالب عود ص ۱۸۵ و ۱۸۶)

قاطع میں جس مقام پر غالب نے علم یکتائی بلند کیا ہے اور اپنے سوا ہندوستان کے کل فارسی دانوں کو غیر مستند قرار دیا ہے، وجوہ استثنا میں سے ایک عبدالصمد سے استفادہ ہے، اور اپنی بعد کی تحریروں میں انھوں نے سب سے زیادہ اس پر زور دیا ہے۔ فرضی استاد گڑھ لینے

میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ غالب کا کوئی ہم عمر جو ۱۲۲۶ھ میں آگرے میں تھا، ان کی تردید کردے، مگر اسے انھوں نے نظر انداز کیا، یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہے کہ 'واہ مرزا صاحب اس وقت تک تو آپ یہ کہتے رہے کہ میں مبدءِ فیاض کے سوا کسی کا شاگرد نہیں۔ اب یہ عبدالصمد کہاں سے ٹپک پڑا؟' مگر ایک تو کچھ ضرور نہیں کہ غالب کو یہ یاد ہو کہ وہ پہلے کیا کہہ چکے ہیں' دوسرے یہ کہ وہ جانتے تھے کہ تاویل میں بڑی گنجائش ہے۔ یہ خیال کہ لوگ عبدالصمد کے علم و فضل ہی سے انکار کردیں گے اور بے تامل ان اقوال کی، جو غالب نے اس کی طرف منسوب کیے ہیں، تردید کردیں گے، غالباً غالب کے ذہن میں نہ آیا۔ غالب کو ایک سہارے کی ضرورت تھی اور اس کے احساس نے انھیں عبدالصمد کی تخلیق پر مجبور کیا۔ علمی تحقیقات شاعری نہیں کہ غالب یہ دعویٰ کرسکیں کہ :

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

تحقیقات میں غالب کے لیے عبدالصمد وہی ہے جو 'غیب' شاعری میں ہے۔

(۲) غالب کے سوا دنیا کا کوئی شخص عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں نہ اس کی کوئی تحریر موجود ہے اور نہ کسی نے اس کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ رہے غالب تو وہ جس قدر صادق القول تھے، اس کا اندازہ راورمح کی فصل آخر کے مطالعے سے ہوسکتا ہے، اس سے قطع نظر خود غالب کے اقوال میں تضاد ہے جو غالب کی کوشش کے باوجود دور نہ ہوسکا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبدالصمد سے استفادے کے اعلان کے بعد ایسے اصحاب کے سامنے جو دلائل و اسناد کے طالب تھے، خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، وہ عبدالصمد کے وجود خارجی پر اصرار کیا کرتے تھے لیکن اپنے خاص معتقدین کے حلقے میں انھیں سچی بات کہنے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا، اور حق یہ ہے کہ مبدءِ فیاض کی شاگردی

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) "احراز دولت دیدار بیتمار رہ مزد. فراواں کمال و دانش اندوختن از وے تا دو سال"

(۱۳) غالب کے ترکش میں اور تیر بھی تھے، مثلاً سلامت طبع جو غلطی کو قبول ہی نہیں کرتی، کلام اساتذہ کا مطالعہ فارسی مناسبت، مگر جب اعتراضات کی بوچھار شروع ہوئی تو جس سے کام لیا وہ عبدالصمد کا تلمذ ہی تھا۔

میں جو شان ہے وہ عبدالصمد سے استفادے میں نہیں۔ ایک فن کار کی حیثیت سے اگر غالب محرمان راز سے عبدالصمد کی آفرینش کی داد بھی چاہتے ہوں تو عجب نہیں۔

(۳) عبدالصمد اگر وجود خارجی رکھتا اور غالب اس کے شاگرد ہوتے تو اس سے کچھ نتائج مرتب ہوتے۔ مگر یہ مفقود ہیں۔ اس کا مجموعی اثر اس عقیدے کے لیے کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص نہ تھا نہایت تباہ کن ہے۔

(الف) غالب کے زمانے سے پہلے ہی جلال واسیر وشوکت وغیرہ کی طرز متروک تھی، اور عبدالصمد کا ذوق شاعری وہی ہونا چاہیے جو اس کے ایرانی ہم عصروں کا تھا، لیکن غالب کی ابتدائی شاعری جو عبدالصمد سے متاثر ہونی چاہیے، سراسر متروک طرز میں ہے۔ غالب خود معترف ہیں کہ اوائل میں انھوں نے بیدل کی طرز میں شعر کہے۔ بیدل جہاں تک پیچیدگی کا تعلق ہے اسیر وشوکت کے ہم نوا تھے۔

(ب) غالب اور ان کے کسی ایرانی معاصر مثلاً یغما کی نظم ونثر کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب کے یہاں اپنے عہد کے مخصوص ایرانی محاورے اور روزمرے اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدا ہی میں کسی ایرانی کی صحبت میسر ہوئی ہوتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔

(ج) غالب مدعی ہیں کہ دساتیر سے ان کی واقفیت قدیم ہے اور ان سے اس کی زبان کے بارے میں عبدالصمد کی گفتگو ہوئی تھی۔ لیکن ان کی ابتدائی نظم ونثر میں نہ دساتیر کے خاص الفاظ ملتے ہیں اور نہ اس میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ۱۲۵۶ھ کے لگ بھگ سراج الدین احمد نے غالب سے کسی کتاب کا نام دریافت کیا ہے، جس سے قدیم ایرانیوں کی زبان اور مذہب کا حال معلوم ہو سکے۔ یہ موقع دساتیر سے اپنی واقفیت کے اظہار کا تھا۔ لیکن اپنے جواب میں وہ صرف دبستان مذاہب کا نام لیتے ہیں، گو وہ خود اس سے مطمئن نہیں (کلیات نثر طبع اول ۲۰۹)۔

(د) سراج الدین احمد کے جواب میں غالب وہ باتیں لکھ سکتے تھے جو ان کے قول کے بموجب انھیں عبدالصمد سے معلوم ہوئی تھیں اور جو قاطع میں مندرج ہیں، لیکن وہ ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے اور قدیم ایرانیوں کے حالات کی تلاش کو بے سود قرار دیتے ہیں: "اکنوں کیست

تابداں زبان کہن سخن درست تواند گفت واز آں دیریں آئیں بہ راستی خبر تواند داد؟ پژمردہ
ایں راز را کامِ دل بر نیاید۔"

(۵) کلکتہ میں غالب پر قتیل کے اصلی یا فرضی اقوال کی بنا پر اعتراض ہوئے تھے، باد مخالف
غالب نے ان اصحاب کی دل جوئی کے لیے لکھی تھی جو ان سے یہ سمجھ کر ناراض تھے کہ انھوں
نے قتیل کو سخت وسست کہا ہے۔ اس مثنوی میں قتیل کی مبالغہ آمیز مدح تو کی ہے، لیکن
ان کے ہندوستانی ہونے کی وجہ سے انھیں مستند ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلے میں
ان ایرانی شعرا کے نام بھی لیے ہیں جن کے تتبع پر انھیں ناز ہے۔ مقتضائے مقام تھا کہ عبدالصمد
سے فیض یابی کا ذکر کیا جاتا لیکن کنایۃً بھی اس کی طرف اشارہ نہیں۔ خاتمہ کلیات فارسی میں
بھی عبدالصمد کا ذکر بے محل نہ ہوتا، لیکن وہ بھی اس سے خالی ہے، اور یہی حال غالب کی ان
تمام تحریروں کا ہے جو قاطع سے قبل کی ہیں۔

(۶) یہی نہیں کہ غالب کی مذکورۂ بالا تحریروں میں عبدالصمد کا ذکر نہیں، موقع آیا ہے
تو انھوں نے صراحتاً لکھا ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں۔ سراج الدین احمد کے نام کے اس خط میں
جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ غالب نے قاضی محمد صادق خاں اختر کے تذکرے کے لیے اپنا ترجمہ
سپردِ قلم کیا، اس میں یہ عبارت بھی ہے:

"در سخن از پرورش یافتگان مبدء فیاضم و سواد معنی را بہ فروغ گوہر خویش روشن کردہ ام، از
ہیچ آفریدہ حق آموزگاریم بگردنم نیست و بارِ ہنایم پرورش نیست۔"

بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب نے شاعری میں کسی کی شاگردی سے انکار
کیا ہے، اس سے جہاں تک فارسی سیکھنے کا تعلق ہے، عبدالصمد کے تلمذ کا انکار لازم نہیں آتا۔
مگر غالب نے صریحاً لکھا ہے کہ میں نے "آئین معنی آذینی" عبدالصمد سے سیکھے (تمہید دیکھیے) اور حالی
بھی اس کے قائل ہیں کہ غالب کی ابتدائی شاعری عبدالصمد سے متاثر ہے۔ غالب نے قاطع کی
تصنیف سے پہلے ظاہراً کسی سے زبانی بھی عبدالصمد کے ہندوستان آنے اور اس سے مستفید
ہونے کا ذکر نہیں کیا، ورنہ یہ بات ان اصحاب کو جنھوں نے ان کا حال اس سے پہلے لکھا ہے ضرور
معلوم ہوتی —— ذکا، سرور، شیفتہ، کریم الدین، صابر، باطن، محسن، سید احمد خاں کی کتابوں

میں عبدالصمد اور اس سے تلمذ کا کنایتہً بھی مذکور نہیں۔ بعد کے مصنفین اگر اس کا ذکر کرتے ہیں تو اس لیے کہ قاطع ان کی نظر سے گزر چکی ہے۔

یہ امور صرف ایک نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عبدالصمد غالب کے بحر تخیل کی ایک موج سے زیادہ نہیں۔

خاتمہ: عبدالصمد جو غالب کا زائیدۂ طبع ہے بہت سی باتوں میں اپنے آفریدگار سے مشابہ ہے: غالب افراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارائی[۳۱]، غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ یزد کا امیرزادہ، تصوّف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحید وجودی کے دونوں قائل ہیں۔ معلّمی کسی کا پیشہ نہیں، لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لیے دونوں آمادہ ہیں منطق و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا تبحّر اسے غالب سے ممیز کرتا ہے۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی ناواقفیت کا احساس غالب کو بہ شدّت تھا۔ یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے، عبدالصمد "رازداں" تو ہے مگر "رازگوئی" کا شوق نہیں رکھتا۔ غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں اسی لیے غالب نے ساسانِ ششم کا لقب اپنے لیے محفوظ رکھا۔ دستنبو کی آخری رباعی کا آخری مصرع ہے: ساسانِ ششم بکارِ دانی مائیم۔

عبدالصمد کے وجود خارجی کا تسلیم کرانا آسان نہ تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ایران قدیم سے متعلق غالب کے معلومات بہت قلیل تھے۔ اور جو کچھ تھے وہ بھی بہت کچھ غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جس کی معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں۔ ان اصحاب کے لیے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زردشتی مذہب سے کسی حد تک بھی باخبر ہیں، ایک ایسے زردشتی عالم کے وجود کا قائل ہونا جو ستن کی جگہ بستن کو صحیح سمجھتا اور جینود کو مستحدث مانتا ہو ممکن نہیں، اس سے قطع نظر کر لی جائے تو غالب نے بعض باتیں جو عبدالصمد کے بارے میں لکھی ہیں، ان سے فن کارانہ سلیقہ ظاہر ہوتا ہے اور جن کی داد ملنی چاہیے مثلاً:

۳۱؎ غالب نے عبدالصمد کا سلسلۂ نسب ساسان پنجم (دساتیر کے خیالی مترجم و مفسر) سے ملایا ہے اس کی موزونی میں کلام نہیں۔

"رہے صمد کے معنی، جب مولانا عبدالصمد قدس سرہٗ نے .. اروند کے وہ معنی شرح کیے کہ جس کا ترجمہ ہندی میں ٹھوس ہے اور بتایا کہ عربی میں ان معنوں میں لفظ صمد ہے کہ ایک اسم اسمائے الہٰی میں سے بھی ہے۔ قصہ مختصر بعد ایک مدت کے جب میں دلی میں آرہا اور مولوی فضل حق مغفور سے بعد ملاقات ربط بڑھا۔ ایک روز بحسب اتفاق ہرمزد کا ذکر درمیان آگیا اور اس ذکر کے آنے کی تقریب معنی صمد اور اروند کے اتحاد کی شرح۔ چوں کہ حضرت کو مذہب اسلام میں تعصب بہت تھا، ایسا کہ اسی فرطِ تعصب میں جان دی۔ اروند کے لفظ کو برا بھلا کہہ کر فرمانے لگے صمد اسم صفت ہے، معنی اس کے نہ چیزے از وے بردل رود و نہ چیزے بہ دروں آید نہ زیادہ شود و نہ کم گردد۔ یہ چاروں فقرے اس مرحوم کی زبانی ہیں۔ البتہ مجھ کو تو اب اس میں کوئی تردد نہ رہا بہ اعتبار فارسیت ہرمزد مالک زبان بہ اعتبار عربیت دونوں فاضل" (تیغ ص ۱۳ و ۱۴)

حالی نے لکھا ہے کہ مرنے سے چند روز پہلے غالب نے ایک اردو قصہ لکھنا شروع کیا تھا (ری ص ۱۸۹)، بڑا افسوس ہے کہ وہ تمام نہ ہو سکا

[۲۸/۱۱/۵۱]

استدراک

مقالۂ ہٰذا کا مسودہ علی گڑھ بھیجے جانے کے کئی مہینے بعد جناب مالک رام کا ایک مضمون ... نوائے ادب (بابت جنوری ۵۲ء) میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میری یہ رائے کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا، صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ میں ایک مستقل مضمون اس کے جواب میں لکھوں، اس موقع پر اس سے مفصل بحث ممکن نہیں، چند مجمل اشارات پر اکتفا کیے

---

۳۲ غالب کو اس خیال سے تقویت ملتی ہو گی کہ اگر میں ایران قدیم سے زیادہ واقف نہیں، تو قاطع برہان کے پڑھنے والے کسی طرح مجھ سے بہتر نہیں۔ غالب کے زمانے سے قطع نظر، اس زمانے میں بھی غالب سے دل چسپی رکھنے والوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایران قدیم سے واقف ہوں اور اس وجہ سے عبدالصمد کے وجود خارجی کو تسلیم کرنے میں انھیں چنداں قباحت نظر نہیں آتی۔

جاتا ہے۔

(الف) مضمون نگار نے میرے تمام دلائل کی طرف توجہ نہیں کی صرف ان دلائل سے بحث کی ہے جو ان کے نزدیک "زیادہ اہم اور قابل غور ہیں" ص۲۷

(ب) میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ میری ہر دلیل دوسرے دلائل کی اعانت کے بغیر میرے دعوے کو ثابت کر سکتی ہے۔ مضمون نگار کے نحوائے کلام سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔

(ج) ن ۔(نوائے ادب) کی بعض بحثیں بہت سرسری ہیں، میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ غالب نے ایران قدیم سے متعلق جو باتیں عبدالصمد کے حوالے سے لکھی ہیں، وہ ایسی لغو اور بے بنیاد ہیں کہ کسی ایسے شخص کی طرف جو خود زردشتی رہ چکا ہو اور زردشتیوں کے مذہبی خیالات اسرار اور پارسی و سنسکرت کے متحد الاصل ہونے سے واقف ہو، منسوب نہیں کی جا سکتیں، ان میں اس کے جواب میں یہ عبارت ملتی ہے:

"اگر انھوں نے (غالب نے) قاطع برہان میں ملا عبدالصمد کے حوالے سے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو غلط ہیں، تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتایا وہ غلط تھا اور شاگرد کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ بات غلط ہے ورنہ وہ کیوں اپنی اور اپنے استاد کی رسوائی کا سامان مہیا کرتا، لیکن اس سے یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا۔؟" ص۱

میں مقالۂ ہذا کی فصل ۵ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بحث کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں، اس کے صفات سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ خود مضمون نگار نے ذکر غالب میں عبدالصمد کے بارے میں کیا لکھا ہے:

"اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موبد تھے اور زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم پارسی میں ہے، اس لیے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ عربی کے بھی عالم تھے اور انھوں نے سالہا سال علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے تھے مرزا کی فارسی دانی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر

ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی ص۲۵

(د) مضمون نگار ص۱ میں رقم طراز ہیں: "یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے قاطع میں ملّا کا نام اس لیے لکھا تھا کہ اس طرح مخالفوں کا منہ بند کر سکیں۔ یہ اعتراض کرتے وقت یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ مرزا یہ پہلے سے جانتے تھے کہ لوگ قاطع برہان کی مخالفت کریں گے۔ حالاں کہ اس مفروضے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ غالب نے سوچ سمجھ کر ایک لمبی اسکیم تیار کی تھی یعنی پہلے برہان پر اعتراض لکھے پھر انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر چوں کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا اس کی مخالفت کرے گی۔ اس لیے انھوں نے اپنے دماغ سے ایک شخص پیدا کیا اور تمام اعتراض اس کے نام لکھ دیے۔ تاکہ لوگ مرعوب ہو کر ان کے بجائے ملّا کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ کیا غالب کی شخصیت اور زندگی سے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے اس میں کوئی ایسی بات ہے جس میں ان کے سازشی کردار کی طرف اشارا ہو جس سے پایا جائے کہ وہ پہلے سے اتنی لمبی سازش سوچنے اور اسے معرض عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے؟ کسی تحریر کو کسی دوسرے کے نام سے چھاپ دینا بالکل الگ بات ہے یہ ان کے پیشے سے متعلق ہے۔ وہ کسی خاص شخص کو اس درجے کا خیال نہیں کرتے تھے۔ کہ خود اس سے مخاطب ہوں" ص۱

اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اعتراضات کی اشاعت سے قبل غالب یہ سمجھ سکتے تھے یا نہیں۔ کہ لوگ قاطع برہاں کی مخالفت کریں گے۔ قاطع کے انطباع سے پہلے غالب نے قاطع کے متعلق ایک خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف برہان کے نام پر جان دیں گے کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانتے گا۔ نہ یہ کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔" (اردوئے معلیٰ ص۳۹۶)

غالب اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندی فارسی داں برہان کی تحقیقات کے معترف ہیں اور قاطع میں انھوں نے صرف برہان پر اعتراضات پر قناعت نہ کی تھی۔ اپنے سوا کل ہندی فارسی دانوں کو نامستند قرار دیا تھا اور آرزو، وارستہ، بہار، قتیل اور صہبائی کو نشانۂ تعریض بنایا تھا

اس صورت میں یہ سمجھنا کہ کتاب کی مخالفت نہ ہوگی، انتہائی درجے کی سادہ لوحی ہوتی. سازش کا انگریزی مرادف، کونسپریسی ہے اور اس کے لیے کم از کم دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے. عبدالصمد کی تخلیق میں کوئی دوسرا شریک نہیں؛ اس لیے اسے سازش نہیں کہہ سکتے. لطائف غیبی کی سیّاح کے نام سے اشاعت البتہ سازش ہے، سیاح کی رضامندی کے بغیر اس کتاب کا ان کی طرف انتساب ممکن نہ تھا. مضمون نگار نے غالب کے اس فعل کو کہ خود کتاب لکھی اور اپنے ایک شاگرد کی طرف منسوب کی، اخلاقی نقطۂ نظر سے ناقابلِ اعتراض قرار دیا ہے؛ لیکن، یہ محض علمی کتاب نہیں، اس میں انھوں نے اپنے فریق کو فحش گالیاں دی ہیں اور اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں اور اس صورت میں اس کا کسی دوسرے کی طرف انتساب اخلاقی حیثیت سے یقیناً مذموم ہے. مضمون نگار کو چاہیے تھا کہ میں نے غالب کی راست گفتاری میں جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، پہلے ان کی تردید کرتے. عبدالصمد کی تخلیق کا جو اخلاقی پہلو ہے، اس کی طرف بعد کو متوجہ ہوتے. طرّہ یہ کہ وہ خود اس کے قائل ہیں کہ بعض مواقع پر غالب نے قسم کھانے کے باوجود غلط گوئی سے کام لیا ہے، مگر وہ اسے غلط گوئی نہیں، 'شاعرانہ مبالغہ' کہتے ہیں:

"اس سے قطعی ثابت ہے کہ واقعی نواب بھی کوشش کر رہے تھے اور مرزا نے یوسف مرزا کو جب یہ لکھا کہ 'والیِ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خداساز ہے. بہ علی ابن علی طالب' تو یہ بھی شاعرانہ مبالغہ تھا" ذکر غالب ص ۸۵.

(۸) مضمون نگار کی رائے ہے کہ حالی کی عبارتِ ذیل سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے:

"نواب شیفتہ کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط سے جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا 'اے عزیز چہ کسی کہ باایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می روی' (کذا)

مضمون نگار کے نزدیک اس عبارت سے یہ نتائج نکلتے ہیں: ا- حالی نے یہ روایت خود شیفتہ سے سنی تھی. ب. شیفتہ نے عبدالصمد کا خط خود دیکھا تھا. ج خط کے وجود سے ملّا کے "تاریخی شخصیت ہونے" کا ثبوت ملتا ہے.

اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات بھی کی تھی.

تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔

(و) مضمون نگار کا قول ہے: "بے شک مولانا حالی فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ سنا گیا ہے کہ چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی کہتے ہیں: عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی، جب تک حالی نے اور ذرائع سے اپنے بیان کی درستی کے لیے کافی ثبوت نہ فراہم کر لیا ہوگا وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ غالب نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نام کے ایک شخص سے انھوں نے فارسی ضرور پڑھی تھی۔" ص ۳۳

حالی نے حیات جاوید میں اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب سے قبل اس فن کی جو کتابیں میرے قلم سے نکلی ہیں، ان میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے (تمہید)؛ اس صورت میں ظاہر ہے کہ حقیقت سے انحراف ناگزیر ہے۔ اس سے قطع نظر، تحقیق ان کا مطمح نظر ہی نہیں، وہ لوگوں کو غالب کی عظمت کا معترف بنانا چاہتے ہیں اور بس۔ حالی نے اگر اور ذرائع سے اس کی تصدیق کی ہوتی کہ عبدالصمد ایک حقیقی شخص تھا تو اس کے اظہار میں کون سی بات مانع تھی؟ جیسا کہ میں مقالۂ ہذا میں لکھ چکا ہوں وہ شیفتہ کے قول کو ضرورت سے زیادہ اہم سمجھتے تھے، اور بظاہر کسی اور ذریعہ سے انھیں اس کا علم نہ ہوا تھا کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ حالی نے یہ بات کہ "میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے"، خود غالب کی زبان سے سنی تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ یہ نہ لکھتے کہ "کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ سنا گیا ہے"۔

اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آخر حالی نے جو صرف تصویر کا ایک رخ دکھانے پر قانع تھے، اس بات کا ذکر ہی کیوں کیا؟ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ انھیں متعدد اصحاب سے جنھیں غالب کا محرم راز کہا جا سکتا ہے یہ معلوم ہوا تھا کہ خود غالب نخ کی صحبتوں میں عبدالصمد کو ایک فرضی شخص کہا کرتے تھے اور یہ اصحاب بھی یہی سمجھتے تھے۔ حالی کے لیے جو غالب کو دنیا کے سامنے ایک انتہائی درجے کے راست گفتار شخص کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے، اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے غالب کے دو اقوال میں مطابقت پیدا کرنا ضروری خیال کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ

اس کوشش میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔

(ز) غالب نے لکھا تھا: "از ہیچ آفریدۂ حق آموزگاریم بر گردنم نیست و بار رہ نایم بردوش منیت"
میں نے دکھایا تھا کہ اس قول سے غالب کے اس دعوے کی کہ انھوں نے "آیینِ معنی آفرینی" عبد الصمد سے سیکھا تھا، تردید ہوتی ہے، مضمون نگار کو اس سے اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں: "غالب نے لکھ دیا کہ اس بارے میں کسی کا بارِ احساں میرے کندھوں پر نہیں اور یہ امرِ واقع ہے لیکن جب انھوں نے قاطع برہان تالیف کی تو اب موضوعِ کلام بدل گیا تھا۔ اب شعر و سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں کی اصلاح لینے کا سوال نہیں تھا بلکہ یہاں گفتگو زبان اور الفاظ کی تحقیق اور معنی و بیان سے متعلق تھی، یہی وجہ تھی کہ جب قاطع برہاں میں انھوں نے بعض ایسی باتیں لکھیں جو ان کے خیال میں نئی تھیں تو انھوں نے لکھ دیا: مجھے اپنے استاد ملّا عبد الصمد سے معلوم ہوئی تھیں۔"

"آیینِ معنی آفرینی" سیکھنے سے شعر و سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں کی اصلاح نہیں بلکہ زبان و الفاظ اور معانی و بیان کی تحقیق مراد ہے۔ نامۂ غالب میں غالب نے ہندوستانی فارسی گویوں کی تنقیص کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ "مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے" (عود: ۴۴ اشاعت اول) اس سے بھی مضمون نگار کے نزدیک زبان و الفاظ اور معانی و بیان کی تحقیق ہی مراد ہوگی۔ مجھے اس سے شدید اختلاف ہے۔

(ح) مضمون نگار کی رائے میں میں نے یہ کہہ کر کہ "حکیم غلام رضا خاں نے خود غالب کی زبان سے عبد الصمد کا فرضی نام ہونا سنا ہوگا": "آپ ہی اپنی دلیل کمزور کر دی ہے۔" سیں

بات یہ ہے کہ وہ میرے مطمحِ نظر اور طریقِ کار سے واقف نہیں، حکیم صاحب نے جب خود صراحتہً یہ نہیں لکھا کہ میں نے خود غالب کی زبان سے سنا ہے تو میں ان کے حوالے سے یہ کس طرح لکھ دیتا، قیاس اور چیز ہے روایت اور چیز ہے، اور دونوں میں فرق کرنا لازم ہے، مضمون نگار کو اس کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکیم صاحب کے بیان کو حالی کے بیان پر ترجیح دی جائے میں مقالۂ ہذا میں اس سے بحث کر چکا ہوں [1]

---

[1] مضمون نگار نے اپنے مضمون کی ابتدا اس عبارت سے کی ہے: (باقی اگلے صفحہ پر)

(ط) مضمون نگار فرماتے ہیں: "جو مرزا کی افتادِ طبع سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ انہیں خلافِ واقع باتیں بنانے میں اور لطیفے چھانٹنے میں لطف آتا ہے۔ انھوں نے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں یہ چھٹیا اڑایا کہ اجی کون شاگرد اور کہاں کا استاد، وہ لوگ مجھے بے استادا ہونے کا طعنہ دیتے تھے، میں نے ان کے لیے ایک استاد پیدا کر لیا، تو جاننے والے اسے بھی ان کے دوسرے لطیفوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ہوں گے۔ اس سے ان کی راست گفتاری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ص ۴۳"

حکیم غلام رضا خاں نے غالب کی زندگی میں (میرے قیاس کے مطابق جس سے مضمون نگار کو اختلاف نہیں) غالب کی زبانی یہ بات سنی کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے' اور عمر بھر اسے باور کرتے رہے۔ لیکن مضمون نگار کے نزدیک غالب کے ہم صحبتوں کو کبھی اس کے متعلق غلط فہمی نہیں ہوئی اور وہ اسے محض ایک لطیفہ سمجھتے رہے!

یہ کہنا کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے ظرافت نہیں۔ لیکن اگر عبدالصمد کے معاملے کو غالب کی شوخیِ طبع کا نمونہ قرار دینے پر اصرار ہی ہے، تو میں یہ کہوں گا کہ ظرافت عبدالصمد کی تخلیق میں ہے، اور غالب کے تیرِ ظرافت کی آماجگاہ وہ اصحاب ہیں جو اس کے وجودِ خارجی کے قائل ہیں۔

تصحیح و اضافہ:

(۱) فصل ۱: صفحہ سطر ۱۲ "اردو نثر بھی لکھا کرتا تھا" یہ درفش کاویانی ص۸ میں ہے۔

فصل ۲: صفحہ سطر ۱۲ "پہلوی میں بھی اشعار ہیں" سبک شناسی جلد ۱ ص ۱۰۶

خاتمہ: صفحہ سطر ۱۹ غالب معلم پیشہ لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے

باقی گزشتہ صفحہ کا حاشیہ: یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے ملا عبدالصمد کی ہستی سے متعلق شک و شبہ کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں اگر سب نہیں تو ان میں سے اکثر غالب مطمئن ہو گئے تھے: مجھے ایسے کسی ایک شخص کا بھی علم نہیں جس نے پہلے شبہے اور بعد ازاں اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہو۔

ان کے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آئی ہوگی کہ عبدالصمد کو اس گروہ میں شامل کریں لیکن انھوں نے صراحتہً یہ نہیں لکھا کہ وہ معلم پیشہ نہ تھا. سطر ۱۹ کی عبارت ترمیم طلب ہے۔

(۲) حواشی

حاشیہ ۱۹: نامحتاط مصنف بالارادہ ایسی باتیں بڑھا دیا کرتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا. اس کی ایک مثال جناب مالک رام کی یہ عبارت ہے جو ذکر غالب (اشاعت ۲) صفحہ ۲۵ میں ہے:

"عبدالصمد اسلام قبول کرنے سے پہلے زردشتی مذہب کے مؤبد (کذا) تھے"

حاشیہ ۲۲: محشی قاموس نے صرف فاریابی لکھا ہے، مگر یہ لفظ تنہا آتا ہے تو ابونصر فاریابی ہی سے مراد ہوتی ہے.

حاشیہ ۲۳: "مع فصل ..... جائے" کی جگہ عبارت ذیل ہونی چاہیے: ذال فارسی کی مفصل بحث کے لیے راقم کا مقالہ 'غالب اور ذال فارسی' (آج کل فروری ۵۲ء) دیکھا جائے. اس میں سعدی کے اس شعر کا ذکر ہے جس میں 'عدل' 'فضل' کا قافیہ آیا ہے اور اوحدی کی جام جم کے اس شعر کا بھی جس میں 'فیض' 'غیظ' کا قافیہ بندھا ہے.

حاشیہ ۲۷: رومی کا شعر مثنوی (اشاعت نکلسن جلد ۱ ص ۱۱) میں ہے

[۱۰/۶/۵۲]

خواجہ سید محمد فخرالدین حسن متین دہلوی

متوفی (۱۳۱۱ھ)

حمید احمد خاں

امراؤ بیگم

بڑے آدمیوں کے سوانح نگار جب بہ انداز تعظیم ان کی داستانِ حیات لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی بیویوں سے بارہا بے انصافی کر جاتے ہیں۔ اس بے انصافی کے اسباب بالکل قدرتی ہیں۔ کتابوں میں جس تکرار و توضیح سے بڑے آدمیوں کے اقوال بیان ہوتے ہیں، وہ ان کی بیویوں کے نقطۂ نظر کو نصیب نہیں ہوتی۔ سقراط، سعدی اور شیکسپیر اپنی بیویوں سے کچھ ایسے خوش نہ تھے۔ بلاشبہ ان مشاہیر کی سوانح عمریوں میں اس معاملے کا ذکر ضروری ہے لیکن اسی کے برابر اہمیت اس دوسرے سوال کو بھی ملنی چاہیے کہ خود ان کی بیویوں کی رائے اپنے نامور شوہروں کے متعلق کیا تھی۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بڑے آدمی کی عظمت کے حق میں تاریخ کئی بار ذرا دیر سے فیصلہ کرتی ہے۔ سوانح نگار قدرتاً تاریخ کے اس فیصلے سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ بڑے آدمی کے متعلقین کو اس فیصلے سے متاثر ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہم سب اس بنیادی حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بڑے آدمی کی بیوی سب سے پہلے ایک آدمی کی بیوی ہوتی ہے اگر اس کے خانگی حقوق و وظائف کا سلسلہ اس کی ذاتی زندگی کو مطمئن نہیں کرتا تو اس کے شوہر کی بڑائی کے متعلق سوانحی یا ادبی تنقید کا لگایا ہوا حکم اس کے لیے رائیگاں اور مہمل ہے۔ کسی

عورت (یا مرد) کی زندگی کو ایک ایسے معیار سے پرکھنا جو عملی زندگی کا معیار ہی نہیں ہے۔
ایک قسم کی داستان گوئی تو کہلا سکتا ہے لیکن اسے واقعہ نگاری کا نام دینا ذرا زیادتی ہو۔
مرزا غالبؔ کی بیگم صاحبہ کو مرزا صاحب کیسے نظر آتے تھے اس کے لیے میاں بیوی کے انداز طبیعت اور شخصی حالات کا تصور کسی حد تک ہماری رہ نمائی کر سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلے کو غالب کی شاعری پر مولانا حالیؔ یا ڈاکٹر بجنوری کی رائے سے خلط ملط کر دینا تو کسی حالت میں درست نہیں ہو سکتا۔ بیگم مرزا غالبؔ ایک علیحدہ اور مستقل شخصیت کی مالک تھیں جسے دیوانِ غالبؔ کے ضمیمے کے طور پر پیش کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہمیں ان کی شخصیت کو سمجھنا ہے تو سب سے پہلے ان کی زندگی کو خود ان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ آیئے آج اس کہانی کے آغاز و انجام پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں۔

یہ کہانی ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے جب دہلی کے ایک شریف اور با اقبال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امراؤ بیگم رکھا گیا۔ امراؤ بیگم کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ شہزادہ گل فام کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب امراؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کا بیاہ ہو گیا۔ اس کا دولہا مرزا اسد اللہ بیگ خاں جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا آگرے کا ایک امیرزادہ تھا۔ سفید فام، خوش شکل، خوش گفتار۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سپہ گری کی زندگی اختیار کرے گا اور امراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں بھی حاصل رہے گا لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسد اللہ بیگ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بے کاری میں یا بے کار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد امراؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب میں ہوتی۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امراؤ بیگم سے نیک سلوک نہ کرنے کی گویا قسم کھالی تھی۔ سات بچے

پیدا ہوئے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے ماں کے دل کو دائمی جدائی کا داغ دے گئے۔ شوہر جیسا بھی تھا نباہ تو کیے جا رہا تھا۔ لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بیوفائی کی۔ شوہر کے ہاتھوں پیوند خاک ہونا امراؤ بیگم کو نصیب نہ ہوا۔ بڑھاپے میں اسے بیوگی کا صدمہ دیکھنا پڑا اور اسی کے ساتھ ہی شوہر کی مالی پریشانیاں خود اسے ورثے میں مل گئیں۔ امراؤ بیگم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا۔ اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے، سرکاروں، درباروں میں استمداد کے لیے عرضیاں بھجوائی گئیں۔ ان عرضیوں کا مضمون پڑھنے والوں کو آج بھی دردناک معلوم ہوتا ہے لیکن سرکاروں، درباروں میں کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ۱۸۷۰ء میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی نازپروردہ بیٹی پریشاں روزگار، بے اولاد، بے شوہر دنیا سے رخصت ہوئی۔

نسوانی زندگی کی اس مختصر سی کہانی میں کوئی ایسی عجیب بات نظر نہیں آتی جس کی خاطر لوگ اسے سننے کے لیے بے تاب ہوں۔ عورت کی گمنامی اور بےکسی اور بے حاصلی کا یہ نقشہ گزشتہ صدی کی طرح آج بھی مسلمان شرفا کے گھروں میں موجود ہے لیکن پھر بھی امراؤ بیگم کی داستان میں ایک خاص بات ہے۔ اس کا شوہر اسد اللہ خاں غالب آج اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور امراؤ بیگم اور مرزا غالب کے باہمی تعلقات ادبی سوانح کا ایک دلچسپ مسئلہ بن چکے ہیں۔

خود غالب کی تحریروں میں ان ازدواجی تعلقات کا ذکر بار بار رہا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس ذکر کا کتنا حصہ مزاحاً اور کتنا حصہ سنجیدگی سے قلم بند ہوا ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں: "چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی، ان کی زبان و قلم سے بیوی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔" لیکن اس سلسلے میں عام خیال وہی ہے جس کا اظہار غالب کے ایک فاضل سوانح نگار نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں۔" صرف ایک نقاد نے روحانی رفاقت کے اس

تصوّر سے بدیں الفاظ قطعی اختلاف کیا ہے، "مرزا کی کئی تحریروں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں، کہ وہ شادی کو دام سخت ہی سمجھتے رہے اور اڑنے سے پہلے گرفتار ہو جانا انھیں بہت ناگوار تھا۔"

حقیقتِ حال کیا تھی؟ اس کے انکشاف کے لیے غالب یا بیگم غالب کا کوئی غیر مشتبہ بیان ہمارے سامنے ہونا چاہیے یہ نہ ہو تو معتبر گواہوں کی چشم دید کیفیت پر بھی انحصار کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے خطوط میں وہ تلخ بیانات جن میں مزاح کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ہمارے لیے اس لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہیں کہ ان پر کسی قطعی فیصلے کی بنیاد رکھنا دشوار ہے۔ یہی حال ظرافت آمیز اشعار کا ہے۔ اس قسم کے اشعار پڑھ کے سے مزاح کا تبصرہ کرنا شاید ممکن ہو؎

زیں گونہ کہ تند رمی خرامی دانم
در خانہ زنِ تیزہ خوئے داری

لیکن قطعہ ذیل ظرافت کے شبہہ سے پاک ہے؎

بہ آدم، زن بہ شیطاں طوقِ لعنت — سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اس میں؎ در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن، کی طرف صریح اشارہ ہے۔ اس قسم کے اشارات اتفاقی نہیں بلکہ ارادی معلوم ہوتے ہیں، اردو کلام کے ابتدائی حصے میں بھی کہیں کہیں کنایتہً ایسا مضمون پیدا ہو جاتا ہے کہ نوجوان شاعر اپنی شادی سے خوش نہیں معلوم ہوتا۔ ذیل کا شعر نسخۂ حمیدیہ کی ایک غزل میں ملتا ہے؎

آرزوے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

اس شعر کا مطلب کچھ بھی لیا جائے لفظ "خانہ آبادی" کا استعمال معنی خیز ضرور ہے۔ اس غزل کے مقطعے میں دلّی اور دلّی کے نوابوں پر پھبتی بھی اسی لحاظ سے معنی خیز ہے؎

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر — کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

اس قسم کے طنزیہ اشارے غالبؔ کی شاعری میں اس کی خانگی زندگی کے صرف ایک پہلو کی جھلک دکھاتے ہیں۔ ایک دوسرا پہلو وہ ہے جس کا دلآویز ترین اظہار ابیات فارسی کی تیسری مثنوی کے آخری اشعار میں ہوا ہے۔ شاعر وطن سے دور اپنے اہل و عیال کی تکلیفوں کے احساس سے مضطرب ہے لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ ان لوگوں کی بے کسی کا آسرا وہ خود ہے تو اس کا دل شفقت اور ہمدردی سے بھر جاتا ہے اور اسے اپنی کوتاہی پر شرم آنے لگتی ہے ؎

بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر	دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن وامانده چند	بہ خونِ دیدہ زورق راندہ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ	بہ امیدِ تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از بے کسی صحرانشیناں	بہ روئے آتش دل جاگزیناں
ہمہ در خاک و خوں افگندۂ تو	بحکم بے کسی ہا بندۂ تو!
چو شمع از داغِ دل آذر فشاناں	بہ بزمِ عرضِ دعویٰ بے زباناں!
سر و سرمایہ غارت کردۂ تو	ز تو نالاں و لے در پردۂ تو

"ز تو نالاں و لے در پردۂ تو" غالبؔ اور بیگم غالبؔ کے تعلقات کا خلاصہ اس سے بہتر کہیں اور بیان نہیں ہوا، جس خلوص و درد سے مندرجہ بالا اشعار لبریز ہیں اس کے ہوتے ہوئے یہ شک کرنا ظلم ہے کہ شاعر نے "ز تو نالاں" کے الفاظ محض بہتان طرازی کے لیے لکھے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بیگم غالب نے غالبؔ کی مالی اور عملی کوتاہیوں پر ہمیشہ اس زور سے احتجاج کیا کہ غالب کو حرم سرا کی اس جنگ میں شکست کھا کر دیوان خانے کی طرف مستقل طور پر پسپا ہونا پڑا۔ اس دعوے کی بنیاد غالبؔ کے بیانات ہی پر نہیں بلکہ ایسی معتبر روایات پر ہے جو "درون خانہ" پہنچتی ہیں۔ نواب سرورالملک نے جو غالبؔ کی حقیقی بہن کے پوتے تھے اور جن کی شادی بعد میں بیگم غالبؔ کے حقیقی بھائی کی پوتی سے ہوئی ان دونوں کے باہمی تعلقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

دادا مرزا نوشہ کا نکاح دختر الٰہی بخش خاں سے ہوا بچپن میں جب میں اپنی والدۂ مرحومہ کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا تو دادی مجھ کو ایک دونی دیا کرتی تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی میں ہمیشہ ان بن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شائستہ مگر کمال درجہ مغرور و متکبر تھیں۔۔۔"

اسی مضمون کی اتنی ہی معتبر شہادت نواب معظم زمانی بیگم دختر نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی ہے جو چند ہی سال پہلے بقید حیات تھیں۔ راقم الحروف کو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر غالب اور بیگم غالب کی زندگی کے آخری زمانے کے متعلق چشم دید حالات سننے کا موقع ملا تھا ان کے الفاظ بھی یہی تھے کہ "میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔" بقول ان کے مرزا صاحب غصے میں آتے تو ان کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

"میرا تو ناک میں دم کر دیا!" "حضرت موسیٰ کی بہن!" دوسری طرف بیگم غالب خفا ہوتی تھیں، مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ اپنی بھتیجی (معظم زمانی بیگم) سے کہتی تھیں: "تو تو بچہ ہے، بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

۸ اگست ۱۸۱۰ء کو امراؤ بیگم کی شادی غالب سے ہوئی۔ نوعمری کی شادی اور پچھلی صدی کے ہندوستان میں مرضی اور پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ دولھا دولہن دونوں خود پسند اور تیز طبیعت، قدرۃً دونوں نے ایک دوسرے پر غالب آنے کے لیے کشمکش کی اور دونوں میں سے کسی نے آخر دم تک ہار نہ مانی۔ جہاں طبیعتوں کے اس ایکے نے مستقل پھوٹ کی بنیاد ڈالی، وہیں اختلاف مزاج کے بعض پہلوؤں نے دونوں کی روحانی علیحدگی کو زیادہ مضبوط اور پائدار کر دیا۔ مرزا الٰہی بخش خاں نے جب دنیا سے منہ موڑ کر تصوف اور ریاضت کی زندگی اختیار کی تو امراؤ بیگم کی فطری پارسائی کو تائید مزید حاصل ہوئی۔ ادھر غالب کی رندی اور وارستگی کو زندگی کے اس تصور سے کوئی سروکار نہ تھا۔ آغاز شباب سے لے کر بڑھاپے کے آخری دور تک کسی منزل پر بھی ان کی طبیعت ادھر نہ آئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پرہیزگار بیوی نے رند مشرب شوہر کے کھانے پینے کے برتن تک الگ کر دیے۔ ایک اور وجہ اختلاف دونوں میں سے ایک کی سنجیدگی اور دوسرے کی ظرافت تھی غالب کی ٹھٹھے کی عادت اکثر موقعوں پر امراؤ بیگم کو ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھوکھلا ہنسنا بولنا جس کے پیچھے بے اقبالی اور فاقہ مستی کا بھیانک چہرہ ہو، اس بی بی کے لیے کوئی معنی

نہ رکھ سکتا تھا جسے اپنی وسیع برادری سے عزت و آبرو کا تعلق برقرار رکھنے کے لیے خدا جانے کس کس طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔

شادی سے چند سال بعد جب میاں بیوی جوانی کی عمر کو پہنچے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس سلسلے میں خصوصیت سے قابل ذکر ہے اب امراؤ بیگم کو وہ بڑے سے بڑا صدمہ پہنچا جو شوہر کی طرف سے بیوی کو پہنچ سکتا ہے۔ غالبؔ نے ایک دوسری عورت سے بے قرارانہ عشق کیا جب بیگم غالبؔ کو یہ حال معلوم ہوا تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ غالباً ان کا فطری غرور و تمکنت اس وقت آڑے آیا۔ طبیعت کا مذہبی رنگ جو باپ سے ورثے میں ملا تھا شاید کچھ اور گہرا ہو گیا۔ شاید دونوں کی روح کے درمیان ایک اور پردہ حائل ہو گیا۔ ہمارے سامنے اس معاملے میں معلومات نہیں، صرف قیاسات ہیں۔

غرض طرح طرح کے اختلافات کی بنیاد پر آئے دن آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر شوہر کچھ کماؤ ہوتا تو طبیعتوں کا یہ اختلاف کسی حد تک دب جاتا لیکن شوہر کی کمائی کا یہ حال تھا کہ شادی کے ۱۲، ۱۴ برس بعد گھر میں جو اثاثہ تھا وہ بھی فروخت ہونے لگا۔ عورت کا شوہر اس کی قسمت ہوتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شادی کے بعد امراؤ بیگم کی قسمت پھوٹ گئی، غالبؔ کی شاعری کو امراؤ بیگم نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی۔ غالبؔ کو ہنسی، دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کا جو لپکا تھا وہ امراؤ بیگم کے لیے عذاب جان ہو گیا۔ بڑھاپے تک غالبؔ کی یہ عادت نہ گئی اور امراؤ بیگم کی چڑ بھی بڑھاپے تک قائم رہی۔ نواب معظم زمانی بیگم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ مرزا غالبؔ نے ان سے مذاق کیا تو امراؤ بیگم خفا ہو کر بولیں: "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے نوٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔"

بارہا ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں جھپٹ ہو جاتی تھی۔ خانگی زندگی کے یہ لطیفے اکثر تذکرہ نویسوں نے بیان کیے ہیں مگر ان لطیفوں کے ناگوار نتائج کا ذکر قدرتی طور پر نہیں کیا۔ مولانا حالیؔ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ غالبؔ نے مکان بدلنا چاہا۔ نئے مکان کا دیوان خانہ تو خود پسند کر آئے اور محل سرا دیکھنے کے لیے امراؤ بیگم گئیں۔ واپس آئیں تو غالبؔ نے پوچھا، کہو مکان پسند آیا؟" بیگم نے جواب دیا۔" اس گھر میں تو لوگ بلا بتلاتے ہیں۔" غالبؔ نے فوراً کہا۔

"مگر کیا دنیا میں تم سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے؟" اس کے بعد جو کچھ گذری وہ لطیفے سے تو خارج ہے مگر غالب کی سوانح عمری سے خارج نہیں ہے

ان سب باتوں کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میاں بیوی کے یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کی بھی نوبت لائے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امراؤ بیگم کی بہن بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر سے اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ شوہر نے انھیں ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا۔ اس کے برعکس مرزا غالب اور امراؤ بیگم دونوں پرانے شرفا کی وضعداری کا نمونہ تھے اور طبیعتوں کے شدید اختلافات ہوتے ہوئے بھی آخر عمر تک ایک دوسرے سے نباہ کرتے چلے گئے۔ غالب نے منجملہ دوسرے اسباب کے بیوی کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر دلی کا قیام اختیار کیا اور تمام عمر یہیں گزار دی۔ اپنے خاندان سے کہیں زیادہ ان کے تعلقات بیوی کے خاندان سے تھے اور دعملی نتائج سے قطع نظر، ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیوی کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن صورت پیدا کریں۔

مولانا حالی کی روایت ہے کہ "مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے" دوسرے ثقہ راویوں کی زبانی بھی یہی معلوم ہوا کہ غالب اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ اس علیحدگی کے باوجود امراؤ بیگم نے شریف بیبیوں کی قدیم روایت کو جس طرح قائم رکھا وہ قابل داد ہے۔ انھوں نے شوہر کی خدمت کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا۔ کھانا زنانے میں پکتا اور وقت پر غالب کو دیوان خانے میں پہنچ جاتا۔ جب بیمار ہوتے تو دوائیں جوشاندے وغیرہ پورے اہتمام سے تیار کر کے انھیں پہنچائے جاتے۔

غالب بھی دن میں ایک مرتبہ ضرور زنانہ مکان میں جاتے تھے۔ جب تک بدن میں طاقت رہی صبح کا کھانا وہیں کھاتے۔ بڑھاپے میں اس کی پابندی نہ رہ سکی۔ پھر بھی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے عام طور پر صبح یا دوپہر کو اور کبھی کبھی عصر کے قریب ضرور گھر میں جاتے۔ بنیادی بیگم کے پوتے نواب خضر مرزا مرحوم جنھوں نے لڑکپن میں غالب اور امراؤ بیگم کو دیکھا تھا، راقم الحروف سے اس زمانے کی ایک حکایت ان الفاظ میں بیان کرتے تھے "میں ایک دن مرزا صاحب کے دیوان خانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے اترے میرے کھوے پر ہاتھ رکھ کر کہا آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں دادی سے مراد

امراؤ بیگم بھتیں) اندر جاکر بستی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں. معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں کہنے لگے: ہیں یہ کیا! جب آؤ نماز! ارے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنادیا"

امراؤ بیگم کی زندگی کے درمیانی بیس پچیس سال جس تنہائی بلکہ ویرانی کے عالم میں بسر ہوئے اس کی طرف مولانا حالی نے یوں اشارہ کیا ہے" مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی. اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے" ۱۸۵۲ء میں زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوا تو آئندہ دس بارہ برس ان کے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے میں بسر ہو گئے. اس کے بعد پھر وہی تنہائی کا عالم شروع ہوا. نواب معظم زمانی بیگم کا بیان ہے کہ بڑھاپے کے دنوں میں جانماز پر بیٹھے ان کے منہ سے اکثر یہ الفاظ نکلتے تھے: "اے اللہ! تو کب بلائے گا؟"

اب موت کی دعائیں قبول ہونے کا وقت آپہنچا تھا پہلے فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب رخصت ہوئے. نواب خضر مرزا مرحوم نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ" مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا. دادی اس وقت زنان خانے میں تھیں. اسی عرصہ میں داروغہ کلو کو انھوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بلایا. میں ایک دو دفعہ گیا. گریہ ان پر طاری تھا. سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں."

ساٹھ برس کی رفاقت جو لڑکپن سے شروع ہوئی تھی اس کا یوں انجام ہوا، مگر جب تک زندگی ہے زندگی کے دھندے بھی جاری ہیں. بیوگی کے ساتھ تنگ دستی کی تکلیفوں نے نئی شدت اختیار کی. رامپور کی تنخواہ اور انگریزی پنشن جو غالب کو ملتی تھیں. دونوں ایک دم بند ہوگئیں. امراؤ بیگم کی طرف سے کمشنر دہلی اور نواب صاحب رامپور کو امداد کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں. کمشنر نے جواب دیا کہ غالب کی بیوہ کے لیے دس روپے کی پنشن منظور ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کچہری میں حاضر ہو. امراؤ بیگم نے اس شرط کو قبول کرنا گوارا نہ کیا. اور کہا کہ میں کچہری میں ہرگز نہ جاؤں گی. گو فاقوں سے مرجاؤں. رامپور والی درخواستوں سے بھی کوئی نتیجہ جلد نکلتا نظر نہ آیا. اسی پریشانی کے عالم میں مرحوم شوہر کی پہلی برسی کا دن آپہنچا. اسی دن امراؤ بیگم دنیوی عدالتوں کی حاجت روائی سے بے نیاز ہوگئیں. ان کی ایک اور بڑی درخواست خدا کی بارگاہ سے اسی دن کے لیے منظور ہو چکی تھی. میاں بیوی کو زندگی کے معاملات

میں ہمیشہ ایک دوسرے سے اختلاف رہا۔ لیکن اب موت نے یوں مساعدت کی کہ غالب کی وفات سے ایک سال بعد قمری مہینے کی ٹھیک اسی تاریخ کو امراؤ بیگم شوہر کے پیچھے روانہ ہوئیں۔

تاریخ تحریر : ۲۲/۳/۱۹۴۹ء

نظر ثانی : ۲/۴/۱۹۵۲ء

حمیدہ سلطان

مرزا باقر علی خاں کامل

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی صاحبزادی بنیادی بیگم اور چھوٹی امراؤ بیگم، چھوٹی مرزا غالب سے بیاہی گئیں اور بڑی بہن کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی۔

بنیادی بیگم کے یہاں دو صاحبزادے ہوئے، بڑے کا نام تھا زین العابدین خاں اور چھوٹے کا حیدر حسین خاں۔

مرزا غالب کے یہاں جب سات بچے ہو کر مر گئے تو انھوں نے بیوی کے بھانجے عارف کو اپنا متبنّیٰ کر لیا، عارف جوانِ صالح اور خوش فکر شاعر تھے، مرزا سے ہی اصلاح لیتے تھے اور طرزِ سخن میں مرزا کے پیرو تھے۔ عارف سے جو مرزا کو محبت تھی یہ صرف رشتہ داری کی وجہ نہ تھی بلکہ عارف کی خوش فکری اور جودتِ طبع نے مرزا کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ عارف سے جس قدر مرزا کو موانست تھی اس کا اظہار ان کے اس فارسی قطعے سے ہوتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوے عارف نام — کز خشِ شمع دودمانِ من است
آں کہ در بزمِ قرب و خلوتِ اُنس — غمگسار و مزاج دانِ من است

عارف کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہم ز کلکِ تو خوش دم و خوش دل

کاں نہالِ ثمر فشانِ من است

مگر افسوس عین عالم شباب میں عارف بھی جن کو کبھی مرزا "راحتِ روحِ ناتواں" اور کبھی "شمعِ دودماں" کہتے تھے داغِ مفارقت دے گئے، اپریل ۱۸۵۲ء مطابق جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ بعارضۂ رعاف واسہال ۳۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہوگیا اور مرزا نے ان کی جواں مرگی پر وہ درد بھرا نوحہ لکھا جو مرزا کے بہترین کلام میں شمار کیا جاتا ہے۔

بیگم عارف کا انتقال چند مہینے پہلے ہوچکا تھا اس لیے مرزا غالب، عارف کی وفات کے بعد حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے۔ باقر علی خاں جن کی عمر ۹ سال تھی اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے مگر بنیادی بیگم بھی جواں مرگ بیٹے کے غم میں جلد ہی ختم ہوگئیں اور باقر علی خاں بھی مرزا کے آغوشِ محبت میں آ گئے۔ خود فرماتے ہیں:

کہ ہنیں پنج سال است کہ دو کودک بے مادر و پدر

ہم از دودۂ آں زن کہ خونِ منش بگردن، بفرزندی

برداشتہ ام" (دستنبو صفحہ ۲۷)

ان دونوں بچّوں سے مرزا کو محبت تھی عشق تھا کبھی بھی ان کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے اگرچہ خود بے حد تنک مزاج تھے لیکن باقر علی خاں، حسین علی خاں کی ہر وقت ناز برداری کرتے تھے اور ان کا دل میلا نہ ہونے دیتے تھے۔

کامل و شاداں سے متعلق غالب کے ان خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو انھوں نے تفتہ، مجروح، حکیم غلام نجف خاں اور علاؤالدین احمد خاں کو لکھے ہیں۔ اسی طرح غالب کے ان تین خطوں کا مطالعہ مفید ہوگا جو انھوں نے باقر علی خاں کامل کے نام سپردِ قلم کیے ہیں۔

اردوئے معلی ۳۲۱ تا ۳۲۲۔

رامپور کے دونوں سفروں میں باقر علی خاں، حسین علی خاں مرزا کے ساتھ گئے تھے۔ مرزا نے دونوں لڑکوں سے نواب صاحب کو نذر دلوائی تھی، رامپور کی آب و ہوا مرزا صاحب کو موافق آئی ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات رامپور میں گزاریں مگر دونوں لڑکوں نے دہلی چلنے کے

یہ ضد کی، مرزا نے ان کو تنہا بھیجنا نہ چاہا، خود بھی ان کے ہمراہ نواب صاحب سے اجازت لے کر ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو رامپور سے روانہ ہوئے اور ۲۴ مارچ سنہ رواں کو دہلی پہنچ کر رمضان کا چاند دیکھا۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں مسند آرائے ریاست ہوئے تو مرزا غالب، نواب فردوس مکاں کی تعزیت اور نواب حال کی مسند نشینی کی تہنیت کے لیے ۱۶ اکتوبر کو دہلی سے روانہ ہوئے تو دونوں لڑکے پھر ساتھ گئے۔ یہ دونوں غالب کی جان تھے چونکہ صغیر سن تھے اور لاڈلے، اس لیے مرزا کو تنگ بہت کرتے تھے۔ اس مرتبہ مرزا صاحب نے ان دونوں لڑکوں کو ۲ دسمبر کو ملازموں کے ہمراہ دہلی روانہ کر دیا۔ خود ۲۸ دسمبر کو روانہ ہوئے۔ راہ میں ان کو ایک سخت حادثہ پیش آیا، دہلی پہنچ کر اس حادثہ کی تفصیل نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھی ہے

باقر علی خاں کا خاندان

مرزا باقر علی خاں کے دادا غلام حسین خاں مسرور خلف نواب فیض اللہ خاں ابن نواب قاسم جان بیگ مشرف الدولہ سہراب جنگ تھے یہ وہی قاسم جان بیگ ہیں جو شاہ عالم کے زمانے میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور پنجاب میں جنھوں نے معین الملک عرف میر منو خلف نواب قمر الدین خاں وزیر کے ساتھ سکھوں پر فتوحات حاصل کی تھیں اور اپنی دلیری سے پنجاب میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ میر منو کے انتقال کے بعد قاسم جان بیگ نے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ دربار کا رخ کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عالم بنگال میں میرن کے مقابلے کے لیے فوجیں لیے پڑے تھے یہ بھی وہیں پہنچے، اور اپنی بہادری سے بادشاہ کو خوش کر کے شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب پایا۔ ہفت ہزاری منصب ملا۔ بادشاہ کے ساتھ تینوں بھائی دہلی واپس آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ نواب قاسم جان بیگ تو اکثر جنگی مہمات پر رہتے تھے۔ دونوں بھائی جاگیر و دیہات کا انتظام کرتے تھے، قاسم جان بیگ نے تین لڑکے چھوڑ کر وفات پائی، محمد بخش خاں، فیض اللہ بیگ خاں، قدرت بیگ خاں۔۔ محمد بخش خاں کاروبار ریاست سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لیے فیض اللہ بیگ خاں

کو ریاست کا کام سنبھالنا پڑا۔ اپنے باپ کا خطاب شرف الدولہ سہراب جنگ دربار شاہی سے پایا، فیض بیگ خاں کے تین بچے تھے ایک صاحبزادی انجمن النساء بیگم اور دو صاحبزادے غلام حسین خاں اور نقشبند خاں، نواب غلام حسین خاں نے بد روی اختیار کی اس لیے ریاست ضبط ہو گئی۔

نواب غلام حسین خاں مسرور اور نقشبند خاں کو ایک ہزار ماہوار تا زیست ملتا رہا، نقشبند خاں لاولد تھے، نواب غلام حسین مسرور کے دو لڑکے تھے۔ زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔

زین العابدین خاں، عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کو باپ کی ریاست سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ۱۴ سال کی عمر میں ان کی شادی اپنے چچا نواب احمد بخش خاں کی بڑی صاحبزادی نواب شمس الدین کی حقیقی بہن نواب بیگم صاحبہ سے ہوئی، شادی کے بعد عارف کو جھرکہ فیروزپور سے دامادی کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار ملنے لگی۔ نواب بیگم کا انتقال شادی کے دو سال بعد ہو گیا، مگر عارف کو فیروزپور سے تنخواہ تا زیست ملتی رہی۔ عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی بیگ نجارائی کی صاحبزادی بستی بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ ان کو سسرال سے "نواب دلہن" کا خطاب ملا۔ ان کی وفات دردِ گردہ سے ہوئی۔ اس اچانک موت سے عارف کو بڑا صدمہ ہوا اور جب وہ خود زندگی سے قطعی مایوس ہو گئے تو "نواب دلہن" کی دونوں نشانیوں کو مرزا کے سپرد کیا۔

باقر علی خاں کی شادی

باقر علی خاں کی شادی، ۱۱ سال کی عمر میں معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم بنت نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہوئی۔ نسبت عارف اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ یہ رشتہ نواب نیر اور عارف کے لیے ارتباط و خلوص کا نتیجہ تھا۔ نیر نے غالب سے جو قول کیا تھا اس کو نباہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں تو خیر نواب تھے اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی اپنی ریاست کے مطابق شان و شکوہ سے کر رہے تھے مگر مرزا غالب نے بھی بہت حوصلے اور ارمان کے ساتھ پورے جاہ و حشم سے باقر علی خاں کی شادی کی، معظم زمانی بیگم کی عمر شادی کے وقت ۱۲ سال کی تھی۔ شادی کے بعد باقر علی خاں سسرال میں

رہنے لگے تھے، نواب ضیاء الدین احمد خاں داماد کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے تھے لیکن انھوں نے کسی طرح مناسب نہیں سمجھا کہ اپنا بار خسر کے سر پر ڈالیں. شادی کے تین سال بعد بیس سال کی عمر میں ریاست الور میں مہاراجہ شیودان سنگھ کی سرکار میں ملازمت کرلی.

مہاراجہ شیودان سنگھ بہت قدردان رئیس تھے، پہلے باقر علی خاں کو مصاحبوں میں رکھا پھر جلد ہی فوج میں لے کر کپتان کے عہدے پر ممتاز کردیا. باقر علی خاں فنون سپہ گری میں اپنے آباء و اجداد کی طرح ماہر تھے اور شیر کا شکار برچھے سے خوب کھیلتے تھے، نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے انتقال کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں نے داماد کو الور سے بلالیا کیونکہ وہ خود جواں مرگ بیٹے کے غم سے دل شکستہ ہو گئے تھے، امور ریاست اچھی طرح انجام نہ دے سکتے تھے، لائق داماد نے یہ بار اپنے سر لیا، لیکن افسوس عالم شباب میں چاہنے والے خسر کے سامنے ہی ۲۸ سال کی عمر میں، مہینے تپ دق میں مبتلا رہ کر رہگرائے عالم بقا ہوئے. مدفن سلطان جی حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی میں اپنی خاندانی حظیرہ میں ہے لوح مزار پر یہ تاریخ لکھی ہے ؎

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد — سوئے باغ جناں باقر علی خاں

بسال رحلتش تحریر گردید — بود مینو مکاں باقر علی خاں

باقر علی خاں کی اولاد

باقر علی خاں نے تین لڑکیاں چھوڑ کر وفات پائی. بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف چندہ بیگم ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں، مرزا غالب انھیں بہت پیار کرتے تھے اور مرزا جیون بیگ کہہ کر پکارتے تھے۔ سبد چین میں ان کی ولادت کا قطعہ موجود ہے ؎

بمن ز مقدم فرزند میرزا باقر — سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت

چو قصد شد متعلق بہ گفتن تاریخ — طریق تعمیہ در زبدہ جان غالب گفت ۱۲۸۱

غالب کی وفات کے وقت ان کی عمر چار سال کی تھی. ان کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں باقر علی خاں کی وفات کے بعد اپنے بڑے ماموں شہاب الدین خاں ثاقب کے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین خاں تاباں کے ساتھ ہوئی. بفضلہ تعالیٰ موصوفہ حیات ہیں، ان کے

کوئی اولاد نہیں۔

منجھلی صاحبزادی فاطمہ سلطان بیگم (عرف بندو بیگم) صاحبہ کی شادی نواب علاالدین احمد خاں علائی کے چوتھے صاحبزادے، نواب زادہ بشیرالدین احمد خاں سے ہوئی۔ فاطمہ سلطان بیگم کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں۔ چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم کی شادی نواب امیرالدین اعظم مرزا ولیعہد لوہارو، خلف نواب سر امیرالدین احمد خاں سے ہوئی تھی فخر سلطان بیگم نے ۲۴ سال کی عمر میں ۲ خوردسال بچے چھوڑ کر انتقال کیا۔ فخر سلطان کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں شان اب والئی لوہارو ہیں۔

فاطمہ سلطان بیگم نے ۵۲ سال کی عمر میں بعارضہ فالج انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے ایک سال بعد ان کے بڑے صاحبزادے معزالدین سام مرزا کا بھی انتقال ہوگیا۔ چھوٹے صاحبزادے ناصرالدین خسرو مرزا اور بڑی صاحبزادی عالیہ سلطان بیگم لیڈی عبدالصمد خاں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔ باقر علی خاں کی چھوٹی صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم (عرف مجھن بیگم) جو ان کی وفات کے وقت ۲ مہینے کی تھیں بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں ان کی شادی لیفٹیننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے ہوئی تھی، ان کے پانچ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ بندر مرزا صاحب کے پاس بیٹھا آم کھاتا رہا اور وہ ضعفِ بصارت کے باعث یہ سمجھتے رہے کہ یہ حنبدو بیگم ہیں داروغہ کلو آئے تو انھوں نے بندر کو دھتکارا۔

نانی اماں نے فرمایا کہ عالم سکرات مرزا صاحب پر کئی گھنٹے طاری رہا۔ حکیم محمود خاں نے کہا ان کی جان کسی چیز میں اٹکی ہوئی ہے۔ سب لوگوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ حنبدو بیگم میں مرزا کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ حکیم محمود خاں نے ہدایت کی کہ جس طرح وہ ہمیشہ آتی ہیں اسی طرح آنے دو۔ چنانچہ حنبدو بیگم کو مرزا صاحب کے پاس لے جاکر چھوڑا تو انھوں نے حسب معمول ان کے سینے پر سر رکھ کر منہ کان کے قریب لے جاکر آواز لگائی "دادا جان" اور مرزا نے فوراً آنکھ کھول کر اپنی لاڈلی پوتی کو دیکھا اور جان جان آفریں کو سپرد کردی

باقر علی خاں کی بیوی

نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صاحبزادی اور عارف کی بڑی بہو، خاندان کی ایک ایسی فرد تھیں جو بیاہ کر حضرت غالب کے گھر گئیں، جنھوں نے مرزا صاحب کو بہت قریب سے دیکھا، ان کی بذلہ سنجیاں سنیں اور ان کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا۔ علم انساب کا ملکہ مرحومہ موصوفہ کو اپنے مکرم والد سے ترکہ میں ملا تھا، بے حد بیدار مغز اور باحوصلہ خاتون تھیں اپنے بزرگوں کی شان، اور عہد قدیم کی مروت و اخلاق، غربا پروری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ آپ کی خدمت میں غالب کے اکثر شیدائی استفادے کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ افسوس کاشانۂ نیر کی یہ شمع روشن ۱ مئی ۱۹۴۵ء کو ۹۰ سال کی عمر میں اپنی محل سرا "ضیا منزل" میں گل ہوگئی۔ قطب صاحب، اپنے خاندانی مقبرے صندل خانہ مرزا بابر والی کوٹھی میں ان کا مدفن ہے۔

میری اپنی بہت سی معلومات نانی اماں کی بدولت ہیں وہ کہتی تھیں کہ شادی کے ایک سال بعد جو برسات آئی تو مرزا صاحب شام کو گھر میں کھانا کھانے آئے تو کہنے لگے اے ہے بیوی دیکھو کتنا پیارا موسم ہے کیسی جنوں انگیز ہوائیں چل رہی ہیں۔ اس وقت میں تم ہو اور میں ہوں، یہ سہو تو دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا سی بیٹھی ہے۔ بیگم غالب تو مرزا کے اس مذاق پر ان کو صلواتیں سنانے لگیں اور نانی اماں شرم کے مارے کوٹھری میں جا گھسیں۔ مرزا صاحب باہر چلے گئے تو نکلیں۔

نانی اماں نے کہا تھا کہ نانا جان باقر علی خاں علم نجوم سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ جو حکم وہ لگاتے تھے بالکل صحیح ہوتا تھا اپنے انتقال کے متعلق دو سال قبل انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میں آگ میں جل کر مروں گا۔ چنانچہ سنجار کی آگ میں جل کر ان کا کام تمام ہوا۔ باقر علی خاں فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں باقر اور اردو میں کامل تخلص کرتے تھے، قربان علی بیگ سالک سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ شہر آشوب کے علاوہ ان کا اور کلام نہیں ملتا۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم) فرماتی تھیں کہ جب شہر آشوب پر تمام شعرائے کرام نظمیں لکھ رہے تھے تو مرزا غالب نے حسین علی خاں سے جن کی عمر اس وقت

۸ یا ۹ سال کی تھی کہا، شاداں تو نے میرا نام ڈبو دیا۔ غالب کا پوتا اور ایسا کوڑھ مغز ایک شعر بھی نہیں کہتا، بس ہر وقت پتنگ اڑاتا رہتا ہے۔ شاداں نے جواب دیا، دادا جان، آپ فکر نہ کریں، ہم ضرور شعر کہیں گے، مشاعرہ ہوا، نامی گرامی شعرا نے دلی کی تباہی اور بربادی پر نظمیں لکھی تھیں اور بڑے سوز و گداز سے سنا رہے تھے، پورا مجمع ساکت تھا، اہلِ مشاعرہ پہ افسردگی کا عالم طاری تھا، دلی کی تباہی، دوستوں، عزیزوں کے بچھڑ جانے کا خیال، دل خون کیے دیتا تھا۔ یکایک غالب نے شاداں کی جانب نظر اٹھائی، مجمع کی آنکھیں اسی نورِ نظر پہ لگ گئیں، شاداں نے صاف اور پیاری آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

کیا ہوا مٹ گیا جو نام و نشانِ دہلی
میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

اس شعر کو سن کر مشاعرے میں اس سرے سے اس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی، روتے ہوئے لوگ ہنس پڑے، ہر چہرے پہ شگفتگی آ گئی۔ اور حضرت غالب نے اپنے ہونہار پوتے کو گلے لگا کر پیار کیا۔

مرزا غالب کی وفات کے بعد حسین علی خاں رامپور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے، ان کی شادی نواب عارف جان کے پوتے، حسن علی خاں کی پوتی حسن جہاں بیگم بنت اکبر علی خاں سے مرزا کی وفات کے بعد ہوئی۔ باقر علی خاں کے انتقال کے ساڑھے تین سال بعد ڈھائی سال، عارضۂ سل میں مبتلا رہ کر ۲۹ سال کی عمر میں حسین علی خاں نے وفات پائی، اولاد کوئی نہیں چھوڑی۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو تلف ہو گئے۔

مختار الدین آرزو صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مختصر سا دیوان کچھ دن ہوئے جناب عرشی کو کتب خانہ رامپور کے ردی گھر میں دستیاب ہوا ہے، کچھ منتخب کلام مخمخانۂ جاوید میں موجود ہے۔

۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۴۸

خواجہ قمرالدین راقم

من کیستم

اپنی سوانح عمری گزارش کرتا ہے کہ ابتدائی عمر میں اول بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے ممتاز ہوا۔ فن تیراندازی میں بادشاہ کا شاگرد ہو گیا۔ پندرہ روپے ماہانہ سرکار شاہی سے دو برس تک ملتا رہا بعد اس کے بادشاہ نے اپنے ولیعہد مرزا فتح الملک کے مجھے سپرد کر دیا۔ دو برس ان کی ملازمت میں رہا۔ اتفاق سے مرزا فتح الملک کا دبائے ہیضہ میں انتقال ہو گیا۔ پھر میں ریاست الور میں اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ راجہ بنے سنگھ والی الور نے مجھے رکھ لیا اور اپنے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم میں سپرد کر دیا۔ چالیس روپے ماہوار میرے مقرر کیے۔ شیودان سنگھ کی نو برس کی عمر تھی۔ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے نوکر ہوئے چار برس گزرے تھے کہ دہلی میں بغاوت ہو گئی اور عالم پر آشوب ہو گیا۔ انھیں ایام میں راجہ بنے سنگھ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں مر گئے۔ شیودان سنگھ کی والدہ نے مجھے تاکید کی کہ شیودان سنگھ کو ایک لمحہ تنہا نہ چھوڑ دو۔ رات دن ان کے پاس رہو اس کے علاوہ شیودان سنگھ خود مجھ سے اس قدر مانوس تھے کہ مجھے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔ اس عرصے میں دہلی فتح ہو گئی۔ لیکن ایک سال کے الور کے بعض اسی آشوب عالم میں باغی ہو گئے۔ شہر میں فساد برپا کر دیا۔ جتنے اہل کار الوروالے دہلی میں تھے سب کو اخراج کر دیا۔ اب الور جائے امن نہ رہا۔ اب بہ مصلحت والد نے وہاں سے علیحدہ ہونا

پاتا۔ مگر وہ باغی راجپوت ہماری علیحدگی پر راضی نہ ہوئے اس اثنا میں دہلی سے پنشن کی تحقیقات کے لیے حکام کا حکم آیا۔ اس وقت بمشکل الورسے میں بھی اور والد بھی علیحدہ ہوئے۔ والد دہلی کو روانہ ہوئے اور میں جے پور آگیا۔ مہاراج شیودان سنگھ اپنی جیب خاص سے مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ ایک سال تک میں جے پور میں رہا۔ اس عرصے میں والد کی پنشن کھل گئی اور میں بھی دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے چھاپہ خانہ جاری کر لیا۔ والد بوستانِ خیال کا ترجمہ کرتے تھے میں بھی ترجمے میں شریک رہتا تھا اور چھپوا تا تھا۔ میرے والد نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ پانچ جلدیں چھپوا کر شائع کر چکے تھے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ان کے اس بے مایہ نے جلد ششم ترجمہ شدہ چھپوا دی اور دو جلدوں کا ترجمہ خود کر کے شائع کر دیا جو ان کی یادگار میں باقی ہے۔ اس اثنا میں میرے ایک دوست کرم فرما مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سکریٹری میر تراب علی خاں سر سالار جنگ نے مجھے نامہ لکھ کر اپنے پاس حیدرآباد دکن بلوا لیا۔ میں حسب الطلب اپنے مخدوم کے روانہ ہو گیا۔ میرے مخدوم سراپا کرم نے مجھے سر سالار جنگ سے ملا دیا۔ سالار جنگ نے مجھے روک لیا۔ دو برس امیدواری میں رہا بعد اس کے میں نے عرض کیا کہ اب اس امیدوار کو کیا حکم ہے۔ نواب نے فرمایا کہ ہم نے تیرے لیے تجویز کر لیا ہے۔ فی الحال ہم شہزادہ ولیعہد کے استقبال کو بمبئی جاتے ہیں وہاں سے آتے ہی بندوبست کر دیں گے مگر میری تقدیر میں اس سرکار کا آب و دانہ نہ تھا۔ جب نواب بمبئی روانہ ہو گئے خیال آیا کہ تو بھی یہ جلسہ نادر دیکھ آ۔ بس یہ خیال آتے ہی میں بھی بمبئی میں آ گیا ایک سوداگر اہل دہلی کی دکان میں مقیم ہوا۔ بارہ دن ٹھہرا۔ جلسہ وغیرہ جب ختم ہو گیا قصد ہوا کہ نصف دور تو آ گیا ہے وطن چل کر ایک ہفتے کے لیے بال بچوں سے مل آ۔ آخر یہی کیا۔ کل مال و اسباب جو پانچسو روپے کی مالیت تھا۔ سوداگر کی دکان میں رکھ کر وطن میں آ گیا۔ یہاں آ کر سنا کہ جے پور کی ریل کھل گئی ہے۔ ارادہ ہوا کہ ایک ہفتے کے لیے جے پور چل کر عزیزوں سے مل آؤ۔ اور کچھ ہتھیار وقت روانگی جے پور سے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بیکار ہوں وہ بھی لے کر فروخت کر دو تاکہ زاد راہ ہو جائے۔ یہ قصد کر کے جے پور روانہ ہو گیا بس جے پور پہنچنا تھا کہ اس سرزمین نے پاؤں پکڑ لیے مہاراج رام سنگھ کو خبر ہوئی مہاراج نے مجھے بلا کر روک لیا جانے نہ دیا اور کسی قدر وظیفہ دوامی میری مدد خرچ کو مقرر فرمایا اور یہ اقرار کیا کہ ہم جلد تیری ترقی کریں گے اس کے

بعد مہاراج رام سنگھ مرگئے میری تقدیر وہاں پست ہوگئی بس وہی جز قلیل تقدیر کا رہ گیا۔ اس بے مایہ کی زندگی اسی قلیل بضاعت میں بسر ہوتی ہے اس فقیر کی عمر قریب چھہتّر کے ہوگئی ہے زندگی مثل چراغ سحری کے ہے۔ اللہ بس ما سوا ہوس۔ فقط۔

خواجہ شمس الدین خاں غالبؔ کے بھتیجے راقم کے چچا ۱۲۸۰ھ چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے ان کی والدہ ان سے قبل مرگئی تھیں۔ خواجہ شمس الدین نے فن موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے کاملین داد دیتے تھے۔ اور ان کی دن رات عبادت گزاری میں بسر ہوتی تھی، ان کے بعد خواجہ بدرالدین خاں راقم کے والد ماجد نے بھی بعمر چونسٹھ سال ماہ اگست ۱۸۰۹ء میں وفات پائی اور ان کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی۔ ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزندِ اکبر خواجہ قمرالدین خاں راقم باقی رہے۔ خواجہ بدرالدین خاں اپنے وقت کے مجمع کمالات تھے۔ خوشنویسی میں ایسے ہی تھے مصوری اور ستار نوازی میں کامل، فن رعنائی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے جیساکہ ان کے چچا مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے جلد اوّل بوستانِ خیال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میرا بھتیجا وصفِ کمالات میں یکتا ہے۔ ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا۔ مصوری میں مانی کو پرے بٹھایا۔ الیٰ آخرہ۔ حق یہ ہے کہ خواجہ بدرالدین خاں ہمہ صفت موصوف تھے۔ ان کی تصنیف افسانہ بوستانِ خیال گواہی دیتا ہے اور عالم جانتا ہے۔ غرض جب خاندان میں سوائے اس ناشاد ننگ خانداں خواجہ قمرالدین خاں راقم کے کوئی نہ رہا۔ جاگیر کی آمدنی بند ہوگئی۔ پھر اس بے بضاعت خواجہ قمرالدین خاں راقم نے اپنی موروثی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ حکام ضلع نے بعد تحقیقاتِ کامل پچاس روپیہ ماہوار میرے گزارے کے لیے تجویز کیے۔ کل محکموں سے وہ رقم منظور ہوگئی۔ جس وقت حکام ماتحت کی رپورٹ گورنمنٹ کے ملاحظے میں پیش ہوئی مجھ بدنصیب کی تقدیر الٹ گئی۔ گورنمنٹ نے پچیس روپیہ ماہوار بطور پنشن منظور فرمائے۔ قہر درویش برجان درویش سمجھ کر خاموش رہا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مہاراج رام سنگھ والیِ

جے پور نے اپنی سرکار سے اس قدر وظیفہ فقیر کا مقرر کر دیا جو آج تک اس سرکار سے
ملتا ہے اور خاکسار بدعائے دولت و اقبال سری حضور مہاراجہ صاحب فرماں روائے
حال جے پور میں بسر کرتا ہے۔ خواجہ قمرالدین خاں کی اولاد میں دو دختر نیک اختر
صاحب اولاد اور ایک فرزند ارجمند خلف الرشید خواجہ مرزا امیرالدین خاں صاحب
اولاد نمک خوار سرکار آصفی بخوش اقبالی عہدۂ جلیل پر ممتاز ہے۔

مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقمؔ

خواجہ قمر الدین راقمؔ

خواجہ قمر الدین خاں المتخلص بہ راقمؔ دہلوی ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکثر لوگ آپ کو صرف خواجہ مرزا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے والد خواجہ مرزا بدر الدین خاں المخاطب بہ خواجہ امان مترجم "بوستان خیال" تھے۔ راقمؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ایک ہی نسل سے تھے۔ یعنی غالبؔ کے دادا اور راقمؔ کے پردادا کے والد دونوں سگے چچازاد بھائی تھے جیسا کہ خود راقمؔ نے مفصل بیان کیا ہے۔

راقمؔ لمبے قد کے۔ خوش رد اور ہنس مکھ تھے۔ رنگ گندمی تھا آخر عمر میں اعضا میں قدرے رعشہ ہو گیا تھا جس سے لکھنے پڑھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ چائے کے بہت شوقین تھے طبیعت میں نفاست تھی۔ اپنی عمر کے اختتام تک اپنی پرانی وضع کے پابند تھے جیسا کہ ان کی تصویر سے جو ان کے دیوان کے ساتھ ہے معلوم ہوگا عرصے سے ثقل سماعت کی شکایت ہو گئی تھی اور سخت تھی۔ راقمؔ کے دوست استاذ ظہیر دہلوی سے بے حد دوستانہ تھا۔ ان دونوں اصحاب کی ملاقات بھی عجیب پرلطف ہوتی تھی۔ دونوں کو ثقل سماعت کی شکایت تھی۔ جب یہ دونوں حضرات ملتے تھے تو دونوں صاحب ایک قسم کا آلہ جسے آلۂ سماعت کہنا چاہیے ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ ایک صاحب ایک طرف سے اپنے کان میں لگاتے تھے

اور دوسرے صاحب کے ہاتھ میں اس کا دوسرا حصہ دے دیتے تھے تاکہ وہ کچھ کہیں اور اس میں کہیں۔ اسی طرح دوسرے صاحب بھی۔ اور پھر ان کی شاعری اور اس پر واہ واہ کا ہنگامہ، دیکھنے اور سننے کے قابل ہوتا تھا۔

ابتدائی حالات اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں راقم نے بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت اختیار کی اور تیر اندازی میں بادشاہ کے شاگرد بھی تھے۔ اس کے بعد ولیعہد بہادر مرزا فتح الملک کی ملازمت میں رہے۔ بعد وفات ولیعہد بہادر راقم اپنے والد کے پاس ریاست الور میں چلے گئے۔ وہاں راجہ کے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم پر متقرر ہو گئے۔ عرصے تک ان کی ملازمت میں رہے۔ راجہ صاحب اور ان کے فرزندان سے اس قدر مانوس تھے کہ کسی وقت جدا نہ ہونے دیتے تھے۔ مہاراجہ الور اہل علم کے بہت قدر دان تھے خواجہ امان نے جو ترجمہ بوستان خیال کا کیا تھا وہ غالباً مہاراجہ ہی کے واسطے تھا۔ کیونکہ اول تو کہیں دیباچے میں ذکر بھی کیا ہے۔ دوسرے ایک تصویر سے جو بوستانِ خیال کی ایک جلد کے سرورق پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امان بوستانِ خیال مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ غدر کے بعد راقم الور سے جے پور چلے گئے پھر دہلی چلے آئے۔ دہلی آن کر اپنے والد کے ساتھ بوستانِ خیال کے ترجمے اور اس کی چھپائی وغیرہ کے اہتمام میں مصروف ہو گئے۔

جب ان کے والد کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہو گیا اور کچھ عرصے بعد بوستان خیال کے ترجمے سے فرصت پائی تو آپ حیدر آباد چلے گئے اور نواب سر سالار جنگ بہادر کے ہاں دو سال تک امیدواری کرتے رہے بعد میں اتفاق سے پھر جے پور چلے گئے اور آخر تک وہیں قیام پذیر رہے۔

تلمذ راقم اپنے دادا غالب کی شاگردی کا فخر رکھتے تھے۔ اکثر ان کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ راقم علاوہ شاعری کے غالب سے اور چیزوں میں بھی سبق لیا کرتے تھے۔ لیکن ابتدائی تعلیم زیادہ تر اپنے والد سے پائی تھی۔ فارسی اردو کے کامل تھے۔ راقم کو اپنی زبان (اردو) پر بہت ناز تھا چنانچہ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہم زباں سے زبان ہم سے ہے
ہر زباں پر رفانہ ہیں ہم لوگ

تصانیف راقم کی جملہ تصانیف چھ ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بوستانِ خیال:۔ راقم کے والد خواجہ امان بوستان خیال کا ترجمہ کر رہے تھے۔ چھ جلدیں تمام ہو چکی تھیں کہ عمر نے وفا نہ کی اور اس دار فانی سے اس بحر ذخار کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ بقیہ دو جلدوں کا ترجمہ خود راقم صاحب نے پورا کر کے شائع کیا۔

کلیاتِ راقم:۔ یہ تقریباً دو سو صفحہ کا راقم کا دیوان ہے اور طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ کلام معمولی ہے اور جس استاد کی شاگردی پر انھیں فخر ہے اس سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔

سبعہ سیارہ:۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے یہ سیاروں کے حالات کے متعلق لکھی ہے۔ طبع ہو چکی ہے۔ آخر میں کچھ شعبدے اور مختلف نسخے وغیرہ بھی درج کیے ہیں۔

عقدِ ثریا:۔ یہ عورتوں کی زبان میں ایک قصے کے پیرائے میں مقفیٰ عبارت میں لکھی ہے اس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے۔ دوسرے حصے کا مسودہ راقم کی وفات کے بعد ملا تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے اب تک طبع نہ ہو سکا۔

مرقعِ نعت:۔ نعت اور تصوف کا بہترین ذخیرہ ہے اس سے راقم کے حسن اعتقاد کی حالت خوب معلوم ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس میں معراج نامہ ایک عمدہ چیز ہے۔ آپ مذہب کے عامل باعمل تھے۔

شرح دیوانِ غالب:۔ راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کر کے حیدر آباد سے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے رجو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں) اتفاقاً ذکر آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہا کہ وہ مسودہ مجھے دیجیے۔ میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقم نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور واپس جے پور چلے گئے۔ اس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیرالدین خاں صاحب آثم نے جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بہ قدم تھے رافسوس کہ انھوں نے بھی سنہ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غالباً کہیں گم ہو گئی۔ اس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا چھٹا ہے اب

نکلا ہے لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ شائع کیا جا سکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامہ اسداللہ خاں غالب دستیاب ہوا ہے جو اسی شرح کا دیباچہ ہے۔

شاگرد راقم کے شاگرد بہت تھے۔ سب سے زیادہ اس وقت جے پور میں ہیں علاوہ شاگردوں کے بہت لوگ ان کے پاس جمع رہتے تھے اور اصلاحیں لیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت ایک علمی مجلس جمع رہا کرتی تھی اور اس طرح وہ اپنے علم سے دوسروں کو مستفید کرتے رہتے تھے۔

خوش مزاجی راقم بہت خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے اور اکثر مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے ایک مرتبہ راقم دہلی آئے ہوئے تھے اور اپنی ہمشیرہ کے ہاں مقیم تھے۔ اتفاق سے رات میں چوری ہو گئی اور بہت کچھ اسباب جاتا رہا۔ صبح میں جب خبر ہوئی تو راقم نے اپنی ہمشیرہ سے کہا کہ میں ہمیشہ تم کو تاکید کیا کرتا ہوں کہ تم گھر میں کتّا پالو تاکہ گھر کی حفاظت ہو۔ ہمشیرہ نے ان کو جواب دیا "بھائی جس گھر میں کتّا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ اس سبب سے میں نہیں پالتی"۔ اس پر راقم نے جواب دیا "کیوں بہن یہ جو شہر کے گلی کوچوں میں کتنے رہتے ہیں تو رحمت کے فرشتے فصیل کے باہر ہی رہتے ہوں گے"۔ غرض یہ کہ ہمیشہ اس قسم کے سیکڑوں لطیفے ہیں جو یہاں درج نہیں ہو سکتے۔

ہمت اور مستقل مزاجی راقم بہت باوضع بزرگ تھے۔ کیسی ہی مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا وہ نہایت استقلال سے ان کو اس طرح جھیل لیا کرتے تھے کہ دوسروں کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ ان پر کیا گزری۔ اپنی بات اور ارادے کے پورے تھے۔ جے پور میں اکتیس سال رہے وہاں جو کوٹھا انھوں نے اول سے کرایہ پر لیا تھا اکتیس برس انھوں نے اسی میں گزار دیے اور آخر وہیں انتقال ہوا۔ اپنے ارادے کے اس قدر مضبوط تھے کہ انتقال سے آٹھ روز پہلے دہلی گئے۔ چلنا پھرنا تو بڑی بات تھی ہل جل بھی نہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں سب نے روکا لیکن کسی کی نہ مانی۔ چار روز دہلی میں رہ کر پھر واپس اسی حالت میں جے پور چلے گئے اور صرف تین دن کے بعد انتقال کیا۔ آخر وقت تک ہوش و حواس بالکل درست تھے اور دل و دماغ برابر اس وقت تک کام دیتے تھے۔

راقم نہایت مہمان نواز۔ ہمدرد۔ رحم دل اور مجسم اخلاق تھے۔ ان کے اخلاق کی

عام اخلاق وجہ سے لوگ اب تک جے پور میں یاد کر کے روتے ہیں۔ اپنے اوقات اور اتباع سنتِ نبوی کے اس قدر پابند تھے کہ اس میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ غرباء کے ساتھ ہمیشہ سلوک اور ان کی سعی سفارش وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے نہایت ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔

راقم نے مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتر سال کی عمر پاکر اس دنیا سے کوچ کیا اور جے پور

وفات میں ہی دفن ہوئے راقم صاحب کو آخر عمر میں اگر کوئی صدمہ تھا وہ صرف اپنی آئندہ نسل کے چلنے کے متعلق تھا۔ کیونکہ کئی پوتے ہوئے اور وہ سب ان کے سامنے ہی رخصت ہو گئے۔ البتہ ان کی پوتیاں موجود ہیں۔ حال ہی میں ان کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح خاندان غالب یہاں آن کر بالکل ختم ہو گیا، نہ تو غالب ہی کی اولاد میں کوئی مرد باقی رہا اور نہ اس سلسلے ہی میں اور کوئی رہا کہ آئندہ سلسلہ چلنے کی امید رہتی۔

ناظمہ بیگم پروین

غالب کے چند اعزہ

مرزا عبداللہ بیگ خاں متوفی ۱۸۰۲ء	باپ	رفیع الدین بیگ	پوتے
عزت النساء بیگم ماں	ماں	احمد بیگ	(حقیقی نہیں۔ غالب کے
مرزا قوقان بیگ	دادا	محمود بیگ	حقیقی بھانجے مرزا عاشور
خواجہ غلام حسین کمیدان	نانا	خداداد بیگ	بیگ کے یہ چاروں لڑکے ہیں)
مرزا نصراللہ بیگ خاں متوفی ۱۸۰۶ء	چچا	محمد علی بیگ	بھانجا
مرزا یوسف بیگ متوفی ۱۸۵۷ء	بھائی	امانی خانم (بیگم مرزا علی بخش خاں)	بھانجی
عزیز النساء بیگم (بیگم غلام فخرالدین)	بھتیجی	الٰہی بخش معروف متوفی ۱۸۲۶ء	خسر
چھوٹی خانم	بہن	مرزا علی بخش متوفی ۱۸۶۴ء	سالے
مرزا اکبر بیگ بدخشی	بہنوئی		بھانجی داماد
مرزا عباس بیگ		مرزا نواز علی خاں	" "
مرزا عاشور بیگ		امراؤ بیگم متوفی ۱۸۷۰ء	بیوی
مرزا جواد علی بیگ (مرزا مغل)	بھانجے	بنیادی بیگم	سالی
آغا مرزا بیگ	پوتے	نواب غلام حسین خاں مسرور	ہم زلف
فیاض بیگ	(حقیقی نہیں، غالب کے حقیقی بھانجے	غلام فخرالدین	سالے کا بیٹا، بھتیجی داماد
ساجد بیگ	جواد علی بیگ عرف مرزا مغل	مرزا اورنگ خاں	ممیرے بھائی
عابد بیگ	کے یہ چاروں لڑکے ہیں)	محمد مرزا خاں	بھائی کا نواسہ